قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جولائی 2021 قیمت 15 ₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

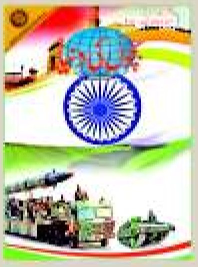

قیمت فی شمارہ: 10 روپے　　سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اُردو دُنیا

ماہنامہ
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد 23، شمارہ 07، جولائی 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages: 100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم
عالمگیریت اور تعلیم
باہمی رشتے اور اثرات — آفتاب عالم 7

نقد و نگاہ
پنچ تنتر تہذیب و تاریخ کے آئینے میں — شاذیہ عمیر 11
حیدرآباد میں اردو ناول — عبدالمغنی صدیقی 14
فلسفۂ موت کی شعری تشریحات — صابر علی سیوانی 18
قیصر تمکین کا تنقیدی رجحان — احسن ایوبی 22

تخلیق... وجود اور ارتقا — جاوید انور 25

یاد شمیم
یادرنگ — نجمہ رحمانی 28
پروفیسر شمیم حنفی — محمد قاسم انصاری 31

لعل و گہر
کشمیر کی درد آشنا: ترنم ریاض — قدوس جاوید 33
شگفتہ مزاج نقاد — ناصر الدین انصار 35
فکر و احساس کا شاعر: نیر سلطانپوری — نشاں زیدی 38

نازش پرتاپ گڑھی کا شعری اختصاص — جاوید احسن 40
احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری — شفیع احمد 43

شمس و قمر
انور اعظمی: ایک مطالعہ — محمد الیاس الاعظمی 45
الطاف شاہ آبادی کا شعری مزاج — اختر شاہجہاں پوری 49
حکیم آغا جان عیش کی غزل گوئی — نوشاد منظر 52
آمنہ ابوالحسن:
اردو افسانے کا ایک معتبر نام — ارشاد شفق 55

اساطیر اور اردو
اردو افسانوں میں ہندو اساطیر — ابوبکر عباد 58
اردو شاعری میں ہندو دیومالائی عناصر اور رام کا کردار — مہر فاطمہ 62

کتاب دریچہ
جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا — قیوم بدر 64

زاویہ نظر
پیغام آفاقی کا دوست — ابرار رحمانی 66

نگر نگر اردو
کرناٹک کی نسائی شاعری — قمر النسا 68

خصوصی گفتگو
عزیز اللہ شیرانی سے انٹرویو — غلام نبی کمار 72

عربی ادبیات
علم نحو کی سب سے پہلی کتاب — شمس کمال انجم 76
معلقاتی شاعری: مستند یا مسترد؟ — فیصل نذیر 79

صحت اور سائنس
ہنسی کے فائدے — شمس الاسلام فاروقی 81

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 84

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 93

ہماری بات

اشخاص اور افکار سے ہی یہ کائنات آباد اور شاداب ہے مگر اب عبقری شخصیات کی وفات سے رفتہ رفتہ کائنات میں ویرانی بڑھتی جارہی ہے کیونکہ جن الفاظ اور افکار سے انسانی حیات و کائنات کو نئی روشنی ملتی تھی وہ روشنیاں بجھتی جارہی ہیں۔ گذشتہ چند مہینوں میں کورونا جیسی وبا اور دیگر مہلک امراض کی وجہ سے بہت سی عباقرہ اور نابغہ شخصیات اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ گئیں۔ متواتر اور مسلسل وفات کی وجہ سے لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ علم و ادب کا اتنا بڑا خسارہ شاید ہی پہلے کبھی ہوا ہو۔ ایسی جید شخصیتیں جن کے لفظوں میں بے پناہ قوت اور توانائی ہوا کرتی تھی وہ شخصیتیں ہم سے جدا ہوگئیں اور علم و ادب کے میدان میں قحط الرجال جیسی کیفیت پیدا ہوگئی۔ یہ شخصیتیں معمولی نہیں بہت غیر معمولی تھیں جنھوں نے ہر سطح پر

ہمارے سماج کو توانائی اور تابندگی عطا کی تھی، جن کے وجود سے روشنیاں عبارت تھیں، جن کے ایک ایک لفظ میں تسخیر اور تاثیر کی قوت تھی اور جن کے خیالات اور تصورات نے انسانی سماج کو ایک نیا منہج، معیار اور وقار عطا کیا۔ جن کی تحریروں سے سماج میں انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں بیشتر نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے انسانی سماج کو قابل رشک اور مفتخر سرمایہ عطا کیا تھا۔ انسانی تہذیب و دانش کے ارتقا میں ان کا بہت اہم رول تھا۔ معاشرتی فلاح و بہبود اور سماجی ساخت کی بہتری میں ان کا ایک فعال اور مثبت کردار ہوا کرتا تھا۔ ان کے وجود کی روشنی سے معاشرے کی تاریکیاں بھی دور ہوئیں۔ ان لوگوں نے ذہنوں میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کیں اور صحیح راستے کی نشاندہی کے ساتھ حقیقی منزل تک پہنچانے میں ان کی معاونت اور رہنمائی شامل رہی۔ دراصل ہر عہد میں کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن سے پورا زمانہ متاثر ہوتا ہے اور جو اپنے تجدیدی تصورات اور خیالات سے معاشرے کو نیا رنگ اور روپ عطا کرتے ہیں۔ ماضی سے رشتہ جوڑتے ہوئے عصر حاضر کے مطالبات سے معاشرے کو ہم آہنگ کرتی ہیں اور اس طرح معاشرے کی شکل اور ساخت کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان شخصیات ہی کی وجہ سے معاشرے میں توازن اور اعتدال قائم رہتا ہے اور وہ بے راہ روی ختم ہوجاتی ہے، معاشرے کو مضمحل اور پژمردہ کرتی ہے۔

گذشتہ چند مہینوں میں جن شخصیات کی وفات ہوئی وہ ہمارے معاشرے کے لیے بیش قیمت اثاثہ تھیں۔ انھوں نے ہمیں علوم و فنون کا بیش بہا سرمایہ عطا کیا، ہمارے تاریک ذہنوں کو روشن کیا۔ ہمارے منجمد وجود میں تحرک اور طغیانی پیدا کی اور ہمیں حیات و کائنات کے اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا۔ یہ شخصیات صرف ایک شعبے سے وابستہ نہیں تھیں بلکہ مختلف شعبۂ حیات سے ان کا تعلق تھا اور ان تمام شعبوں میں انہی کی وجہ سے فعالیت تھی، تحرک تھا۔ ان تمام شعبہ حیات کے ارتقا میں ان شخصیات کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

دراصل شخصیتیں ہی معاشرے کی صحیح سمت کا تعین کرتی ہیں اور وہ راستے دکھاتی ہیں جن پر چل کر معاشرہ ارتقا سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ شخصیتیں نہ ہوتیں تو شاید معاشرے میں ہر سو تاریکی پھیلی ہوتی، ظلمتوں کا دور دورہ ہوتا اور وہ تمام برائیاں معاشرے کا حصہ بنتیں جو کسی بھی سماج کے اضمحلال اور زوال کا باعث ہوتی ہیں، اس لیے ہمیں ایسی شخصیات کے بچھڑنے کا شدید ملال ہے جو ہمارے معاشرے کی مثبت توانائیوں کا استعارہ ہیں۔ ان کی کتابوں، تحریروں اور تقریروں میں انسانی سماج کو بدلنے کی قوت موجود ہے اور زمانے نے یہ دیکھا بھی ہے کہ ہمارے دانشوروں اور مفکروں نے معاشرے کو بہت حد تک بدلا بھی ہے اور عالمی رویوں اور رجحانات سے بھی سماج کو آشنا کیا ہے۔ ان میں سے بہت سے وہ ہیں جنھوں نے عصر حاضر کے مطالبات کو صحیح تناظر میں سمجھا اور معاشرے کو ان مطالبات سے آشنا کرنے کی کوشش کی، خاص طور پر جدید ٹیکنالوجی، جدید تنقیدی اصطلاحات، معاصر تنقیدی مسائل اور دیگر ادبی مباحث سے معاشرے میں ایک تحرک کی کیفیت پیدا کی۔ ان میں سے بہتوں نے علم و ادب کے میدان میں اپنے کمالات دکھلائے۔ دراصل یہ شخصیتیں ہمارے معاشرے کی مستحکم اور مضبوط آوازیں تھیں جن کی گونج میں زندگی تھی اور اب یہ آوازیں خاموش ہوگئی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے معاشرے پر مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہو! ایسی مضبوط آوازوں کو زندہ رکھنا اور ان کے وژن اور مشن کو آگے بڑھانا اب ہم سب کا فرض ہے۔

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماهنامہ 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

جون کے شمارے میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا مضمون 'شانتی رنجن بھٹا چاریہ کے تحقیقی وتنقیدی کارنامے' پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے 'شانتی بابو کی جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں، انھیں پڑھا بھی ہوگا لیکن ان کے مذکورہ مضمون سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر محمد فاروق اعظم کی کتاب 'شانتی رنجن بھٹا چاریہ: حیات اور خدمات' بھی دیکھی ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے فاروق صاحب کی کتاب کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا۔ یہ بات اس لیے وثوق کے ساتھ کہی جارہی ہے کہ فاروق صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے میں شانتی بابو کی جن کتابوں کے نام لینے کے باوجود ان کے تفصیلی ذکر کرنے سے دامن بچایا ہے، ہمایوں صاحب نے بھی وہی کیا ہے۔ مضمون کے اختتامی حصے میں ہمایوں صاحب نے شانتی بابو کی چند کتابوں کے نام درج کیے ہیں اور اعتراف کیا ہے کہ ان پر گفتگو لازمی ہے لیکن پھر طوالت کا عذر پیش کر دیا اور اس پر بات نہ کر سکے۔ دراصل ان کتابوں میں دو کتابیں ایسی ہیں جن پر گفتگو واقعی لازمی تھی۔ ایک 'خواتینِ بنگال کی اردو خدمات' اور دوسری "تذکرۂ تصانیفِ بنگالہ' لیکن فاروق صاحب دامن بچا گئے، اور ہمایوں صاحب کے سامنے طوالت آڑے آ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اول الذکر کتاب لکھی تک نہیں گئی ہے، اور آخر الذکر چھپی نہیں۔ کیونکہ اس دوسری کتاب کا واحد مسودہ کلکتے کی بزمِ نثار کے کتب خانے میں ہنوز شرمندۂ اشاعت موجود ہے۔

ہمایوں صاحب نے 'شانتی بابو کی ایک اور کتاب کا نام لیا ہے' کلکتہ میں اردو کا پہلا مشاعرہ اور پرنس ولسن کا یادگار مشاعرہ' یہاں کمپوزنگ، اور پروف ریڈنگ دونوں میں ایک غلطی برقرار رہ گئی ہے۔ کیونکہ اصل نام 'ولسن' نہیں، 'ڈلن' ہے۔ یہ کتاب کلکتے سے جولائی 1992 میں پہلی بار شائع ہوئی ہے۔

ہمایوں صاحب نے شانتی بابو کی ایک اور کتاب کا نام لکھنے میں ذرا بھول کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں' آزادی کے بعد بنگال میں صحافت' واضح ہو کہ اس نام سے شانتی بابو کی کوئی کتاب نہیں۔ ایک کتاب کا نام ہے' آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو' مطبوعہ اکتوبر 1973 کلکتہ۔ دوسری کتاب ہے' بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ' 2003۔ اسے مغربی بنگال اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔

مضمون میں شانتی بابو کی ایک اور کتاب کا ذکر ہونے سے رہ گیا ہے۔ جس کی اہمیت اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ یعنی' مولانا ابوالکلام آزاد کا خفیہ فائل'

شانتی بابو چونکہ پی آئی بی (پبلی کیشن انفارمیشن بیورو) سے وابستہ تھے، اس لیے اہم سے اہم سرکاری دستاویزات تک ان کی رسائی میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ خود ایک محقق تھے لہٰذا انھوں نے مولانا آزاد کے اس خفیہ فائل کو نہ صرف ڈھونڈ نکالا بلکہ منظرِ عام پر بھی لے آئے۔ بہر حال، مغربی بنگال کے اردو ادب وصحافت پر کام کرنے والے بزمِ نثار کولکاتا کے کتب خانے سے کچھ نہ کچھ ضرور پا سکیں گے۔

اشرف احمد جعفری: کولکاتا، مغربی بنگال

آپ نے 'اردو دنیا' کے مئی 2021 کے شمارے میں 'ہماری بات' کے تحت اردو املا کے حوالے سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کی ہے جس کی اہمیت کا اندازہ تو اردو کے ہر صاحب بصیرت کو ہے لیکن اس کے تدارک کی عملی پہل کی زحمت اٹھانے کی سعی نظر نہیں آتی۔

شان الحق حقی کی 'فرہنگ تلفظ' کے سوا اردو الفاظ کے تلفظ پر مبنی کوئی لغت مرتب نہیں ہوا، اور نا ہی مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ آج عمومی استعمال کے لیے صرف 'فیروز اللغات' دستیاب ہے جو نہ صرف فنی وتکنیکی نقطۂ نظر سے غیر تشفی بخش ہے بلکہ تقریباً سو سال پہلے کی کاوش ہے۔ جب کہ صورت حال یہ ہے کہ اردو زبان اس طویل مدت میں کئی نشیب وفراز سے گذر کر اپنا ایک واضح تشخص متعین کر چکی ہے۔

آپ اس وقت اردو دنیا کے سب سے معتبر ادارے کے سربراہ ہیں، اس لیے آپ اگر اس سمت پیش قدمی کریں تو شاید اردو الفاظ کے پیچیدہ مسئلے کا حل پیش کرنے والی ایک مستند ڈکشنری معرض وجود میں آ سکتی ہے۔ اس مشکل امر کے لیے لغت نویسی کا عملی تجربہ رکھنے والے ماہرین کی ضرورت ہے۔ آج کے قحط الرجال کے دور میں یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ آج بھی اردو الفاظ واصطلاحات کے رمز شناس اور اردو زبان کی لسانیاتی پالیسی کے دقیقہ رس ملک میں کمیاب ضرور ہیں، عنقا نہیں۔ آپ ماہرین کی ٹیم تشکیل کے لیے پہل کریں۔ ان شاء اللہ کامیابی ملے گی۔

زبیر احمد بھاگلپوری: اردو سکشن، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ 15

زیر تبصرہ مئی 2021 کا شمارہ آن لائن دستیاب ہوا جس کے اداریے میں ایڈیٹر نے املا اور تلفظ اور لہجہ و مخارج پر ورکشاپ اور کانفرنس و اجتماع پر زور دیا ہے جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ شریف احمد نے اپنے مضمون 'نئی تعلیمی پالیسی (ہندوستانی زبانوں، علوم و فنون، تہذیب اور قومی یکجہتی کے تحفظ و فروغ کے تناظر میں)' بڑی اچھی بحث کی ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی 2020 میں مادری زبانوں کے فروغ و ترویج کا اہم وسیلہ و ذریعہ ثابت ہوگی۔ بدرالاسلام نے 'قومی تعلیمی پالیسی 2020: اساتذہ کا مطلوبہ کردار' میں کہتے ہیں ہم اس نظام تعلیم کے ذریعے ایک ایسے فرد کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں جو منطقی سوچ اور عمل کا حاصل ہو یہ اہم بات ہے۔ محمد فیروز عالم نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ہر ریاست و علاقے کے تقاضے الگ ہوتے ہیں البتہ مرکزی حکومت یکسانیت کے لیے احکامات صادر کر کے عمل کروا سکتی ہے۔ ہمایوں اشرف نے اپنے مضمون 'شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے تحقیقی و تنقیدی کارنامے' میں اردو شعبہ اور مغربی بنگال کی علمی، ادبی، صحافتی، تاریخی، سماجی اور سیاسی پہلو کا محاسبہ اور محاکمہ اور تنقید و تحقیق کی ہے ان کی تصانیف ریسرچ اسکالر کے لیے مفید ثابت ہوں گی۔ محمد جہانگیر وارثی نے اردو لسانیات کے حوالے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خدمات پر بات کرتے ہوئے جائزہ لیا ہے کہ اردو لسانیاتی شعور انشاء اللہ خاں اور مولانا محمد حسین آزاد کے یہاں ابتدا میں ملتا ہے۔ بعد میں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری نے لسانی موضوع پر جو کام کیا ہے وہ علی گڑھ میں اردو لسانیات میں کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر مضامین بھی اہم ہیں اور ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد

اردو دنیا مئی 2021 کا شمارہ کونسل کی ویب سائٹ پر پڑھنے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر عقیل احمد صاحب نے اداریے میں اردو الفاظ کے صحیح تلفظ پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ موصوف نے غلط تلفظ کا استعمال کرنے کی وجہ سے ہونے والی دشواریوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ میرے مشاہدے کی بات ہے کہ بڑے بڑے اداروں کے سربراہ، یونیورسٹی اور کالجز کے اساتذہ خصوصاً سوشل میڈیا پر املا اور تلفظ کی فاش غلطیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ نشاندہی کرنے پر بھڑک جاتے ہیں۔ حالانکہ ایسے پلیٹ فارم پر ہمیں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک بڑا طبقہ ہمارا عہدہ اور ڈگری دیکھ کر ہمیں فالو کرتا ہے۔ اگر ہم ہی غلط تلفظ و املا استعمال کریں گے تو ظاہری بات ہے وہی غلط تلفظ و املا کم پڑھے لکھے لوگ استعمال کرنے لگیں گے۔ لہٰذا ہمیں ایسی جگہ خاص طور سے صحیح تلفظ کا استعمال کرنا چاہیے جہاں لوگ ہمیں بطور خاص پڑھتے یا سنتے ہیں۔ مدیر محترم نے اداریے کے توسل سے جو تجاویز پیش کی ہیں میں اس سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔

خطوط کے کالم میں ڈاکٹر کرشن بھاوک صاحب کا مراسلہ ہر بار کی طرح میرے لیے مفید ثابت ہوا۔ آپ نے اختر الایمان کی ترکیب کے تعلق سے جو نشاندہی کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ کیونکہ اس طرح کی غلطیاں اہم شخصیات کی تحریروں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ آپ یقیناً اردو زبان کے بہترین عالم ہیں۔ سلسلہ صحافت کے کالم میں مہتاب امروہوی صاحب کا مضمون 'اردو صحافت اور کالم نگاری' کافی معلوماتی ہے۔ مضمون نگار نے صحافت کی اہمیت اور صحافت کی صنفوں جیسے خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری، رپورتاژ نگاری، انٹرویو نگاری اور کالم نگاری کی تعریف پیش کی ہے۔ ساتھ ہی اس کے آغاز و ارتقا پر مختصر معلوماتی گفتگو کی ہے۔

تنویر رضا برکاتی: چیئرمین دارالسرور ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی برہانپور (رجسٹرڈ)

ادارہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' کی طرف سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'اردو دنیا' نہ صرف اردو کے وسیع ادبی اور ثقافتی منظر نامے کی سرگرمیوں کا سیر حاصل احاطہ کرتا ہے، بلکہ اردو زبان و ادب کے ان تمام گوشوں سے بھی روشناس کرواتا ہے جو ہم عصر ادب کے زمرے سے باہر رہتے ہیں۔

مارچ 2021 کا شمارہ بہت پسند آیا، اس کی تین اہم وجوہات ہیں، ایک تو مرحوم حنیف کیفی صاحب پر جو تین مضامین اس شمارے میں شامل ہیں، انھیں پڑھ کر حنیف کیفی کی ادبی تنقید کے عنصر اور ادب فہمی کو لے کر ان کے افکار قاری کے ذہن میں صاف طور سے واضح ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین مصنف کی ادبی خدمات اور ان کی اہمیت کو وسیع پیمانے پر واضح کرتے ہیں۔

خطرہ کسی کو ہو کیا خود ضرر رسیدہ ہوں — میں کج کلاہ نہیں ہوں انا گزیدہ ہوں

(حنیف کیفی)

میں ان تینوں حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اتنے خوبصورت طریقے سے کیفی صاحب کی شعری اور ادبی عظمت سے واقف کروایا۔

دوسری اہم وجہ ہے کہ پروفیسر اسلم جمشید پوری کے اردو فکشن اور فکشن کی تنقید جیسے موضوع پر تحریر کردہ مضمون نے اس شمارے کو حوالہ جاتی نوعیت عطا کر دی ہے۔ 2020 میں منظر عام پر آئے فکشن کے فن پاروں پر مختصر معلوماتی تبصروں کے ذریعے قاری کی معلومات میں اضافے کا سامان کر دیا ہے۔

تیسری اہم وجہ جو مجھے اس شمارے کی بابت خط لکھنے پر اکساتی ہے وہ ہے مقبول شاعر اور عہد ساز رسالہ 'انتساب عالمی' کے بانی اور مدیر اعلیٰ ڈاکٹر سیفی سرونجی سے ان کی شاگردہ اور 'انتساب' کی نائب مدیرہ استوتی اگروال کی کی سے گفتگو۔ خاص کر کسی سینئر ادیب سے اگر گفتگو کی جائے تو وہ اس نوعیت کی ہو کہ وہ قاری کے سامنے اس ادیب کی مکمل تصویر رکھ دے۔

جب ایک سوال کے جواب میں سیفی صاحب فرماتے ہیں کہ 'مجھے مشکل زبان آتی ہی نہیں ہے تو اس طرح کا اعتراف یہ سندیش دیتا ہے کہ ادبی سروکاروں کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ زبان سادہ اور سلیس ہو۔ کیوں کہ ادب کا بنیادی مقصد اپنی بات قاری کے ذہن تک پہنچانا ہوتا ہے۔

اگر ادیب کے احساس اور سروکار کچھ اور ہیں اور وہ کہتا کچھ اور ہے تو ایسے میں ادیب کے ذہن کی تعبیر تک پہنچ مشکل لگنے لگتی ہے مگر سیفی صاحب اس الزام کی زد میں نہیں آتے اور پھر استوتی کی تعریف کرنی چاہیے کہ وہ سیفی صاحب کے ذہن کے ہر کونے سے مطلوبہ جواب تلاش کر لیتی ہے۔ سیفی صاحب نے نہ کسی ادبی گروہ میں شامل ہونا پسند کیا نہ کسی تحریک سے وابستگی کا اظہار کیا، بلکہ انھوں نے اپنی ایک الگ ہی راہ اختیار کی اور اپنے تجربوں کو اپنے تنقیدی مضامین میں بڑے کھلے انداز میں رکھ دیا ہے۔ استوتی کے ایک سوال کے جواب میں سیفی صاحب فرماتے ہیں: ''ایک سچے اور اچھے شاعر و ادیب کو جدیدیت یا مابعد جدیدیت کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ تو لیبل ہیں جو چسپاں کر دیے گئے ہیں''۔ میں نے سیفی صاحب کی Unique خودنوشت 'یہ تو سچا قصہ ہے' پڑھی ہے۔ استوتی جب یہ جاننا چاہتی ہیں کہ یہ اتنی مقبول کیوں ہے تو جواب میں سیفی صاحب نے جو بات کہی وہ بالکل درست ہے کیونکہ خودنوشت کا متن اور انداز بہت صاف ہے اور زبان میں کہیں بھی خیال کے اظہار اور تشریح میں گنجلک الفاظی نظر نہیں آتی۔

بہر حال خط کو سمیٹتے ہوئے 'اردو دنیا' کی پوری ٹیم کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے معیاری مواد شائع کر کے قاری کے ذوق کی تسکین اور اسے وسیع مطالعے کی طرف مائل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

رویندر جوگلیکر: بھوپال (مدھیہ پردیش)

عالمگیریت اور تعلیم
باہمی رشتے اور اثرات

آفتاب عالم

عالمگیریت ایک ایسا حقیقی اور لامحدود عمل ہے جس نے اس دنیا میں موجود ہر شخص اور ہر فرد یہاں تک کہ دنیا کے ماڈی اور غیر ماڈی دونوں طرح کی اشیا کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ عالمگیریت اکیسوی صدی کے زبان زد الفاظ میں سے ایک ہے جس کے لغوی معنی 'دنیا میں پھیل جانا' اور 'دنیا پر چھا جانا' ہے۔ اس نے دنیا کے تمام ممالک کی جغرافیائی سرحدوں کو کمزور کر دیا اور علاقائی وملکی معیشت کو ایک عالمی معیشت سے صرف مضبوطی سے جوڑا ہی نہیں بلکہ ان کے مابین موجود آپسی پابندیوں کو بھی تقریباً ختم کر دیا ہے۔ عالمگیریت نے زندگی کے ہر زاویے اور میدان میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ دنیا کا کوئی شعبہ، کوئی ملک اور زندگی کا کوئی پہلو عالمگیریت کے اثر سے بچ نہیں سکا اور یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ دنیا ایک عالمی گاؤں بن چکی ہے۔ پھر ایسے حالات میں شعبہ تعلیم اور تعلیمی عمل کیسے عالمگیریت کے اثرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ درحقیقت تعلیم اور عالمگیریت دونوں میں ایک مضبوط رشتہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے تکمیلی رشتہ رکھتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے کہ دونو ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ عالمگیریت اب حق انتخاب نہیں بلکہ زندگی کا ایک جزو لاینفک بن گئی ہے۔

عالمگیریت کا تصور اور تعریف

عالمگیریت کے سبب جدید دنیا بغیر جغرافیائی سرحدوں اور کسی قسم کی رکاوٹوں کے دیکھی جا رہی ہے۔ عالمگیریت دنیا کی معاش کو جوڑنے اور مصنوعات، خیالات، کلچر، تہذیب وتمدن، سائنسی اختراعات اور ٹکنالوجی وغیرہ کے باہمی تبادلے کے عمل کا نام ہے۔ عالمگیریت عالمی طور پر یکجا ہونے کا عمل ہے جو چیزوں کے باہمی تبادلے کے عمل کے ذریعے پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ اس کا مطلب ملکوں کے سرحدوں سے پرے معاشی سرگرمیوں میں اچانک اضافہ ہے۔

بیک (Beck)) نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ نیٹ ورک کی توسیع اور شناختوں اور مختلف امکانی قوتوں کے ذریعے پوری دنیا کے ممالک کی خودمختاری کو کم کرنے کا ایک عمل عالمگیریت ہے۔ روبرسٹن نے عالمگیریت کو ذرائع ترسیل وابلاغ اور مواصلات کے زاویے کا سمٹ جانا ہے۔ اسی طرح، لیوک نے ٹکنالوجی کی توسیع پر توجہ دی اور زور دے کر کہا کہ عالمگیریت پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں ڈھالنے کا عمل ہے تاکہ افراد معلوماتی اور مواصلاتی ٹکنالوجی کے جدید آلات کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ کر سکیں۔ واٹرس کے مطابق (1995، ص 3) عالمگیریت کو ایک معاشرتی تبدیلی کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جہاں معاشرتی اور ثقافتی پہلوؤں پر جغرافیائی سرحدوں کا اثر کم ہو رہا ہے اور لوگ اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔ معاشرتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو عالمگیریت کا مقصد عالمی طور پر معاشرتی تعلقات میں اضافہ ہے جو دور دراز کے علاقوں کو اس طرح جوڑتا ہے کہ مقامی واقعات سے دور دراز میں رونما ہونے والے واقعات متاثر ہوتے ہیں۔

لہٰذا، یہ کہا جا سکتا ہے کہ عالمگیریت ملکوں اور ریاستوں کی جغرافیائی سرحدوں کو کم کرنے اور اسے ختم کرنے کا عمل ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں جیسے ثقافت، معاشرتی تعامل، معیشت، سیاست اور دیگر تمام پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے۔ غیر واضح سرحدوں کا مطلب یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بات چیت کا زیادہ امکان رکھتے ہیں۔ اگر بات چیت ایک ہی درجے اور حیثیت والے لوگ یا جماعت کے مابین ہو تو غیر جانب دارانہ ہو سکتی ہے۔ تاہم، اگر بات چیت غیر مساوی حیثیت یا طاقت والے لوگ یا جماعت کے مابین ہے تو طاقتور افراد کمزور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

عالمگیریت کے اقسام

1 ثقافتی عالمگیریت: ثقافتی عالمگیریت کا تعلق ثقافت کے ایک مضبوط عنصر کی توسیع سے ہے۔ عام طور پر مستحکم اور ترقی یافتہ ممالک کی ثقافت عالمی پیمانے پر غالب رکھی جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعے ممالک کی معاشی اور معاشرتی ترقی کو ثابت کیا جا سکے۔ ثقافتی عالمگیریت ایک ایسا عمل ہے جہاں مقامی ثقافت ایک خاص شرح سے کم ہوتی جاتی ہے اور وہ عالمی ثقافت سے بدل دی جاتی ہے۔

2 معاشی عالمگیریت: معاشی عالمگیریت مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے جیسے بین الاقوامی کمپنیاں جو ملکوں کے خاص قوانین وضوابط کی پیروی کیے بغیر عالمی سطح پر کام کرتی ہیں۔ یہ کمپنیاں ٹیکس کے ذریعے ملک میں منافع لاتی ہیں اور بہت ہی اثر ورسوخ کا حامل ہوتی ہیں کیونکہ وہ کسی ملک کی قوانین کے پابند نہیں ہیں نیز اس کے اختیارات ریاستوں سے بالاتر ہیں۔ معاشی عالمگیریت میں قومی معاشی فنڈ (آئی ایم ایف) جیسی بڑی تنظیمیں شامل ہیں جو ترقی پذیر ممالک کو قرض اور فنڈ مہیا کراتی ہیں۔ جونس

کے مطابق، علامتی اشیا اور خدمات کے بہاؤ کے ساتھ دو علاقوں کے مابین تبادلے کی آزادی، ممالک کو حاصل مخصوص قدرتی وسائل اور جغرافیائی فوائد کی وجہ سے علاقائی مخصوص اشیا کی پیداوار میں توازن، براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری، عالمی منڈیوں کی بابت لچکدار ردعمل، غیر قومی مالیاتی منڈیاں اور مزدوروں کی آزاد نقل و حمل وغیرہ معاشی عالمگیریت میں شامل ہیں۔

3 سیاسی عالمگیریت: سیاسی عالمگیریت کا ماننا ہے کہ ملکوں اور علاقائی حکومتوں کی طاقتیں عالمگیریت کی وجہ سے کم ہو رہی ہیں۔ جونس کے مطابق، سیاسی عالمگیریت کو عالمی سطح پر مختلف طاقت کے مراکز اور ملکوں کی خودمختاری کی عدم موجودگی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں مقامی مسائل پر بحث عالمی برادری کے تعلق سے ہوتی ہے، طاقتور بین الاقوامی تنظیمیں قومی تنظیموں پر غالب رہتی ہیں، مختلف مراکز پرمبنی عالمی تعلقات قومی ریاست (Nation-State) کی اقتدار کو کمزور اور عالمی سیاسی اقتدار کو مظبوط کرتی ہیں وغیرہ۔ لہٰذا کسی خاص ملک اور ریاست کا شہری ہونے کی اہمیت کم ہو چکی ہے۔

عالمگیریت کے نظریات

عالمگیریت کے متعلق تین اہم نظریات ہیں اور ہر ایک نقطہ نظر عالمگیریت کے تعلق سے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر بحث کرتی ہے۔ تینوں مختلف نظریات مندرجہ ذیل ہیں:

1 غیر معمولی عالمگیریت کا نظریہ (Hyper- Globalist Perspective): اس نظریہ کے حامل لوگوں کا کہنا ہے کہ تاریخ ماضی اور موجودہ معاش دونوں نے مل کر ایک نیا رشتہ پیدا کیا جہاں سارے ممالک معاشی اور سیاسی طور پر متحد ہو رہے ہیں نیز ان معاملات میں سارے ممالک کا متحد ہونا ضروری ہے تاکہ عالمگیریت کی دنیا میں کامیاب ہو سکیں اور یہ سچائی ہے کہ جو ممالک متحد نہیں ہوئے وہ اس عالمگیریت کی دنیا میں پیچھے رہ گئے۔ اس نظریے کے حامل لوگوں کا ماننا ہے کہ دنیا کی معاش حکومتوں کے اختیار میں نہیں بلکہ موجودہ بازار کے ضبط و تسلط میں ہے اور صنعت و حرفت، تجارت اور عالمی معاشی بازار نے معیشت کو حکومتوں کے اختیار سے نکال کر بازار کے اختیار میں لا دیا ہے۔ مجموعی طور پر بات یہ ہے کہ انفرادی حکومتوں کی طاقتیں کم ہوئی ہیں اور عالمگیریت نے معیشت کے بند و بست کی انفرادی حکومتوں کے اختیارات کو کم کر دیا ہے۔ محققین کا کہنا ہے کہ 'صارفیت پسند نظریۂ' کی تبلیغ اور اشتہار روایتی شناخت کو توڑنے کی راہ میں پہلا قدم ہے۔ جب آزاد خیال جمہوریت دنیا میں پھیلے گی معاشی اور سیاسی تنظیم کے عالمی اصولوں کی نشو و نما ہوگی اور پھر ان سب کے بعد ایک حقیقی عالمگیریت ممکن ہوگی۔ دوسرے نظریات کے مقابل اس نظریے کے حاملین دنیا کی ساری معیشت کو ایک ہی اکائی کے طور پر دیکھتے ہیں۔

تشکیک کا نظریہ (Sceptical Perspective): تشکیکی نظریے کے حامل حضرات عالمگیریت کے تعلق سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں اور دنیا کو عالمگیریت کے بجائے علاقائیت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں نیز اس حقیقت کو مسترد کرتے ہیں کہ عالمی ترقیاتی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ ایک عالمی ثقافت کی ترقی ہو رہی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ دنیا عالمگیر ہو رہی ہے لیکن مختلف خطے کے آپس میں ملنے کی وجہ سے ہے اور ماضی اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ دنیا ایک معاشی منڈی نہیں بن رہی ہے بلکہ علاقائی معاشی شعبوں کی ایک توسیع اور ملکوں کے مابین تجارتی تعاون ہے مثلاً ترقی یافتہ اور صنعتی ممالک آپس میں تجارت کرتے ہیں اور ایک تجارتی بلاک بناتے ہیں پھر آہستہ آہستہ ترقی پذیر ممالک سے مصنوعات خریدنا شروع کرتے ہیں اور ان ممالک کو اس بلاک میں شامل کر لیتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کا ماننا ہے کہ بین ممالک تجارت کو آسان بنانے اور عالمی معیشت کو چلانے کے لیے ایک مظبوط ملک کی ضرورت ہے ورنہ طاقتور ممالک کمزور و ترقی پذیر ممالک میں تجارت کے نظام کو چلائیں گے۔ ان کا ایک عالمگیر دنیا میں یقین ہے لیکن یہ ماننا ہے کی عالمگیریت کی شروعات علاقائیت سے ہو کر ایک عالمگیر معیشت کی طرف جاتی ہے۔

تبدیلی کا نظریہ (Transformationalist Perspective): یہ نقطہ نظر دوسرے نظریات سے دو طریقوں سے مختلف ہے، اول، یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عالمگیریت کے پیچھے کوئی انفرادی وجہ (مارکیٹ یا معاشی منطق) نہیں ہے اور عالمگیریت کو ایک ایسا رجحان سمجھا جاتا ہے جو سالوں سے آہستہ آہستہ ترقی کر رہی تھی۔ دوئم، محققین کا کہنا ہے کہ عالمگیریت کے عمل کے نتائج کا تعین مشکل ہے اور عالمگیریت ایک غیر معلوم رجحان ہے جس کا اثر سالوں تک نظر نہیں آئے گا۔ ان کا ماننا ہے کہ عالمگیریت کے سبب کچھ عام تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تبدیلیاں کس معین سمت میں ہوئیں نیز یہ نقطہ نظر کسی تاریخی واقعات یا عوامل کی وضاحت نہیں کرتا جس سے عالمگیریت کی تعریف ہوتی ہے۔ ان ماہرین کا کہنا ہے کہ قومی حکومتوں کی طاقتیں بڑھ رہی ہیں لیکن ان حکومتوں کی نوعیت بدل رہی ہے اور عالمگیریت کے عمل کو متاثر کرنے والے عوامل کی حد زیادہ ہے اور عالمگیریت کے نتائج بہت غیر یقینی ہیں۔

تعلیم پر عالمگیریت کا اثر

عالمگیریت نے موجودہ وقت میں تعلیم کی ضرورت کو بڑھا دیا ہے اور بہت سارے ممالک کے لیے یہ مشکل کر دیا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو کافی مقدار میں اور اعلی معیار کی تعلیم مہیا کرائے۔ عالمگیریت کا زور اس بات پر ہے کہ دنیا میں موجود ہر فرد کی رسائی ہر درجے کی تعلیم تک ہو اور اس کی وجہ سے آن لائن اور فاصلاتی تعلیم کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

> **عالمگیریت نے موجودہ وقت میں تعلیم کی ضرورت کو بڑھادیا ہے اور بہت سارے ممالک کے لیے یہ مشکل کر دیا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو کافی مقدار میں اور اعلی معیار کی تعلیم مہیا کرائے۔ عالمگیریت کا زور اس بات پر ہے کہ دنیا میں موجود ہر فرد کی رسائی ہر درجے کی تعلیم تک ہو اور اس کی وجہ سے آن لائن اور فاصلاتی تعلیم کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔**

تعلیم کو نجی کرنا: عالمگیریت نے مصنوعات کی پیداوار کے ساتھ ساتھ ساری خدمات جس میں تعلیم شامل ہے کو نجی کرنے پر زور دیا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ عالمی تجارتی تنظیم (ڈبلو ٹی او/WTO) نے ان ساری خدمات کو اپنے معاہدے میں شامل کیا ہے جس پر دنیا کے اکثر ممالک کے دستخط ہیں۔ بنیادی تعلیم کو پہلے نجی کیا گیا اور پھر اعلی تعلیم کو بھی آہستہ آہستہ نجی کیا جا رہا ہے، اس کی مثال یہ کہ ہندوستان میں نئی تعلیمی پالیسی 2020 نے بھی تعلیم کو نجی کرنے پر زور دیا ہے۔

تعلیم کی تجارت: عالمی تجارتی تنظیم (ڈبلو ٹی او/WTO) عالمگیریت کی سہولت کی غرض سے معاشرتی زندگی کے تمام شعبوں کو بین الاقوامی سرمایے کے لیے کھول دیا جس میں عام خدمات جیسے تعلیم شامل ہیں اور تاجروں کو تعلیم کی خدمات کو آگے بڑھانے میں سہولت فراہم کیا۔ خدمات کی تجارت کے بارے میں عالمی تجارتی تنظیم کے عام

معاہدے میں قومی خدمات جیسے تعلیم کی تجارت کی مسلسل آزادی شامل ہے۔ مستقبل میں سماجی زندگی کے سارے پہلوؤں کی تمام خدمات کے ساتھ سرمایہ کاری ہوگی جبکہ یہ تنظیم سماجی زندگی کے سارے پہلوؤں کو سرمایہ کاری کے قابل مانتی ہے۔ عالمی تجارتی تنظیم (ڈبلوٹی او/WTO) پوری دنیا کا واحد طاقتور ادارہ ہے جس کی اطاعت کے لیے امریکہ اور یورپی یونین بھی مجبور ہیں جبکہ عالمی بینک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ خصوصاً ترقی پذیر ممالک کو متاثر کرتے ہیں۔

تعلیم کی عالمی رسائی: عالمگیریت کی وجہ سے موجودہ وقت میں زندہ رہنے اور ترقی کے لیے ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ تعلیم سے متعلق یونیسکو ترقی پذیر اور کم ترقی یافتہ ممالک میں تحقیقات کرتا ہے اور ان ممالک کو مالی تعاون بھی فراہم کرتا ہے جن کو اتنے وسائل اور سرمایہ میسر نہیں ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کو عالمی سطح کی معیاری تعلیم مہیا کرا سکیں۔ مختلف ممالک میں متعلقہ حکومتوں کی مدد سے مختلف تعلیمی منصوبے چلائے جاتے ہیں جیسے ہندوستان میں سروشکشا ابھیان (ایس ایس اے/SSA) اور راشٹریہ مادھمک شکشا ابھیان (آر ایم ایس اے/RMSA) اور اب دونوں کا مجموعہ سمگرا شکشا ابھیان وغیرہ تاکہ ہر طبقہ، ذات، نسل، خطہ، مذہب اور صنف کے لوگوں تک معیاری تعلیم پہنچ سکے۔

تعلیم کی آزادی: عالمگیریت تعلیم جیسی عوامی خدمات کی فراہمی میں حکومت کے کردار کو کم کرنے اور محدود کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اس اکیسوی صدی نے ریگولیٹری میکانزم کے ساتھ تعلیم کو ایک آزاد منڈی میں بطور انڈسٹری بنا دیا ہے۔ عالمگیریت کا تقاضا ہے کہ تعلیم کے شعبے میں لائسنسنگ کے ساتھ ساتھ تجارتی آزادی ہو اور تعلیمی اداروں کو آزادی کے ساتھ ساتھ کاروباری کارپوریشن کی طرح کام کرنے کا مکمل اختیار ہو۔

تعلیم میں ٹیکنالوجی کا استعمال: یہ عالمگیریت کا اثر ہے کہ پوری دنیا معلومات سے بھرپور معاشرے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ معلومات اور مواصلات کی ٹکنالوجی (آئی سی ٹی/ICT) کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور تکنیکی گزیٹ کا استعمال، مصنوعی ذہانت، ای لرننگ، آن لائن کلاس، معنوی درسگاہیں، ڈیجیٹل پلیٹ فارم، ڈیجیٹل لائبریری، ڈیجیٹل ڈھانچہ وغیرہ اس عالمگیریت کی مرہون منت ہیں۔ تعلیم میں آئی سی ٹی اور ٹیکنالوجی کا استعمال طلبا، اساتذہ اور انتظامیہ کو موجودہ نظام تعلیم میں رہ کر بہتر انداز میں کام کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اکیسویں صدی میں پوری دنیا تیزی سے بدل رہی ہے، سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے جیسے بڑے اعداد و شمار، مشین لرننگ اور مصنوعی ذہانت وغیرہ کے میدان میں تیزی سے ایجادات اور اختراعات ہو رہی ہیں۔

عالمی سطح کی معیاری تعلیم: دنیا میں معیاری تعلیم اور اس کے نظام کے لیے کی جارہی کوششیں عالمگیریت کے اثرات کی عکاسی کرتی ہیں اور موجودہ وقت میں معیاری تعلیم دنیا میں نہایت ضروری ہوگئی ہے۔ عالمگیریت نے تعلیم جیسی خدمات میں بھی ایک مسابقتی مارکیٹ تیار کیا ہے اور یہ لازم کردیا ہے کہ ہر فرد بین الاقوامی معیار کی تعلیم حاصل کرے اور ہر ادارہ اسی معیار کی تعلیم فراہم کرے تاکہ عالمی مارکیٹ میں برقرار رہ سکے اور ترقی کر سکے۔ ڈیلر کمیشن کی رپورٹ اکیسویں صدی کی نسل کی رہنمائی کے لیے عالمگیریت کے پیش نظر تیار کی گئی تھی اور اس رپورٹ نے معیاری تعلیم کے چار ستون پیش کیے جیسے یہ سیکھنا کہ کیا اور کون سی چیزیں جاننا ہے، کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے، کیا بننا ہے اور کیسے بننا ہے اور یہ سیکھنا کہ سماج میں کیسے ساتھ رہنا ہے۔

تعلیم کی عالمگیریت: اکیسویں صدی نے تعلیم کی عالمگیریت کے عمل کو تیز کردیا اور پوری دنیا نے اس کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور یہ متعدد شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے غیر ملکی طلبا کے لیے داخلے کی سہولت، دنیا کے کسی حصے میں پیشہ ورانہ ملازمت اختیار کرنا، مختلف ممالک کے ماہرین تعلیم کے ساتھ تحقیقات کرنا، دو ملکوں اور کئی ممالک کے مابین اساتذہ کا تبادلہ، نامور بین الاقوامی یونیورسٹیاں، معروف بین الاقوامی مدارس، معزز بین الاقوامی تعلیمی ادارے، ہزاروں آن لائن کورسز اور مختلف ممالک میں سیٹلائٹ کیمپس وغیرہ۔ تعلیم کو عالمگیر ہونا ہی ہے کیوں کہ پورا معاشرہ عالمگیریت کی راہ پر گامزن ہے۔

آن لائن اور فاصلاتی تعلیم: تعلیم کو عالمگیر بنانے اور اس کو دنیا میں موجود ہر فرد تک پہونچانے کے لیے آن لائن اور فاصلاتی تعلیم کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ان کے ذریعے ہر فرد کو اپنی ضرورت کے حساب سے علم حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ تعلیم ایک مسلسل عمل ہے اور انسان پوری زندگی سیکھتا ہے لہٰذا زندگی کے ہر مرحلے میں اس کے لیے سیکھنے کا راستہ ہموار ہونا چاہیے۔ آن لائن اور فاصلاتی تعلیم کے ذریعے افراد کام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے تعلیم سستی اور آسان بھی ہوئی ہے۔ اب لوگ مدارس، اسکول، کالج، یونیورسٹیاں اور دوسرے تعلیمی ادارے میں گئے بغیر تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے دنیا میں خواندگی کی شرح بڑھی ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم پر زور: اس عالمگیریت کے وقت میں سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اس میدان میں مختلف معروضی تحقیقات ہو رہی ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت اور ضرورت میں اضافے نے ان کی تعلیم پر زور کو بڑھا دیا ہے۔ اسی وجہ سے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں نئے نئے کورسز اور تکنیکس شروع ہو رہے ہیں اور نئے نئے ڈپارٹمنٹ اور ادارے نیز لیب کھل رہے ہیں۔ آج کے اس دور میں ہر ملک سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم پر زور دے رہا ہے جیسا کہ نئی قومی پالیسی 2020 نے بڑی باریکی سے تعلیم اور ٹکنالوجی کے باہمی رشتے پر غور کیا اور اس کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ آج کی معیشت مکمل طور سے سائنس اور ٹکنالوجی پر منحصر ہو چکی ہے اور جو ملک سائنس اور ٹکنالوجی میں جس قدر آگے ہے اسی اعتبار سے اس دنیا میں قدر اور مرتبہ رکھتا ہے۔

پیشہ ورانہ تعلیم: عالمگیریت کا بنیادی مقصد پیداوار بڑھانا اور تعلیمی نظام کو ایک آلہ بنانا ہے تاکہ وہ طلبا کو تیار کرے کہ طلبا دنیا کی موجودہ مارکیٹ میں معاشرے کے ثمر آور رکن کے طور پر مقابلہ کر سکیں اور اس مادیت کے دور میں بغیر کسی احتیاج کے خوشحال زندگی گزار سکیں۔ بڑھتی ہوئی حرفت کی نوعیتیں، نئی نئی ٹکنیکل ایجادات، تحقیقی اختصاص اور اسی اعتبار سے خاص مہارتوں کی ضرورت نے پیشہ ورانہ تعلیم کی اہمیت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ پیشہ

”دنیا میں معیاری تعلیم اور اس کے نظام کے لیے کی جارہی کوششیں عالمگیریت کے اثرات کی عکاسی کرتی ہیں اور موجودہ وقت میں معیاری تعلیم دنیا میں نہایت ضروری ہو گئی ہے۔ عالمگیریت نے تعلیم جیسی خدمات میں بھی ایک مسابقتی مارکیٹ تیار کیا ہے اور یہ لازم کردیا ہے کہ ہر فرد بین الاقوامی معیار کی تعلیم حاصل کرے اور ہر ادارہ اسی معیار کی تعلیم فراہم کرے تاکہ عالمی مارکیٹ میں برقرار رہ سکے اور ترقی کر سکے“

ورانہ تعلیم زیادہ محسوس ہونے کی وجہ سے اس کو اسکولوں کے نصاب میں شامل کیا جا چکا ہے بلکہ اس کی طرف طلبا اور والدین کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے۔

نصاب میں مسلسل بدلاؤ: جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ عالمگیریت کے اس دور میں زندگی اور معاشرے کے ہر شعبے میں ہر روز نئی نئی اختراعات اور ایجادات ہو رہی ہیں اور ان سب کا اثر بالواسطہ اور بلا واسطہ تعلیم پر ہو رہا ہے۔ اس تیزی سے بدل رہے معاشرے کو دیکھتے ہوئے ضرورت کے حساب سے تعلیم اور خصوصاً نصاب میں مسلسل بدلاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ نصابی بدلاؤ کبھی کم اور کبھی زیادہ اور پالیسی کے درجے پر بھی ہوتا ہے پھر عالمی اور قومی اداروں کو اس کی پیروی کی لیے کہا جاتا ہے جیسے قومی نصاب تعلیم فریم ورک (این سی ایف/NCT) 2005 اور ڈیلر کمیشن رپورٹ 1996۔ وقت اور حالات کے اعتبار سے معلوماتی مواد اور تدریسی عمل دونوں میں بدلاؤ اور سدھار ہوتے ہیں۔

تعلیمی پالیسی: عالمگیریت کا اثر تعلیم پر ہر زاویے سے ہے لہذا تعلیمی پالیسی کیسے اس کے اثر سے باہر رہ سکتی ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کی سب سے پہلے تعلیم پالیسی کے درجے پر ہی متاثر ہوئی۔ عالمگیریت کا اثر دنیا کے سارے ممالک (ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور غیر ترقی یافتہ) کی تعلیمی پالیسیوں میں دیکھا جا سکتا ہے اور اس کی واضح مثال ہمارے ملک کی نئی تعلیمی پالیسی 2020 ہے جس نے بنیادی اور اعلی تعلیم کی نج کاری، عالمی اور بین الاقوامی تعلیمی اداروں کی ملک میں آمد، ملکی تعلیم کی مرکزیت اور تعلیم کو ڈیجیٹل کرنے پر زور دیا ہے۔

تعلیمی نظم و نسق: تعلیمی نظم و نسق پر بھی عالمگیریت کا عمل اثر انداز ہوا ہے اور پوری دنیا میں اس کے متعلق رائج طور طریقے میں تبدیلی کا باعث بنا ہے۔ عالمگیریت کی وجہ سے تعلیمی اداروں کا نظم و نسق کاروباری اداروں اور دیگر عام انتظامی محکمات کی طرح ہو گیا ہے۔ تعلیم کی مرکزیت کا باعث بھی عالمگیریت کو مانا جاتا ہے۔

تعلیم اور اس کا تصور:

محققین اور ماہرین تعلیم کی مختلف تعریفیں کرتے ہیں اور مختلف انداز میں اس کی وضاحت بھی کرتے ہیں لیکن مختصر یہ کہ تعلیم حصول علم کا ایک تا حیات عمل ہے جو انسانی زندگی اور طرز عمل میں مثبت تبدیلیاں لاتی ہے۔ مہاتما گاندھی اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ "تعلیم سے میری مراد بچے اور انسان کے جسم، دماغ اور روح میں پائی جانے والی ہمہ جہت صلاحیتوں کو باہر نکالنا ہے"۔ تعلیم سیکھنے کی سہولت فراہم کرنے، یا علم، ہنر، اقدار، اخلاقی

عالمگیریت کے اس دور میں ان ممالک کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جہاں انسانی وسائل کی کمی ہے۔ مزید برآں، یہاں تک کہ ترقی یافتہ ممالک کو بھی آزاد بازار میں مقابلہ کرنا مشکل محسوس ہوتا ہے جب تک کہ وہ معیاری تعلیم و تربیت اور تحقیق میں سرمایہ کاری نہ کریں۔ معیاری تعلیم انسانی ترقی اور وسائل کی برق رفتار ترقی اور اعلی پیداوار کا باعث ہے۔ معاشی اور معاشرتی ترقی کے لیے تعلیم ہمیشہ ہی ایک عنصر رہی ہے جیساکہ بہت ساری سائنسی تحقیقات نے اشارہ کیا ہے۔

عقائد اور عادات کے حصول کا عمل ہے۔ درحقیقت، تعلیم صرف کلاس روم کی چہاردیواری کے اندر ہی نہیں ہوتی بلکہ تعلیمی اداروں کے باہر اپنے تجربات سے کہیں بھی تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے۔ تعلیم کی بنیادی تین قسمیں ہیں، رسمی تعلیم، نیم رسمی تعلیم اور غیر رسمی تعلیم۔

عالمگیریت پر تعلیم کے اثرات

تعلیم کا بھی عالمگیریت کے عمل میں ایک اہم رول ہے اور تعلیم بالواسطہ اور بلا واسطہ عالمگیریت کے عمل میں اہم کردار نبھانے والے اسباب اور وجوہات کو متاثر کرتی ہے۔ عالمی معیشت کی ترقی نے ان ممالک کے لیے امکانات کو بڑھا دیا جن کی تعلیم کا معیار اچھا ہے لیکن دوسری طرف ان ممالک کے لیے مشکلات پیدا کر دی جن کے یہاں تعلیم کا معیار اچھا نہیں ہے۔ تعلیم پوری دنیا میں انسانی وسائل کی ترقی کا بہترین واحد ذریعہ ہے۔ اچھے وسائل اور معاشی پالیسیاں رکھنے والے ممالک کو ٹکنالوجی، برآمدات اور فی کس آمدنی میں تیزی سے ترقی ملتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ غیر ملکی سرمایہ کاری کو راغب بھی کرتے ہیں۔ عالمگیریت کے اس دور میں ان ممالک کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جہاں انسانی وسائل کی کمی ہے۔ مزید برآں، یہاں تک کہ ترقی یافتہ ممالک کو بھی آزاد بازار میں مقابلہ کرنا مشکل محسوس ہوتا ہے جب تک کہ وہ معیاری تعلیم و تربیت اور تحقیق میں سرمایہ کاری نہ کریں۔ معیاری تعلیم انسانی ترقی اور وسائل کی برق رفتار ترقی اور اعلی پیداوار کا باعث ہے۔ معاشی اور معاشرتی ترقی کے لیے تعلیم ہمیشہ ہی ایک عنصر رہی ہے جیسا کہ بہت ساری سائنسی تحقیقات نے اشارہ کیا ہے۔

عالمگیر تعلیم: عالمگیر تعلیم کا مقصد بین الاقوامی معاشرت اور عالمگیر شہریت نیز عالمی اخوت اور انسانیت کی ضرورت اور اہمیت پر زور دینا اور بین الاقوامی مکالمے اور تعاون کو رائج کرنا ہے۔ عالمگیر تعلیم بین الاقوامی افہام و تفہیم اور آپسی معاونت کی دعوت کے ساتھ ساتھ علاقائی تہذیب و تمدن اور ثقافت بلکہ انفرادی تہذیب پر بھی زور دیتی ہے۔ عالمگیر تعلیم لوگوں کو اس بات کا درس دیتی ہے کہ قوم، مذہب، ذات، نسل، علاقہ اور جنس وغیرہ جیسے محدود سوچ اور سمجھ سے اوپر اٹھ کر عالمی بصیرت پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس کا مقصد عالمی اخوت، عالمی امن و امان، سماجی انصاف، بین الاقوامی معاونت و شراکت کا حصول اور آپسی اختلافات کے باعث اسباب جیسے حرص، خودغرضی، حسد و کینہ، نفرت و عداوت اور عدم مساوات وغیرہ سے تحفظ ہے۔ عالمگیر تعلیم پوری انسانیت کے لیے ایک خوشگوار مستقبل ہے جو ہر فرد کو ایک بہتر زندگی گزارنے کی راہ دکھاتی ہے۔

حوالے

1 انگیز ہیڈرسی اور کے کارویک (2007)۔ حکومتیں، برآمدات اور نشوونما: عالمگیریت کے چیلنجیز اور مواقع کا جواب۔ عالمی معاش، 30(1)، 177-194

2 بشوپ ٹی اور اڈمس ٹی (2011)۔ عالمگیریت: رجحانات اور نظریات۔ جرنل آف عالمی تجارتی تحقیق، 10(1)، 117-130

3 چھبائی ایس (2005)۔ تعلیم اور کلچر پر عالمگیریت کے اثرات، نئی دہلی

4 جاروس پی (2000)۔ عالمگیریت، آموزشی معاشرہ اور مقابلہ جاتی تعلیم 36(3)، 343-355

5 جانس پی ڈبلو (1998)۔ عالمگیریت اور بین الاقوامیت: عالمی تعلیم کے ڈیموکریٹک تناظر۔ مقابلہ جاتی تعلیم، 34(2)، 143-155

6 روزا ایم اور فاطمہ ایس ایف (2017)۔ تعلیم پر عالمگیریت کا اثر۔ تھیاگا راجر کالج آف پرسپیرس، 39۔

7 اسٹوارت ایف (1996)۔ عالمگیریت اور تعلیم۔ تعلیمی نشوونما کا بین الاقوامی جرنل، 16(4)، 327-333

8 جاروس پی (277)۔ عالمگیریت، تازندگی تعلیم اور علمی معاشرہ: عمرانی تناظر۔ راوٹلج۔

■

Aftab Alam
Assistant Professor
College of Teacher Education (MANUU)
Darbhanga, Ilyas Ashraf Nagar
Chandanpatti, Laheria Sarai
Darbhanga - 846001 (Bihar)

چرند پرند
تہذیب و تاریخ کے آئینے میں

شاذیہ عمیر

ہندوستانی باشندے روزِ اول سے ہی پیڑ پودے، جنگلوں اور بنوں سے پیار کرنے کی طرف مائل رہے ہیں۔ یہاں کے رشی منی بار بار انسانی آبادی سے نکل کر جنگلوں، پہاڑوں اور ویرانوں کی طرف مراجعت کرتے رہے ہیں تاکہ نفسانی اور مادی خواہشات سے پیچھا چھڑا کر خود کو روحانی سطح پر مجتمع کر سکیں۔ اپنے وجود کی گہرائی میں ڈوب جانے، بنوں، جنگلوں کی پرسکون اور پاکیزہ زندگی نے نہ صرف یہ کہ انھیں علم و عرفان کے حیرت زا گوشوں سے روشناس کرایا، یہاں کی جڑی بوٹیاں، پھل پھول کے ساتھ جانوروں اور پرندوں نے ان پر علم و اخلاق کے گہرے اسرار و رموز منکشف کیے اور زندگی کے بعض ایسے لاینحل سوالوں کے جواب عطا کیے کہ عقل حیران ہے۔

اکبر کے نورتنوں میں مشہور ایک رتن 'تان سین' کے بارے میں واقعہ ہے کہ ایک دفعہ موسیقاروں کا گروپ جنگل سے گزر رہا تھا۔ اتفاقاً وہاں تان سین بھی موجود تھے۔ ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر انھوں نے ایسی آواز نکالی جیسے کوئی شیر گرج رہا ہو۔ اس گروپ میں مشہور موسیقار استاد ہری داس بھی تھے۔ جب انھوں نے تان سین کو دیکھا کہ یہ آواز انھوں نے نکالی ہے تو ان کی بے حد تعریف کی۔ مزید چڑیوں اور جانوروں کی آواز بھی اسی کامیابی کے ساتھ ادا کی۔ یہاں تک کہ ہری داس نے انھیں اپنا شاگرد بنا لیا اور دس سال تک وہ ان کی شاگردی میں رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان کے چرند، پرند اور پیڑ پودے یہاں کے دانشوروں اور فن کاروں پر کس قدر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ صرف جانور ہی نہیں بلکہ قدیم ہندستان چونکہ زراعتی نظام کا حصہ تھا، ہر طرف کھیت لہلہاتے تھے۔ اس لیے پانی، ہوا اور بجلی کی کڑک بھی دیوی دیوتاؤں کے روپ میں پوجے جاتے تھے۔ رگ وید میں ہوا یعنی وایو سے خطاب کا ایک منظر دیکھیے:

وایو، یا واٹ (ہوا سے خطاب)
میں واٹ کے بڑے رتھ کو پرنام کرتا ہوں
یہ گرج کی مدد سے ہوا کو تار تار کرتے ہوئے گزرتا ہے
گزرتے ہوئے یہ آکاش کو چھو کر لال بھبھوکا بنا دیتا ہے
زمین پر سے گرد کو بگولوں میں اڑا دیتا ہے
جھونکے اس کا یوں تعاقب کرتے ہیں جیسے کنواریاں میلے کو جاتی ہیں[1]

اب بارش کی منظر کشی کا یہ انداز ملاحظہ کیجیے۔

اس کوچوان کی طرح جو چابک سے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھائے
برکھا کا سندیسہ لانے والوں کو سامنے لے آتا ہے
ہوا بگڑ کر چنگھاڑتی ہے، بجلیاں چمکتی ہیں
دھرتی سے بوٹیاں باہر نکل آتی ہیں، آکاش چھلک جاتا ہے
تازہ غذا سب کو ملتی ہے جب پرجنیہ دھرتی کو برکھا کا دان دیتا ہے[2]

اس کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر نے تخیل اور حقیقت کو ایک دھاگے میں پرو کر مظاہر فطرت سے اپنی شدید وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ ہوا اور بارش اس کے لیے ایک ایسے جیتے جاگتے کردار ہیں، جن سے وہ صَرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

اگرچہ وید، رگ وید اور اپنشدوں میں صاف طور پر کہانیاں نہیں ملتیں لیکن بعض عناصر ایسے ضرور ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بھی ہندوستانی لوگ کہانیوں کی طرف مائل تھے۔ رگ وید میں جہاں برہمنوں کو مینڈک کہا گیا ہے، وہیں اپنشدوں میں بھی ایسی کہانیاں ملتی ہیں جن میں جانوروں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اپنشد میں انسان اور جانور اہم رول ادا کرتے ہیں۔

وزیر آغا اردو شاعری کے مزاج میں دو تہذیبوں کی آویزش کے باب میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

''ہڑپا کی کھدائی میں سینگوں والا ایک ایسا دیوتا ملا ہے جو سمادھی کے آسن میں بیٹھا ہے۔ اس کے چاروں طرف جنگلی جانور ہیں اور اس کے سر پر سینگوں کے علاوہ پودے جیسا کچھ اُگا ہوا ہے، اس دیوتا ہی کے گرد جنگلی جانور نہیں دکھائے گئے ہیں۔ بلکہ ہڑپا کلچر میں جنگلی جانور مثلاً ہاتھی، شیر، بندر، ہرن اور زیبرا وغیرہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جانوروں کے وجود کو مذہب کے سلسلے میں بے حد اہمیت حاصل تھی۔ گائے، شیش ناگ اور بیل کو خاص طور سے لوگ پوجا کرتے تھے۔ یہ وابستگی یہاں تک بڑھی کہ رگ وید کے آخری حصے میں یہ تصور ابھر آیا کہ موت کے بعد انسان کی روح پودے یا جانور میں منتقل ہو جاتی ہے اور پھر دوبارہ انسان کے روپ میں جنم لیتی ہے۔ اُپنشد اور بدھ مت میں سلسلہ تناسخ اسی ابتدائی صورت سے ماخوذ ہے۔''[3]

جیسے جیسے قدیم ہندستان کے باشندے انکشاف و عرفان کے مرحلے سے گزرتے گئے، ان کے گرد بسنے والے چرند و پرند بھی ان کی حکمت و دانائی میں شریک ہونے لگے اور حیات و ممات کے اسرار و رموز سمجھنے لگے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستانی تہذیب میں انسان اور جانوروں کا رشتہ کتنا گہرا ہے۔ مہا بھارت اور رامائن جیسی مہا کاویہ میں بھی انسان اور جانوروں کے رشتے کا ذکر بار بار آیا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب زندگی اور اس کے حقائق کا علم و عرفان حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ انسان فطرت کے قریب تھا اور وہ اس کے تمام مظاہر کو والہانہ گلے لگانے کے لیے بے قرار تھا۔ سید عابد علی عابد 'خرد افروز' کے مقدمے میں قدیم ہندوستانی تہذیب و معاشرت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ریارڈ کپلنگ 'جنگل بک' کے افسانوں اور اپنے ناول 'KIM' میں لکھتا ہے کہ

برصغیر کی دھرتی پر گاؤں کچھ اس طرح واقع تھے جیسے جنگلوں اور پہاڑوں کی گود میں آباد ہوں۔ان کی زندگی پرندوں، چوپایوں اور دوسرے جانوروں کے بہت قریب تھی۔ انسان اپنے ان ہمسایوں کی حیات کے اسرار ورموز سمجھتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ دن کی محنت کے بعد جب رات میں محفل جمتی تو افسانوں اور داستانوں میں انسان کے ساتھ ساتھ چرند پرند بھی کردار بن کر شامل ہوتے اور اپنے وجود کا مکمل احساس دلاتے رہتے۔''4

'پنچ تنتر' بھی زندگی کے انھی اسرار ورموز کو سمجھنے کی ایک کاوش ہے۔اس میں انسانوں کے برعکس جانوروں نے بولنا شروع کر دیا ہے اور ان کے کوائف کو سمجھا ہے اور اپنی زندگی کے مسائل کے پردے میں انسانی زندگی کے بنیادی مسائل سے بحث کی ہے۔مثلاً اخوت، انسانیت، ہمدردی، رفاقت، محبت ونفرت، شکست و فتح، آبادی و بربادی، وفاداری وغداری، چالاکی وعیاری۔غرض زندگی کی متنوع کیفیات اور خیر وشر کی کشمکش کی تمام صورتیں اس میں موجود ہیں۔اس اعتبار سے 'پنچ تنتر' کی کہانیاں ازلی وابدی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس کے ماٰخذ کا سراغ مشکل سے ملتا ہے۔ان کہانیوں کی جڑیں ہندستان کی دھرتی میں بہت گہرائی تک اتری ہوئی ہیں۔ برس ہابرس کے تجربات، مشاہدات اور مطالعات کا ایک وسیع وبیکراں سمندر اس کے وجود میں موجزن ہے۔اس لیے کسی ایک شخص کی اجارہ داری تسلیم نہیں کی جاسکتی۔

یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس کے بغیر مشرقی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ یہ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل تھی۔ امتداد زمانہ سے اصل کتاب کے آٹھ باب تلف ہوگئے اور صرف پانچ باقی رہ گئے، جن کا نام بعد میں 'پنچ تنتر' رکھا گیا۔ ڈاکٹر ہرٹل کا خیال ہے کہ اسے دوسو سال قبل مسیح کشمیر میں خلق کیا گیا لیکن تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ اس کی بارہ کہانیاں ایسی ہیں جو اور بھی قدیم ہیں۔اس تصنیف کا مقصد راجاؤں اور شہزادوں کو اصول حکومت کی تعلیم دینا اور دنیاداری کے تقاضوں کو سمجھانا تھا۔'پنچ تنتر' کے مختلف حصے مختلف زمانے میں جمع کیے گئے۔مختلف ممالک کے بادشاہوں کی یہ خواہش تھی کہ شاہی آداب، سیاسی امور اور معاشرتی زیر وبم کے آئینے میں ایسی کتاب تصنیف کی جائے جو طبیعت پر گراں بھی نہ گزرے اور اس سے حکمت ودانائی کا جوہر بھی کھل کر سامنے آجائے۔ ہندستان میں سیاست سے متعلق اور کتابیں بھی مشہور ومقبول ہوئیں ہیں مثلاً 'ارتھ شاستر'، فارسی میں 'نظام الملک' سے لے کر 'اخلاق جلالی' تک سیاست کے رموز واسرار پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن جانوروں کی زبانی اسرار ورموز کا بیان صرف 'پنچ تنتر' میں ملتا ہے۔

مشہور ہے کہ اس کتاب کی شہرت سن کر ایران کے شہنشاہ خسرو نوشیرواں 531 تا 579 عیسوی نے ہندستان کے ایک برہمن سے پوچھا کہ ملک یونان میں مشہور ہے کہ ہندستان کی سرزمین میں ایسے پہاڑ ہیں جن کی جڑی بوٹیاں مُردوں کو زندہ کردیتی ہیں۔ کیا یہ بات سچ ہے؟ برہمن نے کہا۔ سچ ہے لیکن پہاڑوں سے مراد 'دانا' ہیں اور جڑی بوٹیاں 'حکمت' کی باتیں ہیں۔انھی اصول پر ہند کے داناؤں نے ایک کتاب بنائی ہے جس کا نام 'پنچ تنتر' ہے۔ یہ وہ تصنیف ہے جس کی خزانوں سے بڑھ کر حفاظت کی جاتی ہے اس لیے اسے حاصل کرنا بے حد مشکل ہے۔

نوشیرواں نے انتہائی کوشش کے بعد اپنے طبیب بُرزویہ کو ہندستان بھیجا۔ اس نے مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے یہ کتاب حاصل کی اور نوشیرواں کی خدمت میں پیش کی۔نوشیرواں نے طبیب کو انعامات واکرامات سے سرفراز کیا۔

عربی کی مشہور کتاب 'کلیلہ ودمنہ'، 'پنچ تنتر' ہی کے پہلوی ترجمہ سے عربی میں منتقل ہوئی ہے۔ 'کلیلہ ودمنہ' کتاب کے دو کردار جو دراصل میں گیدڑ ہیں۔اس کے معنی کیا ہیں یہ ابھی تک پردہ خفا میں ہیں۔ انھیں دو کرداروں کے نام پر کتاب کا نام رکھا گیا۔ حکیم برزویہ نے اصل سنسکرت (پنچ تنتر) کا پہلوی زبان میں ترجمہ کیا۔ پہلوی سے ابن المقفع نے عربی میں ترجمہ کیا۔ محققین کی نظر میں اس عربی ترجمے کی اہمیت اس لیے ہے کہ نہ تو پہلوی نسخہ ملتا ہے اور نہ اصل سنسکرت کا کوئی پتہ ہے۔ 'کلیلہ ودمنہ' کے نام سے نصراللہ مستوفی نے فارسی نسخہ مرتب کیا۔ ملا حسین واعظ کاشفی نے 'کلیلہ ودمنہ' مؤلف نصراللہ سامنے رکھ کر پرتصنع زبان میں ایک کتاب تالیف بلکہ تخلیق کی جو بے حد مقبول ومعروف ہوئی اور 'انوار سہیلی' کے نام سے مشہور ہے۔ بادشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں ابوالفضل نے بحکم بادشاہ سنسکرت کتاب کو سامنے رکھ کر آسان اور عام فہم زبان میں 'عیار دانش' کے نام سے اسے مرتب کیا۔ 'انوار سہیلی' کے کئی دکنی ترجمے ہوئے۔ عبرانی، ترکی، حبشی اور آرش وغیرہ زبان میں بھی ہوا۔

بعض محققین یورپ کی یہ بھی رائے ہے کہ 'جاتک کتھاؤں' کے چند قصوں کا نام ہی 'کلیلہ ودمنہ' ہے۔ سنسکرت میں اس کتاب کا اصل نام 'کرٹکا ودمنکا' تھا۔ پہلوی میں 'کلیگ ودمنگ' ہوگیا۔ بعض کا خیال ہے کہ پنچ تنتر کا خلاصہ ہتوپدیش ہے اور ہتوپدیش کی حکایات کا ترجمہ 'کلیلہ ودمنہ' ہے۔ غرض یہ کتاب دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں ترجمہ ہوکر ہر زمانے میں ادب کے تمام گوشوں پر اثر انداز ہوئی۔ داستان در داستان کی تکنیک سے ہم اسی کے ذریعے متعارف ہوئے۔

'کتھا سرت ساگر' اسی تالیف کی مرہون منت ہے۔ 'الف لیلیٰ' کے اسلوب پر بھی یہ اثر انداز ہوئی اور پھر دائرہ در دائرہ نظام الملک کے 'سیاست نامہ' سے لے کر قابوس نامہ، چہار مقالہ، گلستان، بہارستان، خارستان، اور حکایاتِ لقمان تک پر اس کے اثرات واضح ہیں۔ فرانسیسی اور انگریزی ادب کی مختلف داستانوں اور افسانوں پر اس کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ کلیلہ ودمنہ دراصل ایک ایسی تالیف ہے جو ادب عالیہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس پر اتنی بحثیں اور اس کے ہر پہلو پر اتنی تحقیق ہوئی ہے کہ کوئی کتاب اس اعتبار کو نہیں پہنچ سکتی۔ مستشرقین نے خصوصاً اسے مرکز توجہ بنایا لیکن ان سب کی اصل 'پنچ تنتر' ہے۔ اگر یہ تصنیف نہ ہوتی تو کلیلہ ودمنہ کا وجود بھی نہ ہوتا۔ کوئی ایسی تصنیف جس کی پذیرائی عالمی پیمانے پر ہوئی وہ 'پنچ تنتر' ہے جو مذکورہ بالا تمام تالیفات کی منبع ومخرج کی حیثیت رکھتی ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے 'خرد افروز' کے مقدمے میں عابد علی عابد رقم طراز ہیں:

''ملک الشعرا بہار نے لکھا ہے کہ دنیائے ادب میں کوئی کتاب ایسی نہیں کہ اتنی مدت تک مقبول اور محبوب ومرغوب رہی ہو اور جس کے متعلق یقین ہو کہ رہتی دنیا تک اس کی ہر دلعزیزی کا یہی عالم رہے گا۔ کسی قوم کی تخصیص نہیں، کسی زمانے کی قید نہیں، کسی عہد کی شرط نہیں، ہر جگہ، ہر وقت مختلف معاشرتی اداروں میں اور ثقافتی مرکزوں میں یہ تالیف دلپذیر اور مقبول رہی ہے۔ بادشاہوں نے اسے سبقاً سبقاً پڑھا ہے، رات کو خوش رو اور خوش گلو غلاموں اور کنیزوں سے اس کی کہانیاں سنی ہیں، امرا نے حل مشکلات میں اس کو پیش نظر رکھا ہے، عام لوگوں نے اسے دستور حیات سمجھا ہے، صوفیوں نے اور نجات کے طالب علموں نے اس کے مندرجات میں عالم گیر صداقتوں کی جھلک دیکھی ہے۔ چودہ سو سال ہوگئے، اس کی شہرت اسی طرح اوج پر ہے۔ خاص وعام اس کے دلدادہ ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کتاب کا مؤلف یا اس کے مؤلفین علم حیات اور علم نفس کے ماہر تھے، زندگی کے تجربات سے بہرہ یاب تھے، زمانے کے اونچ نیچ سے آگاہ تھے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ تالیف ہندوستان کی فکری اور ذہنی تاریخ کا نقطۂ عروج ہے۔ وہاں کے دانشوروں اور مفکروں کے تجربات کا ماحصل ہے۔''5

اب ایک سوال جو ذہن میں ابھرتا ہے کہ آخر اس تصنیف میں ایسی کون سی خوبی ہے جس کی وجہ سے یہ ہر زمانے میں مقبول ومعروف رہی ہے اور آج بھی اس کی

مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے اس کی روشنی مزید ذہنوں کو علم و عرفان سے منور کر رہی ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کتاب کا مصنف انسانی فطرت کا مزاج داں اور انسانی جذبات کا نبض شناس ہے۔ اگر چہ یہ حقیقت ہے کہ 'پنچ تنتر' کے کردار جانور ہیں لیکن یہ جانور جو کچھ بھی کہتے ہیں اس میں ایک آفاقی صداقت ہے۔ انسان جانوروں کی دنیا میں پہنچ کر خود کو فطرت سے بہت قریب محسوس کرتا ہے۔ ہر واقعہ میں ایک منطقی افسانوی ربط پایا جاتا ہے۔ یہ تمام کہانیاں انسان کے گذشتہ تجربات کا نچوڑ ہیں۔ ہر موقع اور مشکل وقت میں کچھ کردار انسان کو ہمت و حوصلہ عطا کرتے ہیں اور انسان کو دانائی اور صداقت کی راہ دکھاتے ہیں۔ اس کتاب کا مصنف انسان کی نفسیات اور فطرت کا نبض شناس معلوم ہوتا ہے۔ اور زندگی کے تجربات سے پوری طرح آشنا ہے۔ یہ تصنیف ہندوستان کے ذہنی و فکری ارتقا کی ایک مکمل تاریخ ہے۔

ادب عالیہ کی تاریخ گواہ ہے کہ 'پنچ تنتر' نے دنیا کی تمام بڑی اور مہذب زبانوں کو متاثر کیا ہے۔ اس کتاب میں جس طرح سے ہندوستانی رنگ غالب ہے اس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ 'پنچ تنتر' کی کہانیاں مشرق سے مغرب تک ترجمہ کے ذریعے گئیں نہ کہ مغرب سے مشرق کی طرف آئیں۔ رولنسن نے یہاں تک کہا کہ 'پنچ تنتر' کی کہانیوں میں جتنے بھی اہم جانوروں کا ذکر ملتا ہے وہ خالص ہندستانی ہیں۔ مثلاً شیر، گیدڑ، ہاتھی، مور، سانپ اور مینڈک۔ یہ بھی خالص ہندستانی تہذیب کے عناصر ہیں۔ 'پنچ تنتر' کی کہانیوں کی تخلیق کا واحد مقصد یہ تھا کہ انسانی فطرت کے متعلق زیادہ سے زیادہ باتیں سکھائی جا سکیں۔ اس لیے جانوروں کی دنیا سے ایسی باتیں چن کر پیش کی گئیں جن سے انسان واقف تھا اور اس سے انسان کو عملی جد و جہد میں مدد مل سکے۔ اور وہ اپنی زندگی بہتر طریقے سے گزار سکے۔

ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی 'پنچ تنتر' کی کہانیوں نے ہندوستانی سماج کی دبے پاؤں اصلاح کی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس کے خالق نے زندگی کے تلخ و ترش تجربات کو بھی معصوم جانوروں کی زبانی ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ ہمیں گوارا معلوم ہونے لگتے ہیں۔

'پنچ تنتر' کی کہانیوں میں مذہب، فلسفہ اور اخلاقیات کا جلوہ ہر جگہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مثلاً کسی کہانی میں ساحل کی ایک چڑیا سمندر کو ڈراتی ہے۔ کسی میں ایک کمزور چوہے کے تجربات ہیں۔ کہیں ایمانداری کو زندگی کی سب سے اہم دولت بتایا گیا ہے۔ کسی میں بندر کا ڈھول سے ڈر جانے کا واقعہ ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ڈھول اندر سے خالی ہوتا ہے، سوائے چمڑے کے غلاف کے۔ اسی طرح سے ایک دوست کا دوسرے دوست کو اپنی محبت اور اپنے خلوص کا شدید احساس دلانا، جنگ اور ان کی حقیقت کو سمجھنا، شاہی اصولوں سے آگاہ ہونا، یہ تمام باتیں 'پنچ تنتر' میں موجود ہیں۔

کہانی 'دوستی' میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو ہر طرح کے لوگوں سے دوستی کرنی چاہیے کیونکہ مصیبت کے وقت کب کس کی ضرورت پڑ جائے نہیں معلوم۔ اس بات کو کبوتر اور چوہے کی دوستی، کوے اور ہرن کی دوستی کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ زندگی میں سچے اور جھوٹے دوست کیسے ہوتے ہیں۔ کس طرح کبوتر کی ایک چھوٹے سے چوہے نے مدد کی اور وہ شکاری کے جال سے آزاد ہو گیا۔ اسی طرح ایک لمبے چوڑے ہرن کی مدد ایک ادنیٰ سے کوے نے کی۔

'پنچ تنتر' کی کہانیوں میں یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حرص و طمع کس طرح انسان کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اسے ایک حکایت کے ذریعے یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک بلی تھی جس کی بھوک کسی طور مٹتی نہیں تھی۔ نتیجہ رزق حلال پر قناعت نہ کر کے وہ کبوتر خانے کے نزدیک گئی اور کبوتر باز نے اس کو ایسا مارا کہ وہ وہیں مر گئی۔ جب بلی کا مالک وہاں سے گزرا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا اور سوچا کہ اس کے طمع و حرص نے اسے اس انجام تک پہنچایا۔

'بیوقوف بندر' کی کہانی میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔ بندروں نے باغیچے کی رکھوالی کرنے کا مشورہ خلوص سے دیا لیکن اپنی بے وقوفی سے پورے باغ میں تباہی مچادی۔ پھول مرجھا گئے اور پنکھڑیاں بکھر گئیں۔ جب مالی واپس آیا تو اپنا سر پیٹ لیا کہ برسوں کی محنت چند منٹ میں اکارت ہو گئی۔ حالانکہ اس میں قصور کسی کا نہ تھا۔ بندروں نے تو مالی کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی مگر اپنی بے وقوفی اور عادت کی وجہ سے تمام باغیچے کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس سے یہ سیکھ ملتی ہے کہ بے وقوفوں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

'ایک کچھوے اور بچھو' کی دوستی میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس کے خمیر میں کجی ہو اس سے کبھی دوستی نہیں کرنا چاہیے۔ کچھوا اپنی پیٹھ پر بچھو کو بٹھا کر دریا پار کرانے کی کوشش کرتا ہے لیکن بچھو اپنی ازلی فطرت سے مجبور ہو کر ڈنک مارتا رہا۔ بالآخر کچھوے نے غوطہ لگا کر اسے ڈبو دیا۔ علاوہ ازیں بندر اور مگرمچھ، چالاک خرگوش، کوے اور سانپ، بگلے اور کیکڑے اور کتنی ہی ایسی کہانیاں ہیں جن کے ذریعے انسان کو زندگی کے مختلف مد و جزر سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس طرح 'پنچ تنتر' کی کہانیوں نے انسان کو یہ درس دینے کی کوشش کی ہے کہ سیاسی مسائل ہوں یا معاشی الجھنیں، سماجی رشتوں کی گتھیاں ہوں یا نظام حکومت کی پیچیدگیاں، ان کے حل کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور ایک کامیاب زندگی کے لیے کیسی دانشمندی اور فہم و فراست کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیز اگر حکمت و دانائی سے کام لیا جائے تو بڑی سے بڑی مشکلیں بھی آسان ہو سکتی ہیں۔ اسی لیے قدرت نے انسان کو اشرف المخلوق بنایا ہے کہ وہ اپنی حکمت و تدبیر سے ہر پریشانی سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن ایسی خشک اور دقیق باتوں کو اگر براہ راست بیان کیا جاتا تو یہ باتیں نصیحتوں کا صرف ایک دفتر بن کر رہ جاتیں۔ سرزمین ہند کے داناؤں کا کمال ہے کہ معصوم جانوروں کی زبانی انھوں نے دقیق اور پیچیدہ مسائل کو بھی عام فہم اور دلچسپ بنا دیا۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ یورپ میں جو اخلاقی کہانیاں پہنچیں ان کا سرچشمہ ہندستان ہے۔ یہ کہانیاں ہاتھوں میں مشعل لیے آنے والے زمانے کو راہ دکھاتی رہیں گی اور ہندستان کے سر پر اولیت کا تاج سدا اپنی ضوفشانیاں کرتا رہے گا۔

مصادر و مآخذ

1. بحوالہ اردو شاعری کا مزاج، وزیر آغا، ص 143، رگ وید، ص 169، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، 2000
2. ایضاً، رگ وید، ص 83، 3. ایضاً، ص 70-69
4. اردو کا کلاسیکی ادب خرد افروز، حفیظ الدین احمد، مقدمہ: سید عابد علی عابد، ص 13، مجلس ترقی ادب، لاہور
5. ایضاً، ص 56-55
6. کلیلہ و دمنہ، مترجم: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی، اقبا گرافکس، حیدر آباد، 2014
7. رگ وید اور اپنشد کی روشنی، شکیل الرحمن، عصمت پبلی کیشنز، کشمیر 1976
8. پنچ تنتر کی کہانیاں، شیو کمار، مترجم: اطہر پرویز، این سی پی یو ایل، نئی دہلی، 1973
9. جنگل کی سیر، حسین حسنی، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی، 1990
10. ہندوستانی موسیقی، مفتی فخر الاسلام، ادارہ انیس اردو، الٰہ آباد
11. قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب، ڈی ڈی کوسمبی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 1998

Dr. Shazia Omair,
Department of Urdu,
University of Delhi,Delhi - 110007
Mob.: 9650618651, Email.: drshaziaomair@gmail.com

عبدالمغنی صدیقی

حیدرآباد میں اردو ناول

1900 تا 2014

اردو ناول نگاری کی ابتدا نذیر احمد کے ناول سے ہوتی ہے۔ کسی نئی صنف کی شروعات یا پھر اس میں ایک بڑی تبدیلی کا تعلق زمانہ ماضی کے ادب سے ضرور ہوتا ہے۔ داستان گوئی ایک ایسا فن تھا جو آگے چل کر عہد تغیر یعنی کہ صنعتی دور کے ابتدائی زمانے میں ناول کی تخلیق میں معاون ہوا۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ داستان کی کوکھ سے 'ناول' نے جنم لیا۔ ناول کی تعریف کرتے ہوئے علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

ناول نثری قصے کے ذریعے انسانی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے وہ بجائے ایک شاعرانہ و جذباتی نظریۂ حیات کے ایک فلسفیانہ، سائنٹفک یا کم سے کم ایک ذہنی تنقید حیات پیش کرتا ہے، قصے کی کوئی کتاب اس وقت تک ناول نہ کہلائے گی جب تک وہ نثر میں نہ ہو حقیقی زندگی کی ہو بہو تصویر یا اس کے مانند کوئی چیز نہ ہو، اور ایک خاص ذہنی رجحان (نقطۂ نظر) کے زیر اثر اس میں ایک طرح کی یک رنگی و ربط نہ موجود ہو۔''

(علی عباس حسینی اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، ایجوکیشنل بک ہاوس حیدرآباد، 1989، ص 40)

ناول میں انسانی زندگی اور اس سے جڑے واقعات و حالات کو بیان کیا جاتا ہے۔ غور و فکر کے بعد ہی ناول نگار انسانی زندگی کو ناول میں پیش کرتا ہے۔

نورالحسن نقوی ناول کے لغوی معنی پر رقمطراز ہیں:

''ناول اطالوی زبان کے لفظ 'ناویلا' سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں نیا۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ ناول ایک نئی چیز تھی۔''

(تاریخ ادب اُردو ایجوکیشنل پبلشر، دہلی 2001، ص 301)

مندرجہ بالا اقتباس سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں کہ ناول اُردو ادب میں انگریزی کے اثر سے داخل ہوا اور دوسرا' لفظ 'ناویلا' کے معنی 'نیا' کے آتے ہیں۔ اُردو ناول بہت حد تک اُردو ادب اور سماجی حالات کے بدلتے رُجحانات کا مرکز بنا رہا اور انھیں حالات نے ناول کو اُردو ادب اور ہندوستانی سماج دونوں میں اپنی بنیاد گہرائی اور گیرائی سے ڈالنے میں کامیاب مساعی کی۔ دنیا میں ناول کے وجود میں آنے کی وجوہات بتاتے ہوئے ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

''ناول اس وقت وجود میں آیا جب ادبیات میں ایک نمایاں پختگی اور گہرائی آچکی تھی اور سوسائٹی تہذیب کا ایک اچھا خاصا معیار حاصل کر چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کا مطالعہ ایک تفریحی چیز ہی نہیں، تہذیبی اور ذہنی مطالعہ بھی ہے'' (ناول کیا ہے؟ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، 1983، ص 5)

مندرجہ بالا اقتباس ناول کے وجود میں آنے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا تعلق سماجی، سیاسی، اور مذہبی حالات سے گہرا ہوتا ہے۔

ناول کی ترقی و ترویج میں حیدرآباد ہر دور میں پیش پیش رہا۔ انیسویں صدی کے آخری دہے میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد نے حیدرآباد میں ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ مہاراجہ، پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے بہت متاثر تھے اور انھیں کے رنگ کو انھوں نے اپنے ناولوں میں اپنایا ہے، ناول نگاری کی صنف میں جوہر آزمائے اور نثر کی چاشنی میں بے پناہ اضافہ کیا۔ مہاراجہ کے لیے ناولیں تخلیق کرنے کا ذریعہ اس وقت آسان ہوگیا جب 1895 میں ناول نگار رتن ناتھ سرشار حیدرآباد چلے آئے۔ 1897 میں سرشار نے دبدبہ آصفی کے نام سے رسالہ نکالا۔ اسی رسالے میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے مضامین اور ناول قسط وار شائع ہوتے رہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد کے تین ناول ملتے ہیں۔ (1) مطلع خورشید 1900 میں شائع ہوا۔ (2) چنچل نار 1903 جو سرشار کے ماہنامہ رسالہ 'دبدبہ آصفی' میں قسط وار شائع ہوا کرتا تھا۔ 1909 میں چنچل نار ناول کی شکل میں شائع کیا گیا۔ (3) تیسرا ناول بزم خیال جو 1912 میں شائع ہوا۔ انیسویں صدی کے آخری دہے یعنی 1895 میں عبدالحلیم شرر نے بھی حیدرآباد کا رخ کیا۔ 1884 میں مولانا عبدالحلیم شرر پہلی بار وقار الملک کی خواہش پر حیدرآباد آئے تھے۔ پھر کئی دفعہ مختلف وجوہات کی بنا پر حیدرآباد سے لکھنؤ کا دورہ کرتے رہے۔ اپنے زورِ قلم سے عبدالحلیم شرر نے کُل 42 ناولیں تحریر کیں جن میں معاشرتی، اصلاحی، تاریخی ناولیں شامل ہیں۔ 1908 تا 1910 کے درمیان عبدالحلیم شرر نے قیس و لبنیٰ، آغا صادق کی شادی، ماہ ملک جیسی تاریخی اور اصلاحی ناولیں حیدرآباد میں لکھیں۔ 1895 میں سرشار حیدرآباد چلے آئے۔ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کی شروعات میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد، عبدالحلیم شرر، عزیز احمد ناول نگاروں کی صف میں پیش پیش تھے۔

الغرض حیدرآباد میں ناول نگاری کی مستحکم بنیاد پڑ چکی تھی، جسے حیدرآبادی خاتون ناول نگاروں نے بھی مزید وسعت دی۔ صغرا ہمایوں مرزا، طیبہ بیگم بلگرامی حیدرآباد کی صف اول کی ناول نگاروں میں شمار ہوتی ہیں۔

طیبہ بیگم بلگرامی کے تین ناول ملتے ہیں۔ (1) انوری بیگم (2) حشمت النسا (3) احمدی بیگم۔ ناول احمدی بیگم غیر مطبوعہ ناول ہے۔ صغرا ہمایوں مرزا نے اصلاحی ناولیں لکھی ہیں۔ جن میں (1) مشیر نسواں (2) موہنی (3) سرگزشت ہاجرہ قابل ذکر ہیں۔ طیبہ بیگم اور صغرا ہمایوں مرزا نے جس عہد میں لکھنا شروع کیا اُس عہد میں خواتین کا پڑھنا لکھنا تو دور مسلم معاشرے کی روایت کے مطابق شریف زادیوں کا گھر سے باہر نکلنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ان ناولوں میں حیدرآباد کے معاشرتی حالات کی عکاسی کی

گئی ہے جو انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کی ابتدا پر محیط ہے۔

ممتاز نثر نگار قاضی عبدالغفار نے 1932 اور 1934 میں ناول 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' تخلیق کیا۔ 'لیلیٰ کے خطوط مجنوں کی ڈائری' قاضی عبدالغفار کا خطوطی تکنیک پر لکھا جانے والا پہلا شاہکار تانیثی ناول ہے۔ ناول 'لیلیٰ کے خطوط' میں عورت کی مظلومیت، مذہبی ریا کاری کو اور سماج کے دوہرے معیار کو موضوع بنایا گیا ہے۔

دراصل لیلیٰ کو طوائف کے دہلیز پر پہنچانے والا اُس کا شوہر تھا جسے وہ دل و جان سے چاہتی تھی۔ اپنے شوہر کی غداری اور بے وفائی نے اُسے لفظ شوہر اور ازدواجی رشتے سے بے بہرا کر دیا۔ قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کے خطوط کے ذریعہ مذہبی ٹھیکے داروں کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔

لیلیٰ کے تمام خطوط میں طنز جھلکتا ہے سماج اور مذہب کے خلاف جو اپنے فوائد کے لیے بنائے گئے ہیں۔ الغرض قاضی عبدالغفار نے اپنے تصورات و خیالات کو اُس عہد کی عکاسی میں اس ناول کے ذریعے پیش کیے ہیں۔

1930 کے بعد حیدر آباد میں شائع ہونے والے ناولوں کے فن میں ایک بڑی تبدیلی نظر آتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ مغربی و مشرقی تہذیب کا ٹکراؤ، انسان کی داخلی و خارجی زندگی میں بے چینی و بے قراری، قدامت پرستی سے بیزاری اہم ہے۔ عزیز احمد کے زورِ قلم سے پہلا ناول 'ہوس' 1932 میں شائع ہوا۔ حیدر آباد میں شائع ہونے والا یہ پہلا ناول تھا جس میں عزیز احمد نے کھل کر جنسی مسئلے پر لکھا۔ اس کے ایک سال بعد 1933 میں 'مرمر اور خون' شائع ہوا جس کے موضوع میں رومانی کہانی کے علاوہ نوجوان نسل کی ذہنی کیفیات اور نفسیات کو بے باک انداز میں پیش کیا گیا۔ زندگی کے بدلتے اقدار کو عزیز احمد نے اپنے شاہکار ناول 'گریز' میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول حیدر آباد کی تنگ گلیوں سے شروع ہو کر کشمیر کی سرسبز وادیوں پر ختم ہوتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار 'نعیم حسن' اپنی زندگی کے ہر اہم معاملات سے گریز کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک یتیم ہے جو ابتدا میں خاندانی رشتے داروں سے قربت بڑھانے میں ناکام ہوتا ہے۔ آئی اے ایس میں کامیابی کے بعد ٹریننگ کے لیے وہ یورپ جاتا ہے اور وہاں کی آزاد زندگی بلکہ ہر قسم کی آزادی کا بھرپور لطف اُٹھاتا ہے۔ نعیم ایک تنگ ذہن ہندوستانی معاشرے سے نکل کر مغربی تہذیب کے روحِ رواں ملک یورپ جاتا ہے جہاں پر شراب پینا، اور کسی غیر لڑکی کے ساتھ ربط رکھنا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ عزیز احمد نے اس ناول میں ہندوستان اور یورپ کی اس زندگی کو پیش کیا ہے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران عدم استحکام کا شکار تھی۔ اس ناول میں ہندوستان کے مسلم معاشرے کی فرسودہ ذہنیت، دوسری جنگ عظیم سے نبرد آزما یورپ اور ان سب کے درمیان تیزی سے بدلتی زندگی کے اقدار اور مشرقی تہذیب کی یلغار کو بے مثال کردار اور انوکھے موضوعات کے ذریعے پیش کیا ہے۔

1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا اثر اُردو کی تمام اصناف پر پڑا۔ ناول نگار نے بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر اپنے ناولوں میں موضوعات میں تبدیلی اور حقیقت نگاری کی طرف توجہ کی۔ حیدر آباد میں ترقی پسند تحریک کے دور کے لکھنے والوں میں ابراہیم جلیس، عزیز احمد، جیلانی بانو، رفیعہ منظور الامین آتے ہیں کچھ ناول نگار ترقی پسند تحریک سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت تک بھی لکھتے رہے جن میں رفیعہ منظور الامین، عفت موہانی شامل ہیں۔

فکشن نگار ابراہیم جلیس نے حیدر آباد میں پہلا ترقی پسند ناول چور بازار 1946 میں تخلیق کیا جس میں 1920 میں آئے قحط بنگال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول میں ہندوستان کے دم توڑتے اقتصادی حالات، دو وقت کی روٹی کو ترستے کسان، اور ایک آنے کے لیے اپنی عزت کا سودا کرنے والے کسان کا کردار ملتا ہے۔ یہ کردار ہندوستان کے حقیقی چہرے تھے جنھیں ابراہیم جلیس نے بے نقاب کیا۔ 4 دوستوں پر مشتمل اس ناول میں حیدر آباد کے معاشی اور سماجی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ماں ایک مہینے سے بیمار تھی۔ بغیر کسی دوا اور دارو کے کھانس کھانس کر خون تھوک رہی تھی۔ چار پائی کے نیچے اس کے جہیز کا اگلدان خون سے بھرا تھا کیا جہیز میں پیک دان اسی لیے دیے جاتے ہیں کہ عورتیں اپنے رخساروں کا سارا خون ان میں تھوک دیں؟

ماں کو دوا کیوں نہیں دی گئی؟
روپیہ نہیں تھا
فاطمہ کے رخسار پیلے کیوں ہیں؟
وہ عرصے سے کنواری بیٹھی ہے؟
یہ بچے اتنے سوکھے مریل کیوں ہیں؟
انھیں بھوک لگی ہے۔
گاندھی نے برت کیوں رکھا؟
ہندوستان مانگتا ہے۔
جناح کیوں چیختا ہے؟
پاکستان مانگتا ہے

سب ہاتھ پھیلائے کچھ نہ کچھ مانگ رہے ہیں۔ بھکاری اور میں جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہندوستان راجاؤں مہاراجوں کا ملک ہے۔ عالیشان محلوں کی سرزمین ہے۔ سونے اور چاندی کا معدن ہے۔ ہیروں اور موتیوں کی کان ہے۔ میں خواب دیکھ رہا ہوں میں جرم کر رہا ہوں۔ نہ بہادر شاہ ظفر بزدل تھے اور نہ میر جعفر غدار تھا۔ بلکہ سارا قصور انہی خوابوں کا ہے جو ایک دوسرے سے منسلک ہو کر پورے سو سال سے نیند کی زنجیر لمبی ہی لمبی، کھینچتے جا رہے ہیں''

(ابراہیم جلیس، چور بازار ص 2، اردو محل حیدر آباد دکن، حیدر آباد، 1946)

ابراہیم جلیس نے ایک ایسے ہندوستان کا نقشہ کھینچا ہے جو شمال سے لے کر جنوب تک، مشرق سے مغرب تک افلاس، بھوک مری، بے روزگاری کی چادر تلے لپٹا ہوا تھا اور پڑھا لکھا نوجوان بھی اس افلاس اور بھوک سے خود نکل سکتا تھا اور نہ ہی اپنے خاندان کو نجات دلا سکتا تھا۔ کیونکہ بے روزگاری اس نوجوان کا نصیب بن گئی تھی۔ موج مستی، پیٹ بھر کھانا صرف زمینداروں، امرا، سیٹھ ساہوکاروں کا مشغلہ تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر ہندوستان میں بے روزگاری' قحط اس حد تک پھیلی ہوئی تھی کہ بیشتر نوجوان' بوڑھے اپنی بھوک و پیاس کو مٹانے کے لیے دلال بن رہے تھے۔ ہر مصیبت زدہ لڑکی حالات سے دو رچار ان دلالوں کے ہاتھوں لٹ رہی تھی۔ دلالوں کو اس پیشے سے ہرگز پشیمانی نہیں تھی۔ ابراہیم جلیس نے 1942 کے سماجی حالات کو پیش کیا ہے:

''دلال'': ہمارا پیشہ بڑا تاریخی ہے۔ جانے کس کتاب میں پڑھا تھا کہ ہندوستان ایک بیسوا ہے جس کو دراوڑیوں نے آریاؤں کو، پٹھانوں نے مغلوں کو اور مغلوں نے انگریزوں کو بیچ دیا۔ یہ سب دلال۔ نوح نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا 'میاں' تم بڑے قابل ہو دلالی کے بجائے کوئی اچھا پیشہ کرو۔ اپنی مٹی کیوں خراب کر رہے ہو یہاں'' بوڑھا فوراً بولا ''اچھے سے اچھے پیشے میں بھی تو دلالی ہوتی ہے جی مگر عورتوں کی دلالی اچھی ہوتی ہے اس میں ہاتھ کالے نہیں ہوتے'' ظفر نے مذاق کیا ''منہ تو کالا ہو جاتا ہے'' بوڑھا بولا ''وہ تو دراوڑیوں سے لے کر مجھ کمترین تک سب ہندوستانیوں کا کالا ہے۔''

(ابراہیم جلیس، چور بازار ص 27، اردو محل حیدر آباد دکن، حیدر آباد، 1946)

ابراہیم جلیس نے ناول کے بیشتر حصوں میں طنزیہ انداز روا رکھا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں بڈھے کی سماج اور تہذیب سے بیزارگی ظاہر ہوتی ہے۔ دلال بڈھا ایسے سماج میں زندگی بسر کر رہا تھا جہاں اُسے ہر شخص مطلب پرست، شہوت پرست دکھائی دے رہا تھا۔ وہ قدیم اقوام و باشندوں کو بھی تنقید کا نشانہ بناتا ہے اس کے نزدیک تمام باشندے، اور نسلیں مطلب پرستی کی معمار ہیں۔ ابراہیم جلیس نے بڈھے دلال کے کردار کے ذریعے بیسویں صدی

کے اُن ضعیف کردار کو روشناس کروایا ہے جو ایک طرف ہندوستان میں پھیلی بھوک مری، بے روزگاری سے بیزار تھے تو دوسری جانب سیاسی گہما گہمی نے انھیں یکسر بدحال کر رکھا تھا۔

ترقی پسند تحریک کے اس دور میں عزیز احمد کے ناول 'ایسی بلندی ایسی پستی' اور 'آگ' 1948 سے قبل شائع ہو چکے تھے۔ جس میں انسان کی بدلتی معاشرتی زندگی سے بحث کی گئی ہے۔ ناول 'ایسی بلندی ایسی پستی' میں ریاست حیدرآباد کے امرا کی عیش پرستی، ان کے تحت بسنے والے مسلم خاندانوں کی بے حسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ عزیز احمد نے اس ناول میں مغربی تہذیب کی یلغار میں بہنے والے مسلم سماج کو مختلف واقعات میں پیش کیا ہے۔ ناول ''آگ'' میں انسانی زندگی کا ہر عمل واضح نظر آتا ہے۔ اس ناول میں کچھ ایسے مسائل بھی اُٹھائے گئے ہیں جو آج بھی ہمارے سماج کے لیے ناسور ہیں۔

خواتین کے ساتھ جرائم ہمارے سماج کا ایک اہم مسئلہ ہے جسے عزیز احمد نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے۔ 1948 میں شائع ہوئے اس ناول میں ہمیں لڑکیوں پر تیزاب پھینکنے کا واقعہ ملتا ہے جو آج بھی سماج میں جوں کا توں برقرار ہے۔ کچھ مسائل ایسے ہیں جو صدیوں گزر جانے کے باوجود بھی نہ صرف برقرار ہیں بلکہ ان میں اضافہ درج کیا جا رہا ہے۔ تیزاب پھینکنے کا واقعہ، جہیز کے مسائل، عصمت ریزی کچھ ایسے مسائل ہیں جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوا ہے۔

ترقی پسند تحریک کی وجہ سے حقیقت نگاری کا رجحان عام ہوا۔ زندگی کے مختلف مسائل کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی۔ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی اس تحریک کے اہم موضوعات رہے۔ سائنسی فکر نے انسان کی زندگی کو نئی سمت دی، مغربی یلغار نے ہندوستانی سماجی زندگی کو متاثر کیا۔ حقیقت سے آگاہی نے انسان کے تعلیمی رجحان میں تبدیلی پیدا کی۔ ناول اصلاحی، اخلاقی، تاریخی اور رومانی دائرے سے نکل کر حقیقت نگاری کی طرف بڑھتا رہا جس میں تہذیبی بحران کی عکاسی کی گئی، انسانی زندگی کے داخلی اور خارجی مسائل سے بحث کی گئی۔

ہندوستان کی تیزی سے بدلتی سیاسی و سماجی زندگی سے متاثر ہو کر جیلانی بانو نے 1958 میں ناول 'ایوان غزل' تحریر کیا۔ یہ ناول آصفیہ دور سے شروع ہو کر سقوطِ حیدرآباد کے حادثے سے گزرتا ہوا آزاد ہندوستان پر ختم ہوتا ہے۔ اس ناول میں جیلانی بانو نے ہندوستان کے چھوٹے قصبے سے لے کر بڑے شہروں تک پھیلے ہوئے جرائم کو پیش کیا ہے۔ گاؤں میں جہاں زمیندار، کسانوں اور مزدوروں پر ظلم کیا کرتے تھے وہیں آزاد ہندوستان میں یہ زمیندار، ساہوکار، سیاسی لیڈر کے روپ میں عوام کا خون چوس رہے تھے۔ اب ان کی دسترس میں صرف ایک گاؤں چند مٹھی بھر لوگ نہیں بلکہ بڑے بڑے شہر آ چکے تھے۔ جیلانی بانو کا یہ ناول ایک عہد کی عکاسی کرتا ہے جس میں بدلتے ہندوستان کو بہترین کردار اور واقعات کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔

1960 سے اُردو ادب میں جدیدیت کا دور شروع ہوتا ہے۔ جدیدیت کے اس دور میں فرد کی اجنبیت، تنہائی، انسان کی انسان کے تئیں بے رخی، مادیت پرستی اور جہیز کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔

بیسویں صدی کے دوسرے عہد میں اُردو فکشن کے اُفق پر کئی ستارے دمک رہے تھے جن میں رفیعہ منظور الامین، اکرام جاوید، واجدہ تبسم، عفت موہانی، آمنہ ابوالحسن، جیلانی بانو جیسے نام شامل ہیں۔ 1960 میں رفیعہ منظور الامین کا ناول 'سارے جہاں کا درد' شائع ہوا جس میں مرکزی کردار 'دلبر' کی نفسیات اور تنہائی کو پیش کیا جو اپنے ہونے والے منگیتر کی موت کے بعد اکیلے زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ دلبر کا کردار ایک بہادر، وفادار اور وفا شعار لڑکی کا ہے جو حالات سے سمجھوتا نہیں کرتی بلکہ پوری ہمت اور استقامت سے زندگی کے مسائل کا سامنا کرتی ہے۔ دلبر کے والدین نہیں تھے مگر اس نے کبھی بھی مجبوریوں کو اپنی زندگی اور اپنی ترقی پر قابض نہیں ہونے دیا۔ دلبر کے کردار کے ذریعے رفیعہ منظور الامین نے خواتین کو ایک پیغام دینے کی کوشش کی ہے، جو معمولی مسائل پر یا تو گھبراہٹ کا شکار ہوتی ہیں یا پھر قسمت کا حوالہ دے کر خاموشی اختیار کر جاتی ہیں۔ 'سارے جہاں کا درد' حیدرآباد میں شائع ہونے والا جدیدیت کے دور کا پہلا ناول ہے جس میں ایک ایسی لڑکی کو مرکزی کردار عطا کیا گیا ہے جو ہمیشہ ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کا ثبوت دیتی ہے۔

فرسودہ سماج کی بوسیدہ ذہنیت کے خلاف اکرام جاوید نے بھی آواز اٹھائی ان کا ناول 'رات کا رومان' 1961 میں شائع ہوا جس میں جہیز، طوائف، روزگار جیسے سماجی مسائل کو اُجاگر کیا گیا۔ اکرام جاوید نے دلچسپ واقعات اور انوکھے کرداروں کے ذریعے اس بات کو واضح کیا کہ انسان خود اپنی زندگی کی تباہی کا ذمے دار ہے۔ ان کا ناول حقیقی زندگی پر آج بھی کھرا اُترتا ہے۔ اکرام جاوید نے سماج کے جن سلگتے ہوئے مسائل کو پیش کیا ہے وہ آج بھی جوں کے توں موجود ہیں۔ اکرام جاوید نے 1960 کی اُس دہائی کو پیش کیا ہے جہاں پر انسان روزگار کے لیے مسلسل کوشاں تھا، دو وقت کی روٹی کے لیے محنت مشقت کرتا مگر اس کے خیالات کسی امرا و جاگیردار سے کم نہیں تھے۔ خواب دیکھنا کوئی جرم نہیں مگر ان خوابوں کی تعبیر کے لیے کسی دوسرے انسان کی مجبوری کا فائدہ اُٹھانا ضرور جرم ہے۔ مسیح انہی خوابوں کی تعبیر کو مکمل کرنے کے لیے اپنے ہی گھر کو تباہ کرتا ہے۔ ناول کا موضوع انسانی زندگی کی حقیقت کو پیش کرتا ہے۔ اکرام جاوید 'سورج' ساگر اور مسیح جیسے کرداروں کے ذریعے سماجی تبدیلیوں کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان کی اجتماعی زندگی کو ناول نگاروں نے محسوس کیا، ان کی تڑپ اور بے چینی کو پرکھا اور نئے رجحانات اور تیزی سے بدلتی زندگی کو ادب میں پیش کیا جانے لگا۔ اس عہد میں تلخ حقائق اور حقیقی موضوع کو ناول کا محور بنایا گیا، جس میں سیاست، تعلیم وتہذیب غرض زندگی کے ہر شعبے کو پیش کیا جانے لگا۔ انسان کی خارجی اور داخلی زندگی کو اس عہد میں نمایاں اہمیت دی گئی۔ اب ناول ایک اصلاحی تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک سے گزرتا ہوا جدیدیت کے ایک وسیع میدان میں پہنچ چکا تھا جہاں پر نت نئے موضوعات، انوکھی تکنیک، حقیقی کردار نے قاری کو ادب کی ایک نئی دنیا سے واقف کروایا۔

جدیدیت کے اس عہد میں رفیعہ منظور الامین، اکرام جاوید، جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، غلام جیلانی کے ناولوں میں برطانوی اقتدار کے خلاف بڑھتی ہوئی صف آرائی، جزوی صنعت کاری سے شہری زندگی کی طرف بڑھتی ہوئی رغبت، محنت کش طبقے کی بیداری، مشرقی ومغربی تہذیب کی آویزش سے بدلتے ہوئے ہندوستانی معاشرے کے خدوخال کو پیش کیا گیا ہے۔

1980 سے اُردو ادب میں مابعد جدیدیت کا دور شروع ہوتا ہے۔ نظریات میں تبدیلی، نئے ذہنی رویے نے اُردو ادب میں ایک بار پھر تبدیلی پیدا کی جسے مابعد جدیدیت کا دور کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں آمنہ ابوالحسن، واجدہ تبسم، رفیعہ منظور الامین، عفت موہانی، غلام جیلانی کے علاوہ پرویز یداللہ مہدی، قمر جمالی آتے ہیں۔

مابعد جدیدیت کے اس دور میں آمنہ ابوالحسن کے تین ناول واپسی 1981، آواز 1985، پلس مائنس، اور 1995 میں یادش بخیر شائع ہوئے۔ ناول واپسی 1981 ایک رومانی ناول ہے، جس میں Extra marital affair کو پیش کیا گیا ہے۔ آمنہ ابوالحسن حیدر آباد کی وہ پہلی خاتون ناول نگار ہیں جنھوں نے لڑکیوں کی نفسیاتی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ 'واپسی' میں ایک ایسی لڑکی کا کردار ملتا ہے جو نہ صرف اپنے شوہر سے ہر بات شیئر کرتی ہے بلکہ اپنے سابقہ بوائے فرینڈ کو اپنے ہی گھر رکھنے کی ضد کرتی ہے۔ یاسمین اور شہر یار ازدواجی رشتے میں منسلک ہونے کے باوجود ان میں دوستی اور بھروسے کا رشتہ اتنا مضبوط اور پختہ ہے کہ یہاں شک اور غلط فہمی کی دیوار کھڑی نہیں ہوسکی۔ یہ کہانی مابعد جدیدیت کے بدلتے معاشرے اور نئی نسل کی ذہنی کیفیت کو پیش کرتی ہے۔ آمنہ ابوالحسن نے ایک اچھوتی کہانی بدلتے نظریات میں پیش کی ہے۔

آمنہ ابوالحسن نے جہاں ناول واپسی میں یاسمین کی نفسیاتی کشمکش کو پیش کیا وہیں واجدہ تبسم نے ناول 'نتھ کا زخم' (1982) کی کہانی ایک مشہور حیدرآبادی نواب کی بیٹی رفیقہ بانو کی قربانیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھی ہے۔

'نتھ کا زخم' میں ایک ایسی لڑکی کے کردار کو پیش کیا گیا جو اپنے ملک ہندوستان اور اپنے عزیز شہر حیدرآباد سے دور امریکہ جاتی ہے اور اپنے شوہر کو راہِ راست پر لانے کی بھرپور کوشش کرتی ہے، ایک ایسی لڑکی جو حیدرآباد کے تہذیبی ماحول میں پرورش پاتی ہے یہاں کے طور طریقوں اور رسم و رواج میں پلی بڑھی امریکہ جاکر نہ صرف اپنی عصمت کو بچائے رکھتی ہے بلکہ اپنے شوہر کو عیاشی کی لعنت سے بچانے کی کوشش کرتی ہے، حالات سے تباہ حال رفیقہ بانو اپنے شوہر کا قتل تک کر بیٹھتی ہے اور 14 سال کی سزا کاٹتی ہے۔ واجدہ تبسم نے ان پورے حالات کو عمدہ منظر نگاری، بے مثال کردار نگاری کے ذریعے پیش کیا ہے ناولوں کے مختلف حصوں میں حیدرآبادی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے۔

1987 میں واجدہ تبسم کا ناول 'کیسے کاٹوں رین اندھیری' شائع ہوا جس میں حیدرآبادی ماحول، طوائف کی وجہ سے ہونے والی معاشرتی تباہی کو واضح کیا ہے۔ 1987 میں رفیعہ منظور الامین کا ناول 'عالم پناہ' منظر عام پر آیا جس میں ایمن کا مرکزی کردار پیش کیا گیا ہے۔ ایمن بنگلور سے حیدرآباد نوکری کی غرض سے آتی ہے اور بیگم زمرد محل کے یہاں سکریٹری کی ملازمت اختیار کرتی ہے۔ اُسی طرز پر رفیعہ منظور الامین نے 1995 میں ناول 'یہ راستے' شائع کیا جس میں مرکزی کردار 'کاکل' اپنی زبردستی شادی کی مخالفت کرتی ہے اور حیدرآباد سے اوٹی بغرض روزگار منتقل ہوجاتی ہے۔ رفیعہ منظور الامین نے اپنے دونوں ناولوں میں نوجوان لڑکیوں کے کردار کو پیش کرتے ہوئے ان کی ہمت افزائی کی ہے۔

1999 میں ہی عفت موہانی کا ایک ناول 'مریم' شائع ہوا۔ ناول میں عصر حاضر میں نوجوانوں کی بے راہ روی کو پیش کیا گیا ہے۔ مریم کا کردار مرکزی کردار ہے جو ایک آوارہ لڑکے کے دام محبت میں گرفتار ہوکر گھر سے راہ فرار اختیار کرتی ہے۔ عفت موہانی نے نوجوان لڑکیوں کے اس غیر ذمے دارانہ اقدام سے ان کے افراد خاندان پر آنے والی مصیبتوں کا احاطہ کیا ہے۔

اکیسویں صدی کی ابتدا میں پرویز یداللہ مہدی اور قمر جمالی کے ناول منظر عام پر آئے ہیں۔ پرویز یداللہ مہدی کا ناول 'سگ لیلی' ایک مزاحیہ ناول ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ ناول کا کردار اپنی محبوبہ سے ملاقات کا خواہش مند ہوتا ہے مگر اُسے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے محبوب کے گھر میں کتا موجود ہے۔ ناول کا مرکزی کردار یعنی ناول کا ہیرو کتے سے ڈرتا ہے اسی لیے کتوں کی معلومات حاصل کرنے کے لیے وہ کتے کے ڈاکٹر ڈی ڈی کتا والا، پسٹن جی پالان جی دارووالا جیسے کرداروں سے ملتا ہے۔ تمام کردار مزاحیہ ہیں، اور انہی کرداروں کے ذریعے پرویز یداللہ مہدی نے سماج اور ہندوستانی نظم ونسق پر طنز کیے ہیں۔

قمر جمالی نے اپنے ناول 'آتش دان' (2014) میں اکیسویں صدی کے ہندوستانی دیہاتی نظام کو پیش کیا ہے۔ قمر جمالی نے اپنے ناول کے ذریعے ہندوستانی دیہاتی نظام کے اس تلخ چہرے کو پیش کیا ہے جس پر سیاسی حضرات کی ہوس اور ان کے پنجوں کے نشان موجود ہیں۔ قمر جمالی نے اپنے ناول کے ذریعے اس بات کو واضح کیا ہے کہ دیہاتی نظام میں کس طرح لینڈ مافیا اور پانی کے مافیا اپنی اجارہ داری قائم کیے ہوئے ہیں۔ جدید ہندوستان میں جاگیردار، سرمایہ دار کی جگہ سیاسی لیڈروں نے لے لی ہے جو غبن کرتے ہیں، عصمت ریزی میں پیش پیش رہتے ہیں، فرقہ وارانہ فسادات میں ملزم بھی بنتے ہیں۔ قمر جمالی نے اپنے ناول میں ووٹ کی طاقت، اہمیت اور افادیت کی جھلک دکھائی ہے۔ قمر جمالی ناول کے کرداروں اور واقعات کے ذریعے رائے دہندگان کو جھنجھوڑتی ہیں، انھیں ووٹ کی طاقت کا احساس دلاتی ہیں۔ خود کو اور ملک کو محفوظ رکھنے کی تلقین کرتی ہیں۔

مابعد جدیدیت کے اس دور میں ایک عام فہم انسان کے مسائل کو جگہ دی گئی۔ ناول نگاروں نے غریب، مزدور، کسان کے علاوہ ایک عام فہم انسان کے ہر ایک مسئلے کو اُجاگر کیا ہے۔ ان ناولوں میں انسانی زندگی کو اتنی ہی اہمیت دی گئی ہے جتنی کہ سابق میں بادشاہ، امراء، سلاطین اور امیر ترین افراد کو دی جاتی تھی۔ اس عہد میں پردے کے پیچھے اور انسان کے جذبات واحساسات ہر چھوٹے بڑے مسئلے کو اہمیت دیتے ہوئے سماجی، معاشی، سیاسی اور طبقاتی تصادم کو بطور خاص موضوع بنایا۔ اس دور میں سماجی انتشار، اخلاقی گراوٹ، تہذیبی استحصال اور طبقاتی کشمکش سے پیدا ہونے والے مسائل کو مختلف کرداروں اور انوکھے واقعات کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔

غرض حیدرآباد میں شائع ہونے والے ناولوں میں ایک عہد کی عکاسی ملتی ہے۔ ناول نگاروں نے ہر عہد میں ہورہی ناانصافی کے خلاف احتجاج درج کیا اور ان مسائل کے حل کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے۔

■

Dr. Abdul Mogni Siddiqui
Head, Dept of Urdu
Anwarul Uloom, Degree College
Mallepally- 500001
Hyderabad (Telangana)
Email : indianpearls.mogni@gmail.com

صابر علی سیوانی

فلسفۂ موت کی شعری تشریحات

زندگی اور موت کے فلسفے کو شعرائے اردو نے نہایت موثر اور بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ یوں تو اس موضوع پر شعرا کے کلیات و دواوین میں ہزاروں اشعار ملتے ہیں لیکن یہاں 'مشتے نمونہ از خروارے' کے مصداق موت کے موضوع پر موزوں کیے گئے چند اشعار پیش کرتے ہوئے موت کی حقیقت کے حوالے سے گفتگو مقصود ہے۔ موت کیا ہے؟ زندگی کسے کہتے ہیں؟ موت کے بعد انسان کی دنیا میں کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ موت کے بعد دنیا کن افراد کو یاد کرتی ہے اور کون کون سے لوگ ماتم کرتے ہوئے مرنے والے کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ درج ذیل اشعار موت کی متعدد انداز سے تفسیر بیان کرتے ہیں اور فلسفۂ موت کی مختلف تعبیریں پیش کرتے ہیں۔ زندگی اور موت کی بڑی عمدہ تشریح ہمیں برج نرائن چکبست کے ایک مشہور زمانہ شعر میں ملتی ہے، جس میں وہ زندگی کو عناصر میں ظہور ترتیب قرار دیتے ہیں اور موت کو انہی اجزا کے انتشار سے تعبیر کرتے ہیں۔ چکبست کا درج ذیل شعر ضرب المثل کے طور پر عوام وخواص کے حافظے میں محفوظ ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

موت کے وقت انسان کو کس بات کا احساس ہوتا ہے، اس کی وضاحت درج ذیل شعر میں ہوئی ہے۔

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

(خواجہ میر درد)

زندگی نہایت قیمتی اور انمول تحفہ ہے۔ اس سے بڑی دولت کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن ایک نہ ایک دن انسان کو اس دولت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ جب انسان کے سامنے موت کھڑی ہو، اس وقت اس کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی، اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس شخص پر اس دم کیسی ہیبت، بے بسی، مجبوری اور بے کسی کی حالت ہوتی ہوگی، اس کا بھی اندازہ لگایا نہیں جاسکتا۔ لیکن اس حالت میں کسی انسان کا یہ کہنا کہ میرے سامنے آئینہ لاؤ، میں اپنی زندگی کی آخری تصویر دیکھنا چاہتا ہوں، بڑی ہمت اور جرأت مندی کی بات ہے۔ ایسی ہی کیفیت کا اظہار یہاں ایک شعر میں ہوا ہے۔

موت کا ماتھے پہ آیا پسینہ آئینہ لاؤ ہم اپنی زندگی کی آخری تصویر دیکھیں گے

(حیات امروہوی)

موت کو موضوع بنا کر اردو شعرا نے زندگی کی حقیقت نہایت معنی خیز انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ موت کی حقیقت اور زندگی کا اصلیت کی ترجمانی کرنے والے متعدد شعرا نے اس ضمن میں بہت سی چشم کشا سچائیوں سے ہمیں روبرو کرایا ہے۔ کبھی کوئی شاعر یہ کہتا ہے کہ ہم نے سو برس کا سامان جمع کرلیا ہے، لیکن ایک پل کی زندگی کا بھی اختیار ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ کسی کو بھی اپنی موت کا علم نہیں ہے۔ موت کے حوالے سے یہ مشہور زمانہ شعر بھلا کس شخص کے حافظے میں محفوظ نہ ہوگا کہ

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

(حیرت الہ آبادی)

مرزا شوق لکھنوی نے بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جسے ہم نے زندگی سمجھ رکھا ہے، دراصل اس زندگی کو ثبات نہیں ہے۔ ثبات صرف تغیر کو ہے۔ زندگی کی میعاد ختم ہوتے ہی موت کی منزل آجاتی ہے اور یہ وہ منزل ہے جہاں سب کو پہنچنا ہے۔ یکے بعد دیگرے تمام ذی حیات کو اپنی حیات سے ہاتھ دھونا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ آج کوئی اور جائے گا اور کل ہماری باری آجائے گی۔ یہی زندگی نے سب سے کڑوا سچ ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ، کل ہماری باری ہے

(مرزا شوق لکھنوی)

اردو شاعری کی تاریخ میں متعدد شعرا نے انسان کی بے مقصد زندگی سے موت کو بہتر قرار دیا ہے یعنی جس شخص نے زندگی کے مقصد کو ہی نہیں سمجھا، اور وجہ آفرینش سے ہی وہ بے خبر رہا تو ایسے شخص کی زندگی اشرف المخلوقات کی زندگی نہیں ہوسکتی بلکہ محض ایک مخلوق خدا کی زندگی قرار دی جاسکتی ہے۔ جس زندگی کی بات یہاں شعرا نے کی ہے وہ زندگی کچھ کر گزرنے اور کچھ ایسے نقش چھوڑ جانے سے عبارت ہے جسے لوگ مشعل راہ بنا سکیں۔ ورنہ یہاں تو ہر شخص مرنے کے لیے ہی آتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے اس موضوع کے حوالے سے یہ چند اشعار

اس زندگی سے موت بھلی ہے ہزار بار جیتے ہیں اور جینے کا کچھ مدعا نہیں

(اثر لکھنوی)

اس زندگی پہ موت کو ترجیح دیجیے جس زندگی میں عزم نہ ہو، حوصلہ نہ ہو

(ابوالمجاہد زاہد)

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
(علامہ اقبال)

جس نے بھلا دیے ہیں تقاضے حیات کے　　وہ شخص اپنی موت سے پہلے ہی مرگیا
(عابد علی شعلہ لکھنوی)

اہلِ ذوق کے مرنے کی بات کرتے ہوئے ایک شاعر نے کیا خوب لکھا ہے۔

اٹھ گئے دنیا سے فانی اہلِ ذوق　　ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے
(فانی بدایونی)

محمود خاں رامپوری نے بہت صاف لفظوں میں یہ نکتہ بیان کردیا ہے کہ اس دنیا میں تمام لوگ مرنے کے لیے آتے ہیں، لیکن دنیا انہی لوگوں کو ان کی موت کے بعد یاد رکھتی ہے، جو دنیا کو کچھ دے کر جاتے ہیں اور جو عوام وخواص کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے۔ لوگ اس شخص کی موت پر ماتم کرتے ہیں، جو لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکا ہوتا ہے۔ جس کی مقبولیت عوام وخواص میں ہوتی ہے اور وہ نیک نامی چھوڑ جاتا ہے۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس　　یوں تو دنیا میں بھی آئے ہیں مرنے کے لیے
(محمود خاں رامپوری)

یاسیت کے امام فانی بدایونی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا۔ یعنی اس زندگی کے جو ایام ہیں، ان ایام کا ایک ایک لمحہ عمر گذشتہ کی میت کے مانند ہے، جہاں انسان صرف آزمائشوں، امتحانات اور مشکلات سے دوچار رہتا ہے اور جو شخص اس طرح کی غم انگیز زندگی کو گزارنے پر مجبور ہو، اس کے دل سے تو بس یہی صدا نکلے گی جو یہاں ایک شاعر کی زبان سے نکلی ہے۔

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانی　　زندگی نام ہے، مر مر کے جیے جانے کا
(فانی بدایونی)

موت کے مترادفات کے طور پر قضا، مرگ، وفات، اجل، جیسے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی کی موت پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے لغوی معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا/ جانا کے ہوتے ہیں۔ انسان مرنے کے بعد اس دنیا سے دوسری دنیا جو آخرت کی دنیا ہے، میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کسی کے مرنے کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا انتقال ہوگیا۔ بعض مقامات پر کسی کی موت کی خبر سن کر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں بزرگ پردہ فرما گئے۔ یعنی آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اللہ کو پیارا ہوگیا۔ یعنی اللہ کو وہ شخص پسند تھا، اس لیے اس نے اسے اپنے پاس بلالیا۔ کبھی کبھی کسی کی موت کی خبر اس انداز سے بھی دی جاتی ہے کہ فلاں انسان معبودِ حقیقی سے جاملا یا کبھی اس خبر کو دوسروں تک یہ کہہ کر پہنچائی جاتی ہے کہ فلاں بزرگ اب اس دنیا میں نہیں رہے یا یہ کہا جاتا ہے کہ ملک کی ایک بڑی شخصیت کا وصال ہوگیا۔ غرض مختلف انداز سے کسی بھی انسان کے مرنے کی اطلاع دی جاتی ہے اور اس کی مغفرت کی دعا کی جاتی ہے۔ اس کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں اور اس کی خامیوں پر پردہ پوشی کی جاتی ہے کیونکہ حکم یہی ہے کہ مرنے والے کی برائی نہیں کرنی چاہیے۔ شعرا نے مرنے والے کی خوبیوں کو ہی بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بڑی شخصیت یا کسی فن کار کی موت پر جب تعزیتی پیغامات یا تاثرات قلم بند کیے جاتے ہیں تو درج ذیل اشعار کے کسی ایک مصرع کو عنوان بنایا جاتا ہے اور اس کے ذیل میں مرنے والے شخص کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔

خبر سن کر مرے مرنے کی وہ بولے رقیبوں سے　　خدا بخشے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں
(داغ دہلوی)

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ　　افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی
(میر تقی میر)

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے　　حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا
(مرزا غالب)

اٹھ گئی ہیں سامنے سے، کیسی کیسی صورتیں　　روئیے کس کے لیے، کس کس کا ماتم کیجیے
(خواجہ حیدر علی آتش)

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میر　　کیا دیوانے نے موت پائی ہے؟
(میر تقی میر)

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے　　ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
(مرزا غالب)

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر　　اب انھیں ڈھونڈ، چراغِ رخِ زیبا لے کر
(علامہ اقبال)

جان کر منجملہ خاصانِ مے خانہ مجھے　　مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے
(جگر مرادآبادی)

کہانی ہے تو اتنی ہے فریبِ خوابِ ہستی کی　　کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ بن جائے
(سیماب اکبرآبادی)

وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی　　اسی پہ ضرب لگی، جو شجر پرانا
(افتخار عارف)

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی　　تم جیسے گئے ایسے تو جاتا نہیں کوئی
(کیفی اعظمی)

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا　　آنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اٹھا
(پروین شاکر)

جنھیں اب گردشِ افلاک پیدا کر نہیں سکتی　　کچھ ہستیاں بھی دفن ہیں گورِ غریباں میں
(مخمور دہلوی)

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی　　اک شخص سارے شہر کو، ویران کرگیا
(خالد شریف)

تنہائیوں کی رُت میں بھی رہتا تھا مطمئن!　　وہ شخص اپنی ذات میں اک انجمن سا تھا
(نامعلوم)

کتنے اچھے لوگ تھے کیا رونقیں تھیں ان کے ساتھ　　جن کی رخصت نے ہمارا شہر سونا کردیا
(فاطمہ حسن)

اب دن کہاں رہے وہ ہمارے ثبات کے　　اِک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے
(افتخار احمد فخر)

شعرائے اردو نے فلسفۂ موت کی وضاحت اپنے منفرد انداز میں کی ہے۔ ان کے ہر شعر میں ہمارے لیے درسِ عبرت موجود ہے۔ اگر ان اشعار پر غور کریں تو ہمیں یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ان فن کاروں نے موت کی کس کس طریقے سے تفسیر پیش کی ہے۔ ہر شاعر موت کے فلسفے کی گتھی سلجھانے کی کوشش اپنے منفرد انداز میں کرتا ہے۔ کوئی موت سے زندگی کے نازک رشتوں کو تشبیہ دیتا ہے۔ کوئی مفلسی میں موت نہ آنے کی دعا کرتا ہے۔ کوئی موت کے بعد قبر پر دو مٹھی خاک ڈالنے والے دوستوں کو ہدفِ تنقید بناتا ہے اور کوئی سانس رک جانے کے بعد جسم کے خیمے تھامنے والوں کو نشانہ بناتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے یہ اشعار۔

اس مرحلے کو موت بھی کہتے ہیں دوستو! ‏ ‏ اک پل میں چھوٹ جائیں جہاں عمر بھر کے ساتھ
(شکیب جلالی)

نہ آئے موت خدا یا تباہ حالی ‏ ‏ یہ نام ہوگا غمِ روزگار سہ نہ سکا
(معین احسن جذبی)

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن ‏ ‏ زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے
(ثاقب لکھنوی)

اک سانس کی طناب جو ٹوٹی تو اے شکیب! ‏ ‏ دوڑے ہیں لوگ جسم کے خیمے کو تھامنے
(شکیب جلالی)

یہاں پہلے شعر میں شکیب جلالی نے تعلق خاطر کی بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس لمحہ عمر بھر کی دوستی اچانک دشمنی میں بدل جاتی ہے یا جب عمر کے طویل حصے پر مشتمل رفاقت یک لخت ختم ہو جاتی ہے تو انسان پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی جو نزع کے وقت کسی انسان پر طاری ہوتی ہے۔ شکیب نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ موت صرف دنیا سے چلے جانے والے شخص کی ہی واقع نہیں ہوتی ہے بلکہ جب اچانک کسی کا عمر بھر کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے تو اس حادثے کو بھی موت ہی قرار دیں گے۔ دوسرے شعر میں جذبی نے اس مفلوک الحال شخص کی موت کا ذکر کیا ہے جو طبعی موت سے ضرور مرتا ہے لیکن لوگ اسے فاقہ کشی کے نتیجے میں ہونے والی موت قرار دیتے ہیں یا یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ شخص تباہ حالی کے باعث چل بسا اور غم روزگار سہہ نہ سکا۔ یہاں شاعر اللہ سے دعا مانگ رہا ہے کہ اے اللہ! تو میری موت ایسے وقت میں مت دے، جب میں مفلوک الحال ہوں۔ تیسرے شعر میں ثاقب لکھنوی نے دوستوں کی ستم شعاری پر طنز کرتے ہوئے کہا ہے کہ زندگی بھر یہ سارے دوست میرے برے وقت پر کام نہیں آئے لیکن میری موت کے بعد دو مٹھی خاک ڈالنے کے لیے میری قبر پر چلے آئے ہیں۔ کچھ اس طرح کا مفہوم چوتھے شعر میں پوشیدہ ہے۔ شکیب جلالی کہتے ہیں کہ سانس کی طناب ٹوٹنے کے بعد لوگوں کو جسم کے ڈھانچے کو سنبھالنے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ یہ اشعار صرف موت کی حقیقت ہی نہیں بلکہ انسانی رشتوں کی شکست و ریخت اور اس کی نزاکتوں کو بھی بخوبی آشکار کرتے ہیں۔ دنیا کی خود غرضی کی ترجمانی بھی ہمیں ان اشعار میں محسوس ہوتی ہے۔

موت کب، کہاں اور کس حال میں آجائے اس کا علم کسی کو نہیں ہے۔ اس کا علم اسی ذات کو ہے جس نے زندگی دی ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں ایسے بہت سے شعرا کا ذکر ملتا ہے جنھیں شہرت تو حاصل نہ ہو سکی لیکن ان کے چند یا ایک دو ہی اشعار انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ موت کو موضوع بنا کر بہت سے شعرا نے ایسے اشعار موزوں کیے ہیں جو بہت مشہور ہوئے لیکن تخلیق کار کو شہرت نہ مل سکی۔ ایسے ہی ایک شاعر کا نام مولوی عبدالرضا رضا ہے، جن سے اردو دنیا بڑی حد تک ناواقف ہے لیکن ان کا یہ ضرب المثل شعر ہر کس و ناکس کی زبان پر رہتا ہے اور اسے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ نہایت مشہور اور سہل ممتنع کا حامل یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔ یہاں موت کو جس شے سے تشبیہ دی گئی ہے، اس خوبصورت تشبیہ پر شاعر کو داد دیجیے۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا ‏ ‏ آدمی بلبلہ ہے پانی کا
(عبدالرضا رضا)

خواجہ میر درد، میر تقی میر، برج نرائن چکبست، شاد عظیم آبادی، ذوق دہلوی، خواجہ الطاف حسین حالی، نظیر اکبر آبادی اور حفیظ جالندھری کے وہ اشعار ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے موت کی ناقابل انکار حقیقت کو پیش نظر رکھ کے موزوں کیے ہیں۔ یہ اشعار مختلف زاویوں سے ہمیں موت کے فلسفے کو سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ جس خواب و خیال میں ہم جی رہے ہیں وہ خواب و خیال وقتِ مرگ بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فرشتۂ موت ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں دیتا اور نظیر اکبر آبادی کے مطابق ''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔'' والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ساری دولت، ٹھاٹھ باٹ، شان و شوکت، اور جاہ و جلال دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے اور انسان موت کے آغوش میں سما جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے موت کے حوالے سے مذکورہ شعرا کی تخلیقات

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا ‏ ‏ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا
(خواجہ میر درد)

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے ‏ ‏ یعنی آگے چلیں گے، دم لے کر
(میر تقی میر)

موت کہتی ہے کہ لبریز ہے پیمانۂ عمر ‏ ‏ دوست کہتے ہیں کہ امید ابھی باقی ہے
(برج نرائن چکبست)

لے دے کے صرف ایک سہارا تھا موت کا ‏ ‏ وہ بھی شبِ فراق سے کمبخت ڈر گئی
(شاد عظیم آبادی)

لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے ‏ ‏ اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے
(ذوق دہلوی)

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ ‏ ‏ زندگی موت ہے، حیات نہیں
(خواجہ الطاف حسین حالی)

دکھ پا کے مرگیا، کوئی سکھ پا کے مرگیا ‏ ‏ جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مرگیا
(نظیر اکبر آبادی)

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ‏ ‏ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
(مرزا غالب)

ہزاروں اشعار موت کے حوالے سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ زندگی اور موت، یہ دو

موضوع تمام شعرا کے پسندیدہ موضوعات میں سے ہیں۔ اس لیے ہر شاعر کے یہاں ان دونوں موضوعات پر اشعار ملتے ہیں۔ ان ہزاروں اشعار میں کچھ شعر جو بہت مشہور ہیں، ان کے حوالے سے یہاں گفتگو مقصود ہے۔ موت ایک نہایت وسیع موضوع ہے، جس پر مختلف زاویے سے سیکڑوں شعرا نے ہزاروں اشعار موزوں کیے ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے ہر روز کسی نہ کسی بات پر موت کا ذکر کرتے ہیں، لوگوں کی موت کا ماتم کرتے ہیں۔ اہم اور نامور شخصیات کی وفات پر نوحہ خواں ہوتے ہیں۔ اپنے رشتے داروں، عزیزوں اور دوستوں کی نعشوں کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارتے ہیں اور جوں ہی قبرستان سے واپس آتے ہیں، موت کو بھول کر دنیاداری میں لگ جاتے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ قبر کے جس چوکھٹے میں جس عزیز کو اتار کر آئے ہیں، وہاں ہمارے لیے چوکھٹے خالی پڑے ہیں، جن میں ہمیں ایک نہ ایک دن اتارا جائے گا۔ کاش ہم زندگی کی جتنی فکر کرتے ہیں، موت کی بھی اتنی ہی تیاری کرتے تو زندگی آسان ہو جاتی۔ شاعر کے لفظوں میں۔

چوکھٹے قبر کے خالی ہیں انھیں مت بھولو ‏ ‏ جانے کب، کون سی تصویر لگا دی جائے

(حفیظ جالندھری)

کسی دانا کا قول کہ 'محبت اور موت دونوں بن بلائے مہمان ہوتے ہیں۔ کب آجائیں کوئی نہیں جانتا۔ لیکن دونوں کو کچھ چاہیے۔ ایک کو دل چاہیے اور دوسرے کو دھڑکن'' موت آتے ہی سانس کی ڈور ٹوٹ جاتی ہے۔ دھڑکن رک جاتی ہے اور پورا جسم ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ ایسے عالم میں ساری دولت، مال و ثروت چھوڑ کے دنیا کو الوداع کہنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد یہ خاکی جسم محض مٹی کا ایک پتلا بن کر رہ جاتا ہے۔

چھوڑ کے مال و دولت ساری دنیا میں اپنی ‏ ‏ خالی ہاتھ گزر جاتے ہیں کیسے کیسے لوگ

(اکبر حیدرآبادی)

دنیا مرنے والوں کو بہت جلد بھلا دیتی ہے۔ چاہے مرنے والا شخص کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ چاہے اس نے دولت کے انبار ہی کیوں نہ لگائے ہوں، اس کے باوجود، دنیا والے تو دور اس کے اپنے اور نہایت قریبی لوگ بھی اسے بہت جلد بھول جاتے ہیں، صرف ان ہی لوگوں کو دنیا یاد کرتی ہے جو دنیا کو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ جو رفاہ عام کے لیے کچھ کر گزرتے ہیں یا جو علمی خزینہ چھوڑ جاتے ہیں۔

بھلا دے گی ہمیں دو دن میں دنیا ‏ ‏ ہماری شاعری کیا، اور ہم کیا

(جگت موہن لال رواں)

مرزا سلامت علی دبیر مرثیہ کے امام تصور کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے رباعیاں بھی لکھی ہیں، جو ان کے مرثیوں کی طرح مقبول ہوئیں۔ زندگی اور موت کے فلسفے کو انھوں نے اپنی ایک رباعی میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ دنیا ایک سرائے خانہ ہے، یہ بات ہر شخص تسلیم کرتا ہے، جہاں کوئی آتا ہے تو دوسرا اس سرائے سے رخصت ہو جاتا ہے۔ آمد و رفت کا یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہنے والا ہے۔ شاعر اس حوالے سے کہتا ہے۔

کسی کا کندہ نگینے پہ، نام ہوتا ہے ‏ ‏ کسی کی عمر کا لبریز، جام ہوتا ہے

عجب سرا ہے یہ دنیا، کہ جس میں شام و سحر ‏ ‏ کسی کا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے

(مرزا سلامت علی دبیر)

موت کہاں رہتی ہے؟ کہاں رقص کرتی ہے؟ زمینوں اور ہواؤں کے درمیان کس طرح بھٹکتی رہتی ہے؟ کبھی یہ جسم میں داخل ہو کر منہ سے لہو نکلواتی ہے۔ کبھی زہریلے پنجے گاڑ دیتی ہے جسے چھڑانا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ انسان کہیں بھی رہے، کہ غار میں بھی چلا جائے تو موت وہاں بھی اس کا پیچھا کرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ ہزاروں، لاکھوں لوگوں میں سے کسی ایک شخص کو پہچان کر کھینچ لاتی ہے اور بالآخر زندگی ہار ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے کیونکہ موت زندگی سے طاقت ور ہوتی ہے۔ پاکستان کے ایک نامور نوجوان شاعر نے ایک نظم 'موت' کے عنوان سے لکھی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 'موت' نظم پر اس مضمون کا اختتام کروں۔ نظم نہایت موثر، دلچسپ اور دل نشیں ہے، جس کے ایک ایک لفظ پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے اور شاعر کی تخیلاتی پرواز کی داد دیجیے۔

کہیں دشتِ قیامت میں، کہیں غاروں میں رہتی ہے
دھوئیں کی کروٹوں کے زاویوں پہ رقص کرتی ہے
ہواؤں میں لٹکتی ہے، زمینوں پر بھٹکتی ہے
کبھی گولی پہن کر گھر کے آنگن میں اترتی ہے
کبھی یہ سانس بن کر جسم میں گھس کر
لہو تھکوانے لگتی ہے
کبھی سورج نگلتی ہے، کبھی چندا چباتی ہے
کبھی یہ آگ کی لو، اپنے ہاتھوں پر اٹھاتی ہے
کبھی پلکوں پہ چڑھ کر آسماں سے کود جاتی ہے
کبھی یہ واقعہ ہے اور کبھی یہ سانحہ بھی ہے
کبھی یہ حادثہ ہے اور کبھی یہ راستہ بھی ہے
یہ ایسا سانپ ہے جو عکس اپنی آنکھ میں رکھ لے
تو پھر عکس نہیں دیتا
یہ ایسی رات ہے جو اپنے کالے بازوؤں سے
روشنی کا قتل کرتی ہے
اگر یہ ٹھان لیتی ہے، تو سب کچھ جان لیتی ہے
ہزاروں، لاکھوں لوگوں میں بھی یہ پہچان لیتی ہے
اور اس سے لڑ کے زندگی بھی ہار اپنی مان لیتی ہے
کسی پاتال میں چھپ کر بھی کوئی بچ نہیں سکتا
کسی مجمع، کسی پنڈال میں چھپ کر بھی کوئی بچ نہیں سکتا
فقط نتھنے پھلا کر یہ لہو کو سونگھ لیتی ہے
بدن کو ڈھونڈ لیتی ہے
ازل سے موت اندھی ہے
ازل سے موت اندھی ہے

(عاطف توقیر، پاکستان)

الغرض 'موت' کے موضوع پر ہزاروں اشعار ملتے ہیں، جو ہمیں اس کی حقیقت اور زندگی کی ناپائیداری سے آگاہ کرتے ہیں۔ انسان اگر موت کو زندگی سے زیادہ عزیز سمجھنے کی کوشش کرے تو اس کی زندگی آسان اور بے ضرر بن جائے گی۔ پس اس کی نظر موت پر رہے اور اس کی تیاری کے لیے وہ ہر دم کوشاں رہے تو بہت سے دنیاوی غموں سے اسے نجات مل سکتی ہے اور اس کے اخلاق و اطوار سے کبھی کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوگی اور نہ اسے کسی سے کوئی شکایت رہے گی۔

■

Dr. Sabir Ali Siwani
H.No. 9-4-87/C/12, First Floor
Behind Moghal Residency
Toli Chowki
Hyderabad - 500009 (Telangana)
Mob.: 9989796088

قیصر تمکین کا تنقیدی رجحان

احسن ایوبی

انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ادبی رجحان اور تنقیدی پیمانوں کو اردو ادب میں پرکھ اور مطالعے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ زبان کے تہذیبی افتراق کے باوجود ان زبانوں کے وسائل کا اطلاق ہوتا رہا ہے لیکن قیصر تمکین ان تسلیم شدہ پیمانوں کو بلا تفریق اردو ادب میں استعمال کرنے کے خلاف ہیں۔ وہ تخلیقی ادب کو تاریخی، سیاسی، سماجی، ذہنی اور نفسیاتی عوامل و محرکات کا مظہر قرار دیتے ہیں اور ادبی شعور کی تشکیل کو انھیں حقائق کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے نزدیک اردو ادب پر انگریزی کے مروجہ نظریات کا اطلاق فیشن زدگی یا اضافی امر سے زیادہ کچھ نہیں۔ جبکہ ان کے تنقیدی مباحث میں ادب کا بین الاقوامی پس منظر ہر جگہ موجود ہے۔ انھوں نے تخلیقی عمل اور تنقیدی رجحانات کی بحثیں چھیڑ کر وسعت مطالعہ کا ثبوت دیا ہے۔ قیصر تمکین کے مضامین کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تہذیبی اور ثقافتی لوازم سے واقفیت کے بغیر شعر و ادب کے تعین قدر کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس نوع کے مضامین سے ان کے تنقیدی رویوں کو گہرائی سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ تنقید محض تشریح و تعبیر کا نام نہیں بلکہ سماج اور سماجی ارتقا، ملک و قوم کی تہذیبی زندگی اور سماجی پس منظر بھی تنقیدی تاثرات میں شامل ہوتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اردو تنقید کے بنیاد گزاروں کی تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ احتشام حسین، ممتاز حسین، حسن عسکری، آل احمد سرور وغیرہ نے قومی و تہذیبی مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس طرز نقد کی اتباع قیصر تمکین کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے کئی مضامین میں سیاسی، سماجی اور معاشی اتھل پتھل کے اثرات ادب میں تلاش کرتے ہوئے ایک نئے زاویے سے مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'بیسویں صدی کے رجحانات' میں انھوں نے اس صدی کی سیاسی و معاشی صورت حال کی روشنی میں ادیبوں پر گزرنے والے آزمائشی لمحات کا تجزیہ کیا ہے۔ خاص طور پر بیسویں صدی کا نصف آخر ادبی تحریکوں اور ادبی تغیرات کا زمانہ تھا۔ کچھ تحریکیں تشکیل پا رہی تھیں اور کچھ دم توڑ رہی تھیں۔ اردو میں ترقی پسند ادیبوں میں مردنی چھانے لگی تھی، جدیدیت کے علمبردار نئے تجربات کا دم بھر رہے تھے۔ چونکہ قیصر تمکین یوروپ میں تھے اور صحافت سے وابستہ تھے، ادبی کالم لکھا کرتے تھے، اسی لیے وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ یوروپ اور ایشیا کے مختلف ممالک کے ادبی رجحانات سے کم و بیش باخبر تھے۔

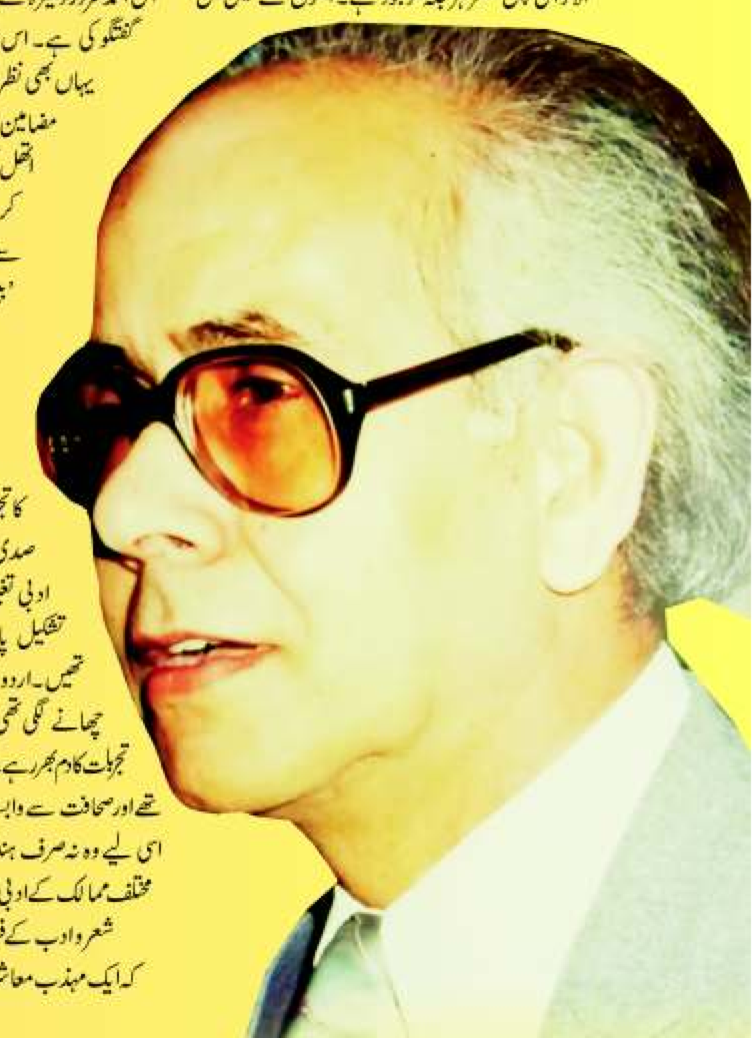

شعر و ادب کے فروغ کا بنیادی مقصد ہی یہی ہے کہ ایک مہذب معاشرہ وجود میں آئے۔ لیکن عام لوگ تو درکنار خود ادیب ہی بعض دفعہ ان جبلتوں پر قابو پانے میں ناکام ہوتے ہیں جن سے مغلوب ہو کر انسان غیر اخلاقی عمل کر بیٹھتا ہے۔ قیصر تمکین نے 'روئے ادب، سوئے ادب' میں اسی مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے۔

تخلیقی عمل اکتساب سے واسطہ نہیں ہوتا، یہ محض ایک فیضان ہوتا ہے۔ قیصر تمکین کا خیال ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی تخلیقی صلاحیتیں شروع سے اخیر تک محو عمل اور فعال رہتی ہیں، ورنہ عام طور پر فنکار ایک خاص منزل پر پہنچ کر تھکنے سے لگتے ہیں یا آمد کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایسے مقام پر پہنچ کر خاموشی سے خود تنقیدی یا مطالعے اور فکر میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی فنکار نقد و نظر کے اچھے برے معیار سے ذرا بھی واقف ہو گا تو وہ جذبہ و فکر کے اظہار سے پہلے اور بعد تک کاٹ چھانٹ اور ترمیم و اضافہ ضرور کرتا رہے گا۔ تخلیق کار اور قارئین میں تنقیدی بصیرت کے اسی فقدان کی وجہ سے انھوں نے معرکہ آرا مضمون 'تنقید کی موت' لکھا جس میں ادبی تنقید کی صورت حال، ادبی اداروں پر جبہ سائی کرنے والے مفاد پرست ادیب، مسند صدارت پر موجود حضرات کی اقربا پروری، نقائص سے مملو تحریروں پر نازاں ہو کر ضخیم نمبر اور مضامین شائع کرانے والے حریص اہل قلم پر طنز کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس حوالے سے دو تین دلچسپ واقعات بھی قلم بند کیے ہیں جن سے ادبی تنقید اور نظریات و افکار کی ادھوری تفہیم اور مبہم تشریح کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''بعض فنکاروں کے لیے تنقید ایک اہم ضرورت ہو سکتی ہے۔ مختلف وضع اور ڈھنگ سے تخلیق کرنے والوں کو دبستانوں اور ازم وغیرہ کے واسطے سے خطاب دیے جاتے ہیں۔ اگر ناقد اپنے مسلک ادب اور دبستان فکر کے لحاظ سے کسی تخلیقی فنکار کے بارے میں بلا کم و کاست کچھ کہنے کا اہل ہے تو ممکن ہے کہ وہ بعض کلاسیکی اصول نقد کا پابند کہا جا سکے لیکن اردو دنیا میں تو تنقید ہمیشہ ہی ایک غلامانہ مسلک کی پابند رہی ہے۔ پیروی مغرب کی مہلک روش نے ایک طرف تو بعض سنجیدہ حضرات کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ تنقید کے ذکر ہی کو معشوق کی کمر سے تعبیر کرنے لگے اور دوسری طرف ساختیات و مابعد جدیدیت

وغیرہ کے گورکھ دھندوں میں گم کر دیا۔‘‘

(تنقید کی موت، قیصر تمکین، شہزاد کراچی، 2004، ص 43)

اس حوالے کا مقصد یہ ہے کہ تنقید ہو یا تخلیق، جدت و ندرت بہت ضروری ہے۔ تنقید میں جہاں تک جدت طرازی کا عمل ہے وہ نظریات اور مفروضوں سے اختلاف کی صورت میں کیا جاسکتا ہے لیکن اختلافی صورتیں محض زبانی جمع خرچ کی مانند نہ ہوں۔ اختلاف کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس ٹھوس دلائل موجود ہوں۔ جس طرح انگلستان میں ارسطو کی تقلید کے بجائے ڈرائڈن نے اس کے منضبط شدہ اصولوں سے اختلاف کرکے ڈرامہ سے متعلق اپنے نظریات پیش کیے۔

تنقید کی ابتری میں تقلیدی روش کے علاوہ جو چیز مضر ہے، وہ یہ ہے کہ فن پارے کی تشریح و تفہیم کے لیے مصنف کے ذاتی احوال سے واقفیت حاصل کی جائے۔ مصنف اور اس کا سماجی پس منظر فن پارے کی تہہ تک رسائی میں محض ایک ضمنی رول ادا کرتا ہے نہ کہ مکمل انحصار اسی پر کر لیا جائے۔ ایسی صورت میں فن پارہ معنوی امکانات کھو کر صرف مصنف کا زندگی نامہ بن جاتا ہے۔ قیصر تمکین کا خیال ہے کہ مصنف کے تخلیقی کمال کی وضاحت کے لیے یہ تفصیلات کارگر نہیں ہوسکتی ہیں۔ لیکن آج کل تنقید میں تن آسانی کی خاطر اسی طرز نقد کو رہنما اصول کے طور استعمال کیا جارہا ہے جو تنقید کی موت کا باعث ہے۔

انصاف و مساوات پسند، بشر دوست، ایماندار و دیانت دار، دوسروں کی عزت نفس کا احترام ایک مثالی انسان ہونے کی خصوصیات ہیں اور ایک ادیب ہونے کے لیے تو ان صفات سے متصف ہونا لازم ہے۔ ان عناصر کی موجودگی میں ہی وہ تمام تر تعصبات، مذہبی و سیاسی چپقلشوں سے ماورا ہوکر کوئی فن پارہ تخلیق کرسکتا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ قیصر تمکین کو مغرب کے نام نہاد ادیبوں میں ان صفات کا فقدان نظر آیا۔ انھوں نے مشاہدے اور مطالعے کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مغرب کے وہ بڑے ادیب جن کی تحریریں قابل تقلید سمجھی جاتی ہیں، انھوں نے معمولی معمولی سطح پر شدید تعصب برتا ہے۔ انھوں نے ٹی ایس ایلیٹ اور دوستوفسکی کا حوالہ دیا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ ’’یہودی تو چوہوں سے بھی گئے گزرے ہیں۔‘‘ ٹی ایس ایلیٹ کے سامراجی خیال کی شدت کا عالم یہ تھا کہ اس نے بعد میں بھی اپنے اس طرح کے بیان پر شرمندگی کا اظہار نہیں کیا۔ اسی لیے قیصر تمکین مغربی ادیبوں کے نظریہ ادب کو من و عن قبول کر لینے پر ہمیشہ معترض رہے۔ قیصر تمکین کی زندگی چونکہ یوروپ میں گزری تھی اور وہاں کی معاشرتی و ادبی زندگی کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں پر گہری نظر تھی۔ اسی لیے انھوں نے جگہ جگہ وہاں کے لوگوں کی تعصب پسندی پر طنز کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فکر و دانش کی تمام تر ترقیات اور ترقی پسندی و روشن خیالی کے تمام تر دعوؤں کے باوجود وہ نسلی تعصب پسندی سے دامن نہ چھڑا سکے۔ سفید و سیاہ فام کے تفریقی جراثیم اب تک ان کے ذہنوں میں کلبلا رہے ہیں۔ اسی لیے ان کی بیشتر اصطلاحات اور ترکیبیں نسلی تفوق، سامراجیت کی آمیزش سے تیار کی ہوئی ہیں۔ نرگسیت سے اس قدر مملو ہیں کہ کوئی بھی ادب پارہ، کوئی طبقہ، کوئی تحریک اس وقت تک بہتر یا بامعنی نہیں سمجھی جاتی جب تک اس کے خیالات نیم مسیحی نہ ہوں۔ قیصر تمکین اردو ادیب اور ناقدوں کی پیروی مغرب پر اسی لیے برگشتہ ہیں کہ انھوں نے مغربی ادیبوں کی ذہنیت کو سمجھنا تو درکنار، اس پر غور تک کرنے کی زحمت نہیں کی اور نہ ہی سامراجیت کے خلاف کسی طرح کی ترقی پسندانہ روش اختیار کرنے کی کوشش کی۔

”قیصر تمکین فکشن کو شاعری پر فوقیت دیتے تھے۔ اسی لیے فکشن سے متعلق ان کے کئی مضامین ہیں۔ جن میں ’فکشن کیوں‘ قابل ذکر ہے۔ اسے فکشن سے متعلق ایک وقیع مضمون کہا جاسکتا ہے۔ اس میں انہوں نے فکشن تنقید کی طرف سے برتی جانے والی تساہلی کو نشانہ بنایا ہے۔“

قیصر تمکین فکشن کو شاعری پر فوقیت دیتے تھے۔ اسی لیے فکشن سے متعلق ان کے کئی مضامین ہیں۔ جن میں ’فکشن کیوں‘ قابل ذکر ہے۔ اسے فکشن سے متعلق ایک وقیع مضمون کہا جاسکتا ہے۔ اس میں انھوں نے فکشن تنقید کی طرف سے برتی جانے والی تساہلی کو نشانہ بنایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فکشن کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے، دوسرے یہ کہ قیصر تمکین اپنے ترقی پسندانہ رجحان کی وجہ سے شعر و ادب کو سماجیات اور تہذیب سے وابستہ کرنے کے خواہاں ہیں۔ اسی لیے تجزیہ و تشریح سے زیادہ فکشن کی قرأت میں سماجی حوالوں پر زور دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے خیالات ملاحظہ ہوں:

’’فکشن پر لکھنے والوں کی تعداد ہمارے ادب میں زیادہ نہیں ہے۔ اگر بہت توجہ سے دیکھا جائے تب بھی دس بارہ ہی معتبر نام ملیں گے۔ ان میں بھی کوئی ایسا لکھنے والا نہیں ہے جس نے تحقیق اور غور و فکر کے بعد یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہو کہ ناول و افسانہ وغیرہ کی ادب اور سماج میں کیا اہمیت ہے اور یہ کہ اگر کسی معاشرے میں فکشن نہ ہو تو اس کی تہذیبی تاریخ کس حد تک نامکمل سمجھی جائے گی۔‘‘

(ادب و دانش حاضر، قیصر تمکین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2008، ص 9)

فکشن کی طرف سے بے توجہی کا یہ شکوہ قیصر تمکین نے یوں ہی نہیں کیا بلکہ انھوں نے ابتدا سے لے کر معاصر عہد تک کا جائزہ لینے کے بعد کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شروع سے لے کر اب تک ممتاز شیریں، وقار عظیم، حسن عسکری، گوپی چند نارنگ، شہزاد منظر، وہاب اشرفی، وارث علوی اور شمس الرحمن فاروقی نے کسی حد تک اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

فکشن تنقید کے انحطاط کا بھی انھوں نے شکوہ کیا ہے۔ نئے لکھنے والوں کی تن آسانی کے باعث غیر ادبی رویے اور علاقائی افسانہ نگاری کے محاکموں پر طنز کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرز کے مقالے لکھنے والے بیشتر تجزیہ کار فن کار کے حلقہ اثر سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں، جو معمولی مفاد کی خاطر اس طرح کے خشک اور بے لذت مقالے لکھ ڈالتے ہیں۔

اردو افسانے کو رومانیت کے تنگنائے سے نکال کر حقیقت سے متعارف کرانے میں ترقی پسند تحریک کی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ اسی تحریک نے اردو افسانے کو اعتبار بخشا، موضوعات کا دائرہ وسیع کیا لیکن بعد میں کچھ خامیوں کی وجہ سے اسے مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ قیصر تمکین اس رویے سے نالاں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خوبیاں اور خامیاں ہر چیز میں ہوتی ہیں۔ اس لیے کسی بہتر چیز کی معمولی خامیوں کی وجہ سے اس کی تمام تر خوبیوں کو فراموش کر دینا ناانصافی ہے۔ اسی طرح ترقی پسند تحریک کے نظریہ سازوں نے اگر کہیں شدت پسندی سے کام لیا تو ناقدین کو اس خامی کو نشان زد کرتے ہوئے اس تحریک کی تشکیل کردہ افسانوی فضا کا ذکر کرنا چاہیے تھا لیکن ہوا یہ کہ ممتاز شیریں جیسی بلند خیال ناقد بھی اس سلسلے میں کم نگہ ثابت ہوئیں۔ قیصر تمکین کا یہ خیال بڑی حد تک درست ہے کہ افسانے کو پایۂ اعتبار ترقی پسند تحریک نے ہی عطا کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مزید یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ:

’’اردو ادب سے اگر ترقی پسند تحریک کو خارج کر دیا جائے تو پھر ہمارے پاس اقبال کے علاوہ کوئی منارہ روشنی قسم کا فنکار نہیں رہ جاتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پوری بیسویں صدی ہی اقبال اور ترقی پسند ادب کی صدی ہے۔ اب ملاحظہ ہو ترقی پسند تحریک کیا ہے۔ زندگی بردوش کہانیوں کی تخلیق۔ ترقی پسندی کا بنیادی عنصر سماج وادی

حقیقت پسندی ہے۔'' (ایضاً،ص14)

اس مضمون میں قیصر تمکین نے ترقی پسندوں کے کارناموں کو فراموش کر دینے پر برگشتگی کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر چند مشہور افسانوں پر ہی توجہ دی جاتی تو ناقدین کی عصبیت کی لے مدھم پڑ جاتی اور معمولی کوتاہیوں کی وجہ سے پوری تحریک معتوب نہ ٹھہرائی جاتی۔ اس ضمن میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کے ادیبوں کی اہمیت پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اردو افسانے میں جو کچھ بھی قابل اعتبار اور فنی لحاظ سے باعظمت ہے، وہ صرف ترقی پسندوں کی دین ہے۔ ان کے افسانوں نے تفنن طبع یا محض مجلس آرا رسالوں کی تزئین میں حصہ نہیں لیا۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر، قاسمی اور عصمت نے افسانے کو سماج سدھار کے لیے استعمال کیا اور پہلی بار یہ ثابت کیا کہ فن افسانہ یا بحیثیت مجموعی فکشن نگاری کو معاشرتی مقام کی تسخیر کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ فکشن نگاروں نے سن چالیس کی دہائی میں اپنے معرکہ آرا افسانے پیش کیے۔ پشاور ایکسپریس، ٹوبہ ٹیک سنگھ، اور انسان مر گیا جیسے فکشن نے پورے ادب کا مزاج بدل کر رکھ دیا۔ ادبی اقدار بدل گئیں، سامراجی طاقتوں کی فتنہ پروری کا پردہ چاک ہو گیا۔ جتنا کام صرف اس ایک دہائی میں فکشن نے برصغیر میں وحشتوں اور عصبیتوں کے انسداد کے لیے کیا، وہ ہماری پوری شاعری لگ بھگ دو سو برس میں بھی نہ کر سکی۔ جس طرح مغرب میں زولا، پشکن اور ڈکنس کی تحریروں نے فکر و فن کے شبستانوں میں آگ لگا دی، تقریباً اسی طرح کی خدمت برصغیر میں ترقی پسند فکشن نگاروں نے کی۔ عزیز احمد اور شوکت صدیقی نے جس سفاکی سے نشتر زنی کی، اس نے ہمیں شائستگی و انسانیت پسند رجحانات کی طرف مراجعت میں مدد کی۔ یہ خدمت جدیدیت یا اسطوری کہانیوں میں یا مرثیانوں کے علم بردار نہ کر سکے۔'' (ایضاً،ص15)

مندرجہ بالا بیانات سے قیصر تمکین کے نظریے کی وضاحت بآسانی ہو جاتی ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کو ایک ہمہ گیر ادبی نظریے کے طور پر نہ صرف تسلیم کرتے ہیں بلکہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر ستر کی دہائی میں حکومتی اور سیاسی حالات اتنے ہنگامی اور سخت ترین نہ ہوتے تو ترقی پسند تحریک جو واضح مقصد لے کر دنیائے ادب میں داخل ہوئی تھی، اسے شعر و ادب کے رگ و پے میں سرایت کر دیتی لیکن سیاسی حالات نے اتنے قدغن لگائے کہ اظہار رائے کی آزادی خطرے میں پڑ گئی۔ جمہوری تحریکوں کی روایت ختم ہو گئی۔ ان حالات سے عہدہ پرستوں اور جاہ پرستوں نے فائدہ اٹھایا۔ سچے ادیب خاموش ہو گئے۔ بعض جدت طبع ادیبوں نے تجربے کے شوق میں رمزیت

> **قیصر تمکین اردو ادب کے ساتھ ساتھ عالمی ادبیات کا بھی سنجیدگی سے مطالعہ کرتے رہے ہیں اور انہیں اس بات کا ادراک ہے کہ آج کل تنقید کے نام پر لکھی جانے والی بیشتر تحریریں 'من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو' کے مصداق ہیں۔ لیکن ان تمام معلومات کے باوجود جب وہ فکشن یا شاعری پر گفتگو کرتے ہیں تو اپنے موضوع سے بھٹک کر اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ موضوع اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔**

اور اشاریت آمیز کہانیوں کی بنا ڈالی اور اسے جدیدیت کا نام دے کر پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا دیا۔ لایعنی، افادی نقطہ نظر سے فضول تحریروں کا مقابلہ ترقی پسند تحریروں سے کیا جانے لگا۔ جبکہ ان نام نہاد جدید افسانوں میں کچھ بھی اس طرح نیا نہیں تھا، جس طرح ترقی پسند ادیبوں اور اس سے پہلے انگارے کے مصنفین کے یہاں تھا۔

'جدیدیت' کے متعلق قیصر تمکین کا خیال ہے کہ جو تحریریں اپنی ساخت، معنویت اور تہہ داری کے اعتبار سے کلاسیکی تخلیقات کا مقابلہ نہ کر سکیں، ان پر جدیدیت کا ٹھپہ لگا کر فضیلت عطا کر دی گئی لیکن ان کا یہ خیال محض دعویٰ ہی ہے۔ کیونکہ انھوں نے اس سلسلے میں کوئی دلیل یا کوئی تقابلی تجزیہ پیش نہیں کیا۔ صرف یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ انگارے کے مصنفین یا ترقی پسندوں نے 'نیا' یا 'جدید' کا لفظ استعمال نہیں کیا جبکہ ان کی طرف سے پیش کیا گیا مواد ہر اعتبار سے نیا تھا۔ انھوں نے ترقی پسند کی اصطلاح استعمال کی۔ اگر اس اصطلاح کی معنویت پر غور کر لیا جائے تو بہت سی الجھنیں رفع ہو سکتی ہیں۔ قیصر تمکین محض اس اصطلاح (ترقی پسند) کے استعمال یا سمجھ لینے کو مسئلے کا حل نہیں تسلیم کرتے بلکہ عملی طور پر کچھ کر دکھانے کے قائل ہیں، جس کے ذریعے سماج کے دبے کچلے لوگوں کو ان کا حق حاصل ہو سکے۔

قیصر تمکین اس بات پر شدید معترض ہیں کہ آج کا قاری اور ناقد فکشن نگار سے سوال نہیں کرتا کہ اس نے جو کچھ لکھ کر پیش کیا ہے اس کے ذریعے عصر حاضر کے مسائل کے حل کے کتنے امکانات ہیں۔ اس وقت اچھے خاصے فکشن نگار سماجی ناانصافی اور تہذیبی تصادم پر کچھ کہنے سے محترز ہیں۔ جدیدیوں کا ادبی مزاج عوام کی پسند کے بالکل برعکس تھا، اسی لیے قاری کی گم شدگی کا المیہ پیدا ہوا۔ قیصر تمکین کا خیال ہے کہ قاری کی گمشدگی کی شکایت کرنے والے وہی لوگ تھے جنھوں نے فکشن کا مقصد سمجھا ہی نہیں تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

''کہانی سے کہانی یا کہانی کا قاری گم ہو جانے کی شکایت کرنے والے یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ کہانی کو تعمیر و تہذیب کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی صنف کے برمحل استعمال سے سماج کے زخموں کا اندمال کیا جا سکتا ہے۔ کہانی کار ایک عام انسان کی طرح ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ کوئی واعظ یا عام دنیا سے الگ نہیں ہوتا، وہ ایک عام قصہ خواں ہوتا ہے۔ تخیل کی کتنی ہی اونچائی پر پرواز کیوں نہ کرے، ورڈز ورتھ کے اسکائی لارک کی طرح اس کا رشتہ ہمیشہ زمین سے قائم رہتا ہے۔ کہانی کار بتاتا ہے کہ کہانی یا فکشن کسی کی جدی میراث نہیں بلکہ پوری انسانیت کا سرمایہ ہے۔'' (ایضاً،ص21)

اس طرح واضح ہوتا ہے کہ قیصر تمکین مقصدی ادب کے قائل ہیں۔ وہ فکشن اور شاعری کو پیغمبری تو نہیں بنانا چاہتے مگر ایک ایسے واضح تصور کے خواہاں ہیں جس میں سماج و معاشرے کی بہتری کے عناصر شامل ہوں اور اس سے یک تہذیبی تاریخ کی تشکیل ہو سکے۔ ترقی پسند فکشن سے بھی وہ پوری طرح اس لیے مطمئن نہیں ہیں کہ ترقی پسندوں نے پورے ادب کو معاشرے کی بہتری کے لیے مصروف عمل اقدار سے وابستہ کر دیا جس کی وجہ سے انفرادی طور پر فکشن کی افادیت پر تفصیل سے بحث و مباحثہ نہ ہو سکا۔

قیصر تمکین اردو ادب کے ساتھ ساتھ عالمی ادبیات کا بھی سنجیدگی سے مطالعہ کرتے رہے ہیں اور انھیں اس بات کا ادراک ہے کہ آج کل تنقید کے نام پر لکھی جانے والی بیشتر تحریریں 'من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو' کے مصداق ہیں۔ لیکن ان تمام معلومات کے باوجود جب وہ فکشن یا شاعری پر گفتگو کرتے ہیں تو اپنے موضوع سے بھٹک کر اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ موضوع اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ شعری ادبی رجحان کے متعلق لکھتے ہوئے انھوں نے بعض مضامین میں سماجیات پر اتنی طویل گفتگو کی ہے کہ ان کے نظریاتی تحفظات مجروح ہوتے نظر آنے لگے ہیں۔ لیکن انھیں نظر انداز اس لیے نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ انھوں نے مغربی ادیبوں کے حوالے، ان کے تصور شعر و ادب اور تعصبات پر جو گفتگو کی ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیگر ادبا اور ناقدین کی طرح قیصر تمکین نے مغربی عینک استعمال نہیں کی۔ انھوں نے مغربی افکار و خیالات کی برتری ثابت کرنے میں صفحات سیاہ نہیں کیے۔ ■

Ahsan Ayyubi
C-4/3, Suroor Apartment
Sir Syed Nagar
Aligarh - 202001 (UP)
Mob.:9616272524

جاوید انور

تخلیق...
وجود اور ارتقا

تخلیق بالخصوص ادبی تخلیق کیا ہے؟ یہ کیوں کر اور کس طرح وجود میں آتی ہے؟ اس کے محرک عناصر کیا ہیں؟ ان پر جو گفتگو کی گئی ہے اس سے ایک نتیجے پر تمام متفق ہیں کہ اس کی کوئی حتمی تعریف ممکن نہیں ہے۔ اس اتفاق کے علاوہ تخلیق کو موضوع بنا کر لکھنے والوں کی تحریروں میں یکسانیت بھی ہے اور تضادات بھی جو کہ تفہیمیت کی بحث کو آگے بڑھانے میں معاون ہیں تخلیقیت کی جو تفہیم دیگر حوالوں کے ساتھ پروفیسر قدوس جاوید نے اپنے مضمون 'تخلیقیت اور شاعری کا طلسم' میں کی ہے وہ مجھے قدرے آسان، مستحکم اور قدرے واضح معلوم ہوتی ہے۔ اس میں میں نے اتنا تصرف کیا ہے کہ جہاں جہاں لفظ 'شاعری' استعمال ہوا ہے، اس کو 'تخلیق' بھی لکھا ہے۔ کیونکہ شاعری بھی تخلیقیت کی ایک قسم ہے جو تخلیق ہوتی ہے۔

قدوس جاوید نے جو اہم نکات درج کیے ہیں، وہ یہ ہیں:

''1 شاعری (تخلیق) تخیل کا نام ہے اور تخیل ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعے سے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ یہ تخیل کی قوت اس کو دوبارہ ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے۔ اور پھر اس کو ایسے دلکش پیرائے میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولہ پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔

2 شاعری (تخلیق) حسین و بیش قیمت تجربات کا موزوں و مکمل بیان ہے۔

3 شاعری (تخلیق) زندگی کے حقائق کی گہرائیوں، تصوف یا عرفان اور فلسفہ بیان کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

4 شعر (تخلیق) ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے۔ لیکن مصور صرف مادی اشیا کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ یعنی شاعری کسی چیز کا اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے یا وہی اثر دل پر طاری ہو جائے۔

5 شاعری (تخلیق) وجدانی دنیا کا دوسرا نام ہے۔ شاعر اپنی فکر کی قوت، احساس کی ذکاوت اور خیال کی رفعت کے باعث وجدانیت (Intutionality) کی ہی ترجمانی کرتا ہے۔

6 شاعری (تخلیق) خیال و احساس کے باطنی زمان و مکان کی توضیح و تعبیر ہے۔

7 شاعری (تخلیق) ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اس قدر وسیع ہے، جس قدر خیال کی قلمرو اور یہ ایسا عالم گیر فن ہے جس سے نہ تو کوئی وحشی قوم معرا ہے اور نہ کوئی ترقی یافتہ قوم گریزاں۔

8 شاعری (تخلیق) ایک وسیلہ ہے جس سے شاعر (تخلیق کار) اپنے باطنی تجربے کو اوروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا اس کی شاعری (تخلیق) واردات قلبی کا ایک آئینہ ہے جس میں اوروں کو بھی اپنے دل کی بات نظر آتی ہے۔

9 شاعری (تخلیق) قوانین حسن و صداقت کی تابع، تنقید حیات یا تفسیر حیات ہے۔

10 (تخلیق) علم و فن سے بے نیاز علم کا نچوڑ اور جوہر لطیف یعنی بے ساختہ کلام ہے جو ہیجان کے ساتھ ساتھ فوری لذت کا سرچشمہ بھی ہے۔

11 انسان عالم یاس و نا امیدی یا عالم سرخوشی میں جو کچھ بھی محسوس کرتا ہے اگر اسے کلام موزوں کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دے تو اسے شاعری (تخلیق) کہیں گے۔

12 شاعری (تخلیق) ذوق حسن اور لطافت جذبات کی مصوری ہے۔

13 شاعری (تخلیق) تنہائی، خاموشی اور سکون میں جذبات تازہ کرنے کا نام ہے اور زوردار احساسات کا بے ساختہ سیلاب ہے۔

14 شاعری (تخلیق) وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور احساسات اس کے جذبات داخلی کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور ایک عالم تصویر پیدا کر دیتے ہیں۔

15 شاعری (تخلیق) کی روح نہ تو بلند و بالا نزاکت خیال میں ہے اور نہ شعوری کوشش کے ساتھ الفاظ کے استعمال کرنے میں، بلکہ دل کی گہرائیوں میں ہے اور ان انسانوں کے قابل قدر جذبات میں ہے جو انھیں تحریر کرتے ہیں۔''

(بحوالہ متن، معنی اور تھیوری، از پروفیسر قدوس جاوید، ص 29،30)

درج بالا تحریر سے ادبی تخلیق کیا ہے؟ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ کیوں کر وجود میں آئی؟ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا خیال یا کوئی ایسا تجربہ جس کو تخلیق کار دوسروں کے سامنے پیش کرنا چاہے جس سے نہ صرف اس کی انفرادیت واضح ہو بلکہ اس کے اس علم کا بھی مظاہرہ ہو، کو ایک مخصوص ہیئتی شکل دینا تخلیق کے وجود کا ایک جواز ہو سکتا ہے۔ اس کے محرک عناصر میں سماجی حالات، خود تخلیق کار کے ذاتی ظاہری و باطنی حالات، زمانے کا مشاہدہ، وہ خیالات و تصورات جس کا اظہار تخلیق کار زمانہ کے لیے سود مند سمجھتا ہو یا نقصان دہ۔ لیکن پہلی تخلیق کے لیے ہمیں اساطیر کا سہارا لینا پڑے گا۔

انسان اپنے وجود کے روز اول سے ہی احساسی سطح پر ایک ایسی قوت کا مالک بنایا گیا ہے جسے تحقیقی، تجزیاتی اور مشاہداتی قوت کہا جا سکتا ہے۔ یہی قوت اسے نئے نئے رموز سے آشنا کرتی رہی اور وہ اپنی اسی فطری قوت سے زندگی کے معاملات حل کرتے کرتے ترقی کی اس منزل پر پہنچا ہے۔ اسی قوت نے جب اسے اپنے وجود اور کائنات کے وجود، اس کی تخلیق اور اپنی تخلیق پر غور و فکر کے لیے مجبور کیا تو پہلے پہل اشاراتی، پھر تصویری اور پھر زبان کی ایجاد کے بعد پہلی تخلیق اسی اسرار کے حل کے طور پر وجود میں آئی ہوگی۔ دلیل کے طور پر قدیم تہذیبوں کے اول اوراق میں دیوتاؤں اور اس 'ایک' کا ذکر ہے۔ یہاں انسان کے وجود سے پہلے کائنات کے وجود پر غور و فکر کا رجحان ملتا ہے۔ وزیر آغا اس متعلق لکھتے ہیں:

شاعری کے ضمن میں تخلیق کے جو عناصر بیان کیے گئے ہیں ان میں سے بیش تر کا اطلاق نثری تحریروں پر بھی ہوتا ہے، چونکہ تخلیقی اظہار کے دو ہی طریقے ہیں نظمیہ یا نثریہ۔ اور ایسا مانا جاتا ہے کہ تخلیق کی ابتدا نظمیہ پیرایۂ اظہار سے ہوئی، اس لیے تخلیق کے متعلق زیادہ مباحث کا محور نظمیہ تحریریں جن کو شاعری کہا گیا ہے، رہی ہیں۔ تخلیقی عمل میں پہلا مسئلہ تخلیقی زبان کا ہے۔ تخلیقی زبان کسے کہیں گے؟ اس سوال کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ادبی زبان یعنی اس کے مخصوص رائج الفاظ جو کہ روزمرہ عوامی زبان میں رائج الفاظ یا ادبی زبان کے ہی غلط تلفظ اور خلط ملط الفاظ سے مختلف، اعلیٰ اور شرفا طبقے میں رائج ہوں اور حصول تعلیم کے ذریعے ان عوام الناس کے حصے میں آ گئیں جو اس کے حصول میں محنت کریں اور اپنے اندر وہ تخلیقی حسیت پیدا کریں جو اعلیٰ اور عوامی طبقے کے لسانی امتیاز کو مٹا سکے۔ تکنیکی اعتبار سے تخلیقی زبان کی جو تعریف اور خصائص متعین ہو سکتے ہیں، وہ قدرے پیچیدہ ہیں۔ لیکن آسان زبان میں سمجھنے کے لیے میرے خیال میں ان میں سے چند یہ ہو سکتے ہیں۔

1 تخلیقی زبان وہ ہے جس کے ذریعے کسی غیر موجود کی طرف اشارہ کیا جائے۔ چونکہ تمام زبانوں میں یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ کسی پوشیدہ بات کو ظاہر کرے، اس لیے تمام زبانیں کسی نہ کسی معنی میں تخلیقی ہیں۔

2 تخلیقی زبان ایسے الفاظ کا مجموعہ ہے جو نا معلوم کی معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ایسے علوم کی جانب بھی ذہن کو متوجہ کراتا ہے جس کا وہ مواد جو مرکزی اہمیت رکھتا ہے، سے براہ راست تعلق نہ ہونے کے باوجود مختلف شعبۂ ہائے زندگی میں اپنی منفرد اہمیت رکھتے ہیں۔

3 تمام زبانیں تخلیقی ہوتی ہیں لیکن اعلیٰ تخلیقی زبان کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کم معلومات (Information) میں ہی زیادہ علم (Knowledge) تک رسائی کی قوت رکھتی ہے جیسے بڑے بڑے عالموں کے چھوٹے چھوٹے جملے جن میں ایک جہان معنی آباد ہوتا ہے۔ اس قسم کے جملے آج کے دور میں انگریزی زبان میں سب سے زیادہ ہیں۔

4 جس زبان میں معنی کے محرک عناصر یعنی تشبیہ، استعارہ، پیکر، علامت وغیرہ کا جتنا زیادہ ذخیرہ ہوگا، وہ اس زبان کے تخلیقی معیار کو بلند کرنے میں اتنا ہی اہم کردار ادا کرے گا۔

تخلیق کے معیار و وقار کے تعین میں تخلیقی رجحان اور مواد کا بھی بڑا دخل ہے۔ تخلیقی رجحان، اپنی تہذیب اور سماج کا پروردہ ہے یا پھر دوسری تہذیب و سماج سے مستعار ہے؟ اگر دوسرے سماج اور تہذیب سے مستعار ہے تو اس سے استفادے کی صورت کیا ہو کہ مرعوبیت اور تقلیدی عناصر سے فن پارے کو بچایا جا سکے اور اس کی اپنی خاص انفرادیت قائم رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج ثقافت کا وہ قدیم تصور سائنس اور ٹکنالوجی کی صارفیت کے دور میں تبدیل ہو کر ایک دوسری حقیقت کے طور پر بھی وجود پا چکا ہے۔ اب مفاد پرستی کے دور میں ثقافت تجارت کی صورت میں بھی ڈھل چکی ہے اور اس تجارت کو بھی تہذیب کہا جانے لگا ہے۔ اس طرح ایک منفرد مواد بھی تخلیق کا حصہ بن گیا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعاتی میراث کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا جا رہا ہے اور جو نئی تاریخ کا ایک سیاہ واقعہ بن رہا ہے، وہ بھی تخلیقی مواد اور تخلیقی جہت پر اثر انداز ہوا ہے۔ کارل مارکس کی داس کیپٹل کا جو وقتی اجتماعی اثر ہوا تھا، آج کی سیاسی تاریخ میں تخلیق اس اثر سے بھی محروم ہے۔ اجتماعی شکست کا یہ مرحلہ اور بھی اندوہ ناک ہو جاتا ہے جب ادب اور سماج کے یہ منفی عوامل ایک آئیڈیولاجی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ تخلیقی مواد اور ادبی تہذیب جو کہ مغرب سے وابستہ ہے اور جس نے مشرق کی ادبی تہذیب پر بھی اپنے نشانات ثبت کیے ہیں، میں سے بعض اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ کچھ مسائل یا صورت حال آفاقی ہوتی ہیں جن میں ہر ملک اور ہر قوم میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ تخلیق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ سیاسی تاریخ کا یہ دباؤ تخلیقی سروکاروں کو جہاں مایوسی میں مبتلا کرتا ہے وہیں اس سے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے بچا کیسے جائے؟ دفاعی صورت کے طور پر مغرب میں جو تنہائی کے آلات استعمال کیے گئے، وہ بھی کچھ دن کے بعد بے اثر ہو گئے، یہی مسئلہ اپنے تخلیقی سماج میں بھی ایک نئے نقطے کے ساتھ وجود میں آیا کہ تخلیقی اظہار کی اس فضا کے درمیان اپنا ذہنی و جذباتی توازن اور اپنی تنہائی جو کہ واحد اثاثہ ہے، اس کی حفاظت کیسے کی جائے؟ منٹو کی طرح کئی بار ذہنی توازن کھو دینا یا شکیب جلالی کی طرح کی زندگی اور موت یا پھر بلراج مینرا کی طرح اپنے تخلیقی عروج کے دور میں تخلیق سے ہی توبہ کر لینا وغیرہ نجات کے بجائے مزید تخلیقی مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات مغربی ادبی تہذیب میں بھی ملتے ہیں لیکن انجام کار وہ بھی ثقافتی تجارت کی بلندیوں میں گم ہو گئے۔

تخلیقی زبان ایسے الفاظ کا مجموعہ ہے جو نا معلوم کی معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ایسے علوم کی جانب بھی ذہن کو متوجہ کراتا ہے جس کا وہ مواد جو مرکزی اہمیت رکھتا ہے، سے براہ راست تعلق نہ ہونے کے باوجود مختلف شعبۂ ہائے زندگی میں اپنی منفرد اہمیت رکھتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر تخلیق اپنی مخصوص تہذیب اور ماحول و حالات رکھتی ہے۔ دوسری تہذیبوں سے استفادے کی وہ صورت جو کہ سرسید نے مغربی طرز کے تتبع میں سادہ بیانی کے طور پر اختیار کی تھی، اسے عالمی ادب اور معیار سے جڑنے کا ایک عملی قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی رجحان ترقی کر کے ترقی پسندی اور اس میں بھی جب استفادے کی جگہ اندھی تقلید نے لے لی تو جدیدیت اور یہاں جب احساس شکست اور تنہائی کا دباؤ ضرورت سے زیادہ بڑھنے لگا تو مابعد جدیدیت میں ساخت شکنی سمیت دوسری تھیوریز۔ لیکن کوئی بھی جب اپنے امکاناتی حدود سے آگے کے زبردستی کے سفر پر نکالا گیا تو دیوندر اسر کا یہ قول یاد آیا کہ:

''اگر ساخت شکن نظریے اور نئی تھیوری کو اس کے منطقی انجام تک لے جایا جائے تو ہمیں ادب کے وجود سے ہی انکار کرنا پڑے گا۔''

(تخلیقی محرکات اور نئے عالمی مفروضے 'مابعد جدیدیت کے حوالے سے' بحوالہ 'نثر کی اہمیت' از حسین الحق، ص، 37)

دیوندر اسر کے اس خدشے کو دوسرے ادبا نے بھی اپنی مختلف ذہنی بصیرت کے اعتبار سے محسوس کیا تھا جس کے نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان کی اردو سمیت دوسری زبانوں میں بھی ایک حد تک دیسی پن Native Vigour کا رجحان سامنے آیا تھا جو کہ مغرب کی اندھی تقلید سے محفوظ رکھنے کا واحد راستہ اور منزل تھا۔ جب یہ احساس عام ہوا کہ مغربی تنقید کے معیار مغربی ادب پاروں کے لیے مخصوص ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ان کا ہر نظریہ ہماری تہذیب و ثقافت کے تحت تخلیق ہونے والے فن پاروں کے ساتھ انصاف کر سکے۔ اس کی ایک وجہ مغرب میں تیزی سے بدلتے ہوئے نظریات بھی تھے کہ اپنے زمانے میں ہی رد یا تضاد کے طور پر کئی نظریات سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ مغربی ادبی ذہن کی فعالیت پر دال ہونے کے ساتھ ساتھ اس نظریے کی ناکامی کا بھی اشاریہ تھا جو اپنے یہاں زیادہ وقتوں تک پائدار ثابت نہ ہو سکا، اس کا بوجھ ہمارا ادب کیوں کر برداشت کرے؟ لیکن ظاہر ہے کہ یہ جذباتی عمل بھی یہ طے نہیں کر سکتا کہ مغرب کا کون سا نظریہ، کون سی تھیوری ہمارے ادب کے موافق ہے اور کون نہیں۔ کیونکہ اس کی درجہ بندی تو ہوئی نہیں ہے۔ بس یہ ہو سکا ہے کہ موقع و محل کے اعتبار سے ناقدین نے ان نظریات کو اپنی اپنی تحریروں میں استعمال کیا اور کر رہے ہیں۔ لیکن اس کا فائدہ بھی ہوا کہ دیسی پن کے تحت اپنی قدیم وراثت کی جانب ادبی ذہن از سر نو منتقل ہوا اور 'تصوف کی جمالیات' از۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن، 'غالب معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' از پروفیسر گوپی چند نارنگ اور سنسکرت شعریات پر اردو میں عنبر بہرائچی کی کئی کتب سامنے آئیں۔ یہ گویا اس بات کی بشارت ہے کہ سیاسی اور اقتصادی شعور پر توجہ کرتے ہوئے جس کا ایک تصور 'سوادیشی' کا نعرہ بھی ہے، نئے ادبی شعور کے ساتھ قدیم دیسی تہذیبوں کو مرکزی مقام عطا کرتے ہوئے ایک نئی شعریات کی تشکیل کے عمل کی ابتدا بھی ہو چکی ہے۔

تخلیق کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟ اگر پوری دنیا کے اہم ادب کو نظر میں رکھ کر گفتگو کی جائے تو سیکڑوں صفحات درکار ہوں گے۔ اردو کی حد تک اس پر گفتگو کی جائے تو کائنات کی دریافت کے بعد اساطیری تخلیقات سے سلسلہ آگے چل کر تصوف کی مستحکم روایت تک آتا ہے جس سے اساطیری یا دیومالائی عناصر بھی منسلک ہیں۔ حضرت سلطان باہو کی یہ تخلیق ملاحظہ ہو:

'' من طلبنی وجدنی جس نے مجھے چاہا اس نے مجھے پایا۔

من وجدنی عرفنی جس نے مجھے پایا اس نے مجھے پہچانا
من عرفنی احبنی جس نے مجھے پہچانا اس نے مجھ سے محبت کی
من احبنی عشقنی جس نے مجھ سے محبت کی اس نے مجھ سے عشق کیا
من عشقنی قتلتہ جس نے مجھ سے عشق کیا اس کو میں نے قتل کیا۔
من قتلتہ فعلی لازم دیۃ: جس کو میں نے قتل کیا اس کا خوں بہا مجھ پر واجب ہوا۔
ودیۃ اناہ! اور اس (مقتول) کا خوں بہا میں خود ہوں"

یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ صوفیزم میں عبادت کی بنیاد محبت (عشق) کو کہا جاتا ہے۔ خوف خدا کی اہمیت یا تو ثانوی ہے یا پھر اس پر توجہ کم کی گئی ہے جیسا کہ اکثر صوفیا کے یہاں یہ یا اس قسم کے اظہارات ملتے ہیں کہ میں اللہ کی عبادت اس کی جنت کی تمنا میں یا اس کی جہنم کے ڈر سے نہیں کرتا۔ (انا لا اعبد اللہ طمعاً فی جنتہ و لا خوفاً من نارہ)۔ لیکن قرآن میں بارہا خوف اور محبت کا ایک ساتھ ذکر ہے۔ 'اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ'، 'ایمان والے وہ ہیں کہ جب اللہ یاد کیا جائے تو ان کے دل ڈر جائیں'، "بے شک ہم نے تمھیں نبی بنا کر بھیجا خوشی اور ڈر سنانے والا"، 'ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں' قرآن کے صفحات پر اور بھی کئی طریقوں سے موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جنت اور جہنم کا تذکرہ بھی بار بار آیا ہے کہ خدا کے یہاں رہنے کے دو ہی مقام ہیں۔ اچھے لوگوں کے لیے جنت اور برے لوگوں کے لیے جہنم۔ اس کے علاوہ ایسی کوئی جگہ جہاں ان دونوں کی تمنا اور خوف سے عاری والے لوگوں کو رکھا جائے گا، کا بیان قرآن میں نہیں ہے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب اذان ہوتی تھی تو ان کا بدن لرز جاتا تھا۔ پوچھنے پر فرماتے تھے کہ کائنات کے مالک کا بلاوا آیا ہے، پتہ نہیں میری عبادت کا کیا بنے گا؟ یہ بھی مشہور ہے کہ جب سارا عالم رات میں نیند کی آغوش میں ہوتا اکثر حضرت علیؓ اپنی داڑھی پکڑ کر بیٹھے رہتے اور خدا کے حضور گریہ وزاری میں رات گزار دیتے۔

اس سوال کے جواب میں کہ صوفیا خوف خدا کو عشق خدا یا خدا کی محبت کے برابر اہمیت کیوں نہیں دیتے تھے؟ ایک تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خدا کی محبت میں اتنے سرشار تھے کہ اس نقطے کی جانب ان کا ذہن ہی نہیں گیا۔ عشق کے تقاضے پورے کرنے میں ہی ان کی عمر نکل جاتی تھی۔ دوسرا جواب تاریخی ہے کہ تصوف کا وجود بصرہ (عراق) میں حسن بصریؒ کے شاگردوں کی دین تھا مثلاً عبدالواحد بن زید وغیرہ۔ حسن بصریؒ کا زمانہ اسلام کے ورود کے تین سو سال بعد کا زمانہ ہے۔ یعنی اسلام کی ابتدائی تین سو سالہ تاریخ تصوف اور صوفیا سے خالی ہے۔ صوف (اون) کے کپڑے کو کہتے ہیں جس کو اس وقت مسیحی رہبان پہنا کرتے تھے اور افضل سمجھتے تھے کیونکہ عیسیٰؑ اون کے کپڑے پہنا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں رہبانوں کے زیر اثر یہ لوگ بھی صوف (اون) کے کپڑے پہنتے تھے، اس کو افضل سمجھتے تھے اور اسی مناسبت سے یہ لوگ صوفی کے نام سے مشہور ہوئے۔

اس کے بعد سماج اور ادب بالخصوص اردو زبان و ادب نے جو ترقی کی اس کو دہرانے کی میرے خیال میں ضرورت نہیں ہے۔ 'سبک ہندی' سے لے کر 'باغ و بہار' اور 'سب رس' اور میر سے لے کر غالب، اقبال، فانی اور یانی اور اس کے ساتھ کی مختلف ادبی اصناف اور آگے کے سلسلوں تک کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی تاریخ ادب کے صفحات میں بکھری پڑی ہے۔ تخلیق کی قسموں کے بعد کا مرحلہ میرے خیال میں تخلیقی اظہار کی قسموں کا ہے۔ تخلیقی اظہار، نظمیہ اور نثریہ کی بھی دو قسمیں ہیں ایک آمد اور دوسرا آورد۔ آمد کا زیادہ اثر نظمیہ اصناف میں ہے اور آورد کا نثریہ میں۔ فوری تاثر کے اعتبار سے نظمیہ اصناف زیادہ موثر ہیں اور خاص و عام دونوں کو فوری طور پر متوجہ بھی کرتی ہیں۔ مشاعروں کی مقبولیت اور اس میں شرکت کرتی عوام کی کثرت اس کی دلیل ہے۔ لیکن اسے مان لینے میں بھی میرے خیال میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ ان کا اثر بہت جلد زائل بھی ہو جاتا ہے اور وقت وقت پر جذبات ابھارنے میں ان کا استعمال زیادہ ہوتا ہے جو بعض اوقات یا اکثر اوقات کوری جذباتیت کے نتیجے میں وجود پائے ہوئے بہت بڑے خسارے کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔ نثریہ تحاریر ہر خاص و عام کو اس لیے متوجہ نہیں کر پاتیں کہ یہ "دل سے نکلے دل تک پہنچے" کے لیے بھی ایک سطح کے اعلیٰ شعور کا تقاضا کرتی ہے جس میں حصول علم کی مشقت کا بھی خاصا دخل ہوتا ہے اور ان کو سمجھنے اور غور و فکر کے لیے یکسوئی نظم کی بہ نسبت زیادہ وقت کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ اسی لیے نثری تحاریر میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے متعلق ذہن سازی کے امکانات نظمیہ تحاریر کی بہ نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی دلیل آسمانی صحائف ہیں کہ جن میں عقل والوں کو غور و فکر کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور یہ تمام نثر پارے ہیں۔

ان تمام کے بعد میرے خیال میں ان محرکات پر گفتگو ضروری ہے جو کہ تخلیق کا باعث ہوتے ہیں۔ ان محرکات کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ کوئی ایسا تجربہ یا خیال یا واقعہ جو کہ تخلیقی ذہن کو کچھ تخلیق کرنے پر مجبور کر دے، تخلیقی محرکات میں شمار ہو سکتا ہے۔ مختلف رجحانات و تحریکات اور حادثات و واقعات دلیل کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں جنھوں نے تخلیق کاروں کے لیے مواد مہیا کیے۔ اردو ادب کی تمام نظمیہ اور نثریہ اصناف کی بیش تر تحاریر میں کثرت میں وحدت Unity In Diversity کا تصور اور عمل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ نئے حادثات اور واقعات جو زندگی اور ذہن بالخصوص تخلیقی ذہن یا تخلیقی ذہن کی کسی ساخت کو غیر متوقع اور غیر معمولی تبدیلی پر مجبور کر دیتے ہیں وہ بھی تخلیق کا سبب بنتے ہیں۔ ابھی جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں پورے عالم میں کورونا covid-19 وبا پھیلی ہوئی ہے جس نے دنیا کے 180 سے زیادہ ممالک کو تالہ بندی (Lockdown) پر مجبور کر دیا ہے۔ آج کی تاریخ 22، مئی 2020 بروز جمعہ، رات ساڑھے آٹھ بجے تک جو خبریں ملی ہیں ان کے مطابق ہندوستان میں اس کے مریضوں کی تعداد ایک لاکھ انیس ہزار سے تجاوز کر گئی ہے جن میں سے تین ہزار سات سو سے زائد ہلاکتیں ہوئی ہیں اور اڑتالیس ہزار پانچ سو سے زائد مریض ٹھیک بھی ہوئے ہیں۔ اس طرح مریضوں کی موجودہ تعداد ستر ہزار سے زائد ہے لیکن جس طرح آج ایک ہی دن میں چھ ہزار سے زائد مریضوں کے ملنے کی اطلاع ملی ہے وہ ٹھیک ہونے اور بیمار ہونے والوں کے درمیانی تناسب کو کافی حد تک متاثر کرتی ہے، جو کہ بہت تشویش ناک ہے۔ پوری دنیا میں مریضوں کی تعداد باون لاکھ سے زیادہ ہو گئی ہے۔ ہلاکتیں تین لاکھ پینتیس ہزار سے زائد ہیں اور ٹھیک ہونے والوں کی تعداد اکیس لاکھ سے زائد ہے، لیکن ٹھیک ہونے والوں کی بہ نسبت مریضوں کی تعداد جس تیزی سے بڑھ رہی ہے، یہ وبا کب ختم ہوگی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

اس وبا کی تہہ میں پوشیدہ جو لا تعداد دلدوز واقعات ہیں۔ پوری دنیا کے تخلیقی محرکات میں مواد کی حیثیت سے اہم کردار ادا کریں گے۔ ان کے علاوہ دوسرے موضوعات جو کہ حیات قریب و بعید کو متاثر کر رہے ہیں اور کریں گے، ان کی بہتر نمائندگی بین العلومیت کے آئینے میں بہت عمدہ طریقے سے ہو سکے گی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ 'تھیوری کے بعد' نئی تھیوریز کا قافلہ میرے خیال میں بین العلومیت کی راہ سے ہو کر ہی گزرے گا۔

■

Jawed Ahmad(Jawed Anwar)
Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata
Manduadih Bazar
Varanasi-221103 (U.P)
Cell.: 9935957330
Email: jaweanwar@gmail.com

نجمہ رحمانی

یاد رنگ
شمیم حنفی

نوے کی دہائی کے ابتدائی برسوں کی بات ہے۔ ہم لوگ دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہجوم تشنہ لباں میں ہم نو واردان کس شمار و قطار میں ہیں، کچھ تجسس اور کچھ تفریح طبع کی خاطر ہم سب دوست گروپ بنا کر، جہاں جہاں لیکچرر شپ کا انٹرویو ہوتا، پہنچ جاتے تھے۔ ان دنوں انٹرویو کی کارکردگی سے بھی ایک شناخت بنتی تھی۔ ایسے ہی ایک انٹرویو میں جب کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے تو ایکسپرٹس میں سے کسی نے سوال کیا۔ ''گذشتہ چند دنوں میں کون سی کتاب شائع ہوئی ہے؟'' یہ اتفاق ہی تھا، اسی ہفتے عرفان صدیقی کا نیا مجموعہ 'عشق نامہ' شائع ہوا تھا اور چونکہ اس کی اشاعت ہمارے دوست مظہر احمد نے کی تھی لہٰذا دوستوں کے پاس اس کی کاپی پہلے پہنچ گئی تھی۔ عرفان صدیقی ہم میں سے اکثر کے پسندیدہ شاعر تھے۔ ان کے بہت سے اشعار بھی ہمیں ازبر تھے سو ہم نے فوراً جواب دیا 'عشق نامہ'۔ ایکسپرٹ کی آنکھوں میں ایک واضح چمک ابھری۔ اگلا سوال تھا، ''اچھا تو آپ کو کوئی شعر بھی یاد ہوگا''۔ اشعار سنائے جانے کے مرحلے سے گزرنے کے بعد مزید کئی سوال، اور سب تازہ اشاعتوں سے متعلق۔ انٹرویو دے کر باہر نکلے تو خاصے مطمئن تھے۔ دوستوں سے سوال کیا وہ جو اندر ایک صاحب ہیں، گورے سے، مسکراتے ہوئے، وہ کون ہیں؟ ایسا لگتا ہے کہ پبلشرز اپنی اشاعت کی پہلی کاپی انھیں کو بھیجتے ہیں۔ 'ہائیں، انھیں نہیں جانتیں؟' ارے بھئی شیم حنفی صاحب ہیں۔' سراج نے جواب دیا اور سراج کی معلومات عامہ کے تو ہم سب ہی معترف ہیں۔

شمیم حنفی صاحب سے یہ میرا پہلا براہ راست تعارف تھا۔ مسکراتا ہوا شفیق چہرہ۔ نیچ لہجہ اور نرم گفتاری ان کی شخصیت کا ایک ایسا جزو تھا جس کے بغیر شمیم حنفی کی تصویر مکمل نہیں ہوسکتی۔ ان کے نام سے ہماری نسل کے اکثر ریسرچ اسکالرز واقف تھے۔ اس ایک انٹرویو کے بعد بھی کئی سلیکشن کمیٹیوں میں ان کے سامنے پیش ہونے کا موقع ملا۔ مگر علم کی وہ ہیبت جو ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس'' پڑھنے کے بعد دل پہ طاری ہوئی تھی، وہ کسی قدر رعب اور بہت سی پسندیدگی میں بدل گئی۔ سلیکشن کمیٹیوں کے علاوہ بھی اکثر، سیمناروں اور ادبی محفلوں میں ان سے ملاقات کا موقع ملتا رہا، مگر ذرا فاصلے سے۔ ہمیشہ دھڑ کا لگا رہتا کہ کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ یوں بھی ان سے کھل کر بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔

زندگی اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ گزرتی جا رہی تھی۔ تفریح طبع کے لیے دیے جانے والے انٹرویو اب سنجیدہ کوششوں میں بدل گئے تھے۔ بہت سے چہروں کے نقاب ایک کے بعد ایک کرکے اُترنے لگے مگر ایک چہرے کی خاموش مسکراہٹ ویسی ہی قائم رہی۔ ادھر اُدھر سے کئی بار سنا کہ شمیم حنفی صاحب تمھارے بارے میں مثبت رائے رکھتے ہیں۔ مگر شمیم صاحب نے کبھی خود اپنی زبان سے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

حالات کے تھپیڑوں نے دلی چھڑائی تو لگا کہ شاید اب کبھی پلٹنا نہ ہوگا۔ ایک دل برداشتگی کے ساتھ پونے

میں این۔ ڈی۔ اے جوائن کر لیا۔ بہترین سہولتوں اور بہترین اسٹیٹس کے باوجود، فوجی ادارے کا سخت نظم و ضبط اور پابندیاں مزاج کی آزادہ روی کو راس نہ آسکیں۔ کتابوں کی فراہمی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، نہ ہی اردو حلقوں کی کوئی خبر۔ انٹرنیٹ اور فیس بک جیسی سہولیات کو رائج ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔ اور تو اور موبائل فون بھی عام نہیں ہوا تھا۔ سو ایسے حالات میں اردو کی ادبی سرگرمیوں سے تمام رابطے منقطع اور واپسی کے تمام راستے مسدود تھے۔ انھیں حالات میں ایک بار سرکاری کام سے گوا جاتے ہوئے ریل میں اتفاقاً شمیم صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بھی فیروز دہلوی اور چند دیگر لوگوں کے ساتھ یو۔ جی۔ سی کے کسی کام سے گوا جا رہے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ خیر خیریت کے دوران انھوں نے پوچھا یہاں کیسا لگ رہا ہے؟ سوال نے میری دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔ ''سر یہ جگہ میرے لیے نہیں ہے۔ مگر لگتا ہے کہ اب کبھی دلّی نہیں لوٹ پاؤں گی'' میں نے جواب دیا۔ شمیم

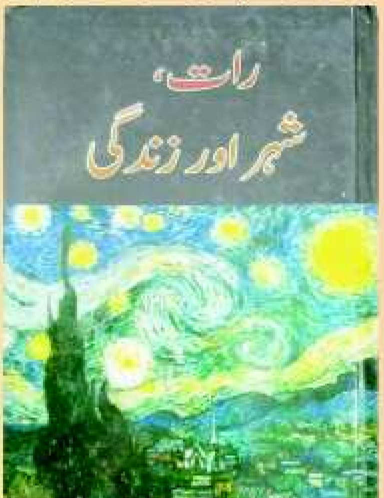

صاحب نے مسکرا کے کہا '' وقت بدلتا بھی ہے۔ اور تاریخیں نئے سرے سے رقم کی جاتی ہیں۔ آپ امید نہ چھوڑیے'' اُن کے لہجے اور جواب میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ دل کو ڈھارس بندھی۔ اس مختصر سی ملاقات کے چند مہینوں بعد ہی دہلی یونیورسٹی میں انٹرویو ہوا۔ اس انٹرویو سے پہلے اور اس کے بعد بھی جو ریشہ دوانیاں ہوئیں، وہ اب ماضی ہوگئیں۔ بہرحال میرا تقرر ہو گیا۔ تقرری کی اطلاع شمیم حنفی کے حوالے سے ایک دوست نے دی۔ دلی واپس آنے کے کچھ وقت بعد معلوم ہوا کہ اُس تقرری میں دوسرے عوامل کے ساتھ شمیم حنفی کی مثبت کوششوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ایک اجنبی لڑکی جس سے ان کی رسمی ملاقاتیں تھیں۔ جس نے کبھی ان کے سامنے نہ دستِ سوال دراز کیا اور نہ ہی کسی کے ذریعے کوئی سفارش بھیجی، اس کے لیے ایک معروف پروفیسر کی اس کوشش نے، صرف ان انٹرویوز کی بنیاد پر جنھوں نے ان پر ایک مثبت تاثر چھوڑا تھا، میرے دل میں شمیم صاحب کے لیے دائمی تشکر و تعظیم کا وہ جذبہ پیدا کیا جو کسی دوسرے کے لیے پیدا نہ ہو سکا۔ میرے اور میرے جیسے کئی لوگوں کی، کارکردگی کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیمی اداروں سے وابستگی میں شمیم حنفی کی ذاتی دلچسپی کا بڑا دخل رہا ہے۔

دلّی لوٹنے کے بعد بھی شمیم صاحب سے ملاقاتیں خال خال ہی رہیں۔ علمیت کا دبدبہ اپنی جگہ، دل میں اس علمیت کے ساتھ بہ حیثیت انسان ان کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ ان کی مقبولیت اردو کے ساتھ ہندی کے ادبی حلقوں میں بھی ہے۔

'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' کے بعد ان کی دوسری کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا تو اُن میں ایک قطعی مختلف

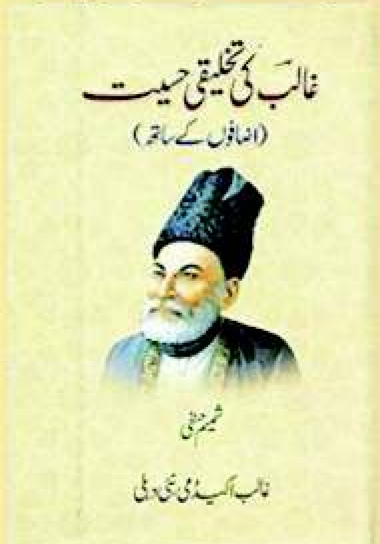

شخص کو پایا، جس کو عام معنوں میں نقاد کہنے کا کبھی جی نہ چاہا۔ ان تحریروں میں تنقید کی خشک اور منطقی زبان کے بجائے تاثر اور تخلیقیت کی چاشنی خود کو پڑھوانے پر مجبور کرتی ہے۔ میں نے خشک تنقید پڑھنے سے ہمیشہ جی چرایا۔ کبھی دل ہی نہ لگا۔ کتابوں اور رسالوں میں ہم کاروں اور دیگر اساتذہ کے مضامین میں دقیق حوالے دیکھ کر ایک رعب سا طاری رہتا۔ لگتا کہ میں ایسے حوالہ جاتی مضامین کبھی نہیں لکھ سکتی۔ دراصل حوالوں سے بوجھل مضامین میں مصنف کی اپنی بصیرت کے بجائے مطالعے کی کارگزاری کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ لکھنے کے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے مگر یہ مطالعہ انجذاب کے عمل سے گزرے بغیر براہ راست کاغذ پر منتقل ہو جائے تو اس سے صاحبِ مضمون کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ تو لگایا جا سکتا ہے مگر مذکورہ مطالعے نے اس کی فکر کو کس نہج پہ متاثر کیا، یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ شمیم صاحب کی اکثر تحریریں اس قسم کے علمی حوالوں سے پاک ہوتی ہیں۔ مگر ان کا اسلوبِ تحریر، گواہی دیتا ہے کہ مطالعے کے بغیر اس رنگ کی نمود ممکن نہیں۔

بھاری بھرکم مضامین نہ لکھ پانے کی میری معذوری کا حل بھی ایک بار مجھے انھیں سے ملا۔ اپنی کم نویسی کا اعتراف کرتے ہوئے میں نے ان کے سامنے اس معذوری کا ذکر کیا کہ میں تنقیدی کتابیں پڑھ کر مضامین نہیں لکھ سکتی مزید یہ کہ جب تک لکھنے کی تحریک نہ ملے کوئی کیونکر لکھ سکتا ہے۔ ادب پڑھنا اچھا لگتا ہے مگر اس پر مضامین لکھنے کا جی نہیں چاہتا۔ اس کا حل بھی انھوں نے یہ کہہ کر دے دیا کہ 'اچھا مضمون وہ ہوتا ہے جو متن کی بنیاد پر لکھا جائے۔' ان کی اپنی تحریریں بھی اس کی عمدہ مثال ہیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ شمیم صاحب سے سند مل گئی تو جبراً و قہراً پڑھی جانے والی کتابیں بھی، کتابوں کی الماری کے سب سے اوپر والے خانے میں ڈال دیں کہ بار بار نظر نہ پڑے۔ اب ایسی کتابوں سے صرف تدریسی ضرورتوں کے تحت کام لیا جاتا ہے۔ ان کے اس مشورے کے بعد بھلا، بُرا جو بھی لکھا اس کے لیے اپنی محدود فہم کو ہی مشعلِ راہ بنایا۔ شمیم حنفی سے کبھی براہ راست استاد و شاگرد کا رشتہ نہیں رہا۔ ہمارے زمانۂ طالب علمی میں ان کی وابستگی جامعہ سے تھی اور میں دہلی یونیورسٹی کی طالب علم تھی۔ لیکن میں اور میرے جیسے بہت سے طلبا نے ان سے استفادہ کیا اور یوں ان کے شاگردِ معنوی تو ضرور رہے۔

2018 میں کراچی آرٹس کونسل کی سالانہ بین الاقوامی کانفرنس کا دعوت نامہ ملا تو کراچی جانے کا موقع ملا۔ وہاں پہنچی تو علم ہوا کہ شمیم حنفی بھی آئے ہیں۔ کراچی کا یہ میرا پہلا سفر تھا۔ شمیم صاحب کی موجودگی سے دل کو یک گونہ اطمینان کا احساس ہوا۔ پاکستان میں ان کے مدّاحوں کی تعداد بلاشبہ ہندوستان سے زیادہ ہے۔ وہ پاکستان کی ادبی سرگرمیوں کا لازمی حصہ تھے۔ وہاں کی 'لمس یونیورسٹی' کے بار بار اصرار کے باوجود انھوں نے اس آفر کو قبول نہیں کیا۔ البتہ باقاعدگی کے ساتھ پاکستان کی ادبی کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت کرتے رہے۔ آرٹس کونسل کے منتظمِ اعلیٰ احمد شاہ سے انھوں نے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا کہ یہ ہماری عزیز شاگرد ہیں اور تدریسی فرائض کے ساتھ یونیورسٹی میں ایکٹوزم بھی کرتی ہیں۔ یہ

جملہ ادا کرتے ہوئے ان کے چہرے پر جو دمک اور احساسِ تفاخر تھا وہ میرے لیے ایک اعزاز تھا۔ تب پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ شمیم صاحب حالاں کہ کبھی خود کسی قسم کے ایکٹوزم میں شامل نہیں رہے مگر دیگر اردو پروفیسرز کے برعکس سیاسی وسماجی ایکٹوزم کو پسند بھی کرتے ہیں اور قدر کی نگاہ سے بھی دیکھتے ہیں۔ کانفرنس کے ہر سیشن میں وہ پورے انہماک اور دل چسپی کے ساتھ شریک رہے۔ جس سیشن میں مجھے مقالہ پڑھنا تھا، وہ اسٹیج کے عین سامنے سب سے اگلی نشست پر بیٹھے تھے۔ وہاں ان کی موجودگی میرے لیے باعث تقویت تھی۔ مقالہ پڑھتے ہوئے جتنی بار ان پر نظر پڑی ان کے لبوں پر ایک حوصلہ افزا تبسم پایا۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد ایک بار بہت آہستہ سے بس ایک جملہ کہا۔'' آپ کراچی میں ایک خوشگوار تاثر چھوڑ کر آئی ہیں۔'' دھیمے لہجے میں ادا کیا گیا یہ جملہ اور ایک دائمی مسکراہٹ۔ کسی مبتدی کے لیے یہی اعزاز ہوتا ہے۔ اکثر موقعوں پر ان کی اسی خاموش اور حوصلہ افزا مسکراہٹ سے اپنی کامیابی کی سند لیتی رہی۔

میں نے شمیم حنفی کو کبھی کسی کے بارے میں بدگوئی کرتے کبھی نہیں سُنا۔ کسی شخص کے لیے ان کی ناگواری کا اندازہ بس اس بات سے ہوتا کہ ایسے موقعوں پر ان کی وہ دائمی مسکراہٹ غائب ہو جاتی اور چہرے کے نقوش ساکت ہو جاتے۔ اپنے غصے اور ناگواری کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دینے کی ان کی صلاحیت حیرت انگیز تھی۔ غالباً اسی صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ مختلف زبانوں کے وسیع مطالعے کے باوجود انھیں گفتگو میں اس علم کی موقع بے موقع تشہیر کرتے کبھی نہیں پایا۔ بس دوران گفتگو کوئی جملہ یا فقرہ اس

وسعتِ علم کا پتا دے جاتا تھا۔

اردو کی ادبی سیاست سے بھی بہ ظاہر ان کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ ہاں ایک بار یہ ضرور ہوا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے انعامات کا اعلان ہوا تو اس میں ایک نام ایسا بھی شامل تھا جسے سن کر حیرانی ہوئی۔ حالانکہ آج کل ایوارڈ کس طرح دیے جاتے ہیں اور اس کے لیے کس قسم کی لیاقت کی ضرورت ہوتی ہے اس سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔ حیرانی اس پر نہیں تھی کہ انعام یافتگان کی فہرست میں وہ نام کیسے شامل ہوا۔ حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ شمیم صاحب اس کمیٹی کے رکن تھے۔ ان کی موجودگی میں اس نام کا شامل ہونا حیران کن تھا کیونکہ شمیم صاحب، اُن صاحب کے معاملات سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ دل کو تھوڑی سی ٹھیس پہنچی۔ وہ ایک تاثر جو برسوں سے قائم تھا، لگا کہ اس میں دراڑ پڑ گئی۔ میں شمیم حنفی صاحب سے یہ امید نہیں کر رہی تھی۔ جو سوال میرے ذہن میں تھا وہی سوال کچھ اور لوگوں کے ذہن میں بھی رہا ہوگا اور بات ان تک بھی پہنچی ہوگی۔ ان کے سامنے ذکر آیا تو صرف اتنا بتایا کہ انھوں نے اعتراض درج کرایا تھا مگر اکثریت سے فیصلہ ہوگیا۔ اپنی بات کو منوانے کے لیے آواز بلند کرنا اور اپنی بات پر اصرار کرنا ان کے مزاج کا حصہ نہ تھا۔ بعد میں سنا کہ انھوں نے ایوارڈ کمیٹی سے علاحدگی اختیار کر لی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جشن ریختہ کے موقعے پر ان کے ساتھ ہمیشہ آنٹی بھی ہوتیں۔ ان ہی کی طرح مشفق و نرم گفتار۔ شمیم صاحب کے مقابلے آنٹی سے زیادہ بے تکلفی تھی۔ اکثر ملاقاتوں میں ان کا اصرار ہوتا 'کبھی کبھی گھر آجایا کریں' شمیم صاحب کا تبسم زیرِلب اس کی تائید کرتا نظر آتا۔ مگر زندگی کے ہنگامے اور دلی کے فاصلے درمیان میں حائل رہے۔ یوں ایک آدھ بار کے سوا کبھی گھر جانا نہ ہوا۔ 2019 کے جشن ریختہ کی ملاقات میں پہلی بار انھوں نے خود کہا'' کبھی کبھی آجایا کیجیے، اب کم لوگ رہ گئے جن سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔'' اس جملے میں فرمائش سے زیادہ زمانے کی شکایت پنہاں تھی۔ بہر حال میں نے وعدہ کر لیا اور اس بار مصمم ارادہ بھی، کہ جانا ہے۔ مگر چند مہینے بعد ہی وبا کے سبب لاک ڈاؤن اور اس کے ساتھ روز بروز بگڑتی ہوئی صورتِ حال نے ایفائے وعدہ کا موقع ہی نہ دیا۔

خالد جاوید سے ان کی طبیعت کے بارے علم ہوتا رہا۔ اپنی طبیعت میں نرم خو اور نرم گفتار شخص اندر سے اتنا سخت جان نکلا کہ کینسر جیسی موذی بیماری کو بھی شکست دے کر نکل آیا۔ کورونا کی وبا سے نبرد آزما ہوا اور اسے بھی شکست دے دی۔ مگر یہ بیماری جاتے جاتے ان سے ان کی تمام قوت مدافعت لے گئی۔

یہ محض اتفاق ہی ہے کہ 4 مئی کی رات کو جب خالد جاوید کا فون آیا تو میرے ہاتھ میں شمیم حنفی کی کتاب تھی۔ ان کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع دیتے ہوئے خالد نے کہا کہ شمیم صاحب کے لیے آکسیجن بیڈ کے ساتھ ہسپتال کا انتظام کرنا ہے۔ وہ اس موذی وبا کا شکار ہوئے تھے، یہ خبر تھی اور پھر یہ بھی پتا چلا تھا کہ انفیکشن ختم ہو گیا ہے اور اب رو بہ صحت ہیں۔ اب جو یہ خبر ملی تو دل دھک سے رہ گیا۔ خالد نے بتایا کہ انفیکشن تو ختم ہو گیا تھا مگر نمونیا کے سبب پھیپھڑوں کی کارکردگی خطرناک حد تک کم ہو گئی۔ ان کی بیٹی غزل نے گھر پر ہی آکسیجن کا انتظام کر دیا تھا۔

ڈاکٹر بھی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ مگر پھر ڈاکٹروں کے مشورے پر ہی یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہسپتال میں داخل کرایا جائے کیونکہ اب 24 گھنٹے طبی نگرانی کی ضرورت تھی۔ کوششیں شروع ہوئیں اور دیر رات گئے رنجیت چوہان کے توسط سے ڈی۔ آر۔ ڈی۔ او کے ہسپتال میں بھرتی کرا دیا گیا۔ مگر مناسب طبی سہولتوں کی عدم دستیابی کے سبب وہاں سے واپس لے آئے۔ 6 مئی کی شام کو پھر خالد سے بات ہوئی تو ان کی آواز سے پریشانی عیاں تھی۔ انھوں نے بتایا کہ آج دوپہر ماڈل ٹاؤن کے ایک پرائیوٹ ہسپتال، ایم۔ ڈی۔ سٹی میں پھر سے داخل کرایا گیا ہے آدھے گھنٹے بعد اطلاع آئی کہ شمیم حنفی نہیں رہے۔ نادیدہ سا کچھ اندر سے نکل گیا۔ لگا جیسے اچانک اندر کچھ خالی ہو گیا۔ ان کا جانا ٹھہر گیا تھا بس صبح شام کی دیر تھی۔ سو 6 مئی کی رات کو اردو کا یہ آفتاب غروب ہوا۔

دسمبر میں شمیم صاحب سے گھر آنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ یوں پورا ہوا کہ آٹھ بجے کے قریب اطلاع ملی اور ساڑھے نو بجے، مَیں ہسپتال پہنچی۔ غزل اور ان کے شوہر وہاں موجود تھے۔ انھیں لے جانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ میں نے اس عہد ساز شخصیت کے ساکت چہرے پر ایک آخری نگاہ کی جو اَب مٹی کا ڈھیر تھا۔ ہاتھ اُٹھا کر آخری سلام پیش کیا اور ہسپتال کے عملے نے میت کا چہرہ ڈھانپ دیا لیکن

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

■

Najma Rahmani
Dept of Urdu
Delhi University
Delhi - 110007

محمد قاسم انصاری

پروفیسر شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کا شمار اردو کے معتبر اور مستند ادیبوں ونقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی علمی و ادبی بصیرت کی دنیا قائل ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور غیر معمولی تھا۔ زبان وادب کے کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو ذہنوں کو منور کر دیتے۔ فاروقی اور نارنگ صاحبان کے ساتھ اردو دنیا میں جو نام زیادہ نمایاں رہا وہ نام حنفی صاحب کا ہے۔ ان دو عہد اور نظریہ ساز ادیبوں کے درمیان اپنی علمیت کا لوہا منوانا اور انفرادیت کو برقرار رکھنا معمولی بات نہیں۔ ان کی عظمت کا احساس یقیناً نارنگ اور فاروقی کو بھی تھا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے ان دو جید ادیبوں کے درمیان اپنی علمی وادبی شناخت قائم کی اور اعتدال پسندی کی وہ راہ نکالی جس سے ان کی شخصیت پر داغ نہ آسکا۔ نہ تو کسی کی اندھی تقلید کی اور نہ ہی بے جا تنقید۔ زبان وادب سے متعلق ہر پہلو کو پہلے اپنے مطالعے کی کسوٹی پر پرکھا اور پھر بغیر کسی لاگ لپیٹ کے وہ بات پیش کی جو شعر وادب کے لیے کارگر تھی۔ ان کی یہی خوبی انھیں ان کے معاصرین سے ممیز کرتی ہے۔ انھوں نے جدید تنقیدی مباحث، رویوں، میلانات ورجحانات سب پر خوب لکھا۔ اپنے دلائل ومعروضات سے پوری اردو دنیا کو متاثر کیا۔ وہ زبان وادب کے مسائل کے تئیں بھی سنجیدہ اور اس کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر درجنوں کتابیں لکھیں۔ وہ بیک وقت کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی ادبی زندگی کے کئی جہات اور کئی گوشے ہیں اور ہر گوشہ انفرادی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب ونقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سنجیدہ اور معتبر شاعر، ممتاز ڈرامہ نویس اور معیاری مترجم تھے۔ تقریباً اپنے بیاسی سالہ سفر میں انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزارا۔ ان کی درجنوں کتابیں ہیں جن میں جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، غزل کا نیا منظر نامہ، نئی شعری روایت، کہانی کے پانچ رنگ، فراق دیار شب کا مسافر، اقبال کا حرف تمنا، قاری سے مکالمہ، سیاہ فام ادب، سرسید سے اکبر تک، اور غالب کی تخلیقی حسیت، ہمسفروں کے درمیان، ہم نفسوں کی بزم میں، دکان شیشہ گراں، اجتماعی زندگی اور انفرادی شعور، خیال کی مسافت، تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ، رات سحر اور زندگی جیسی گرانقدر تصانیف شامل ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی ایک بڑے ڈرامہ نویس تھے۔ ان کے متعدد ڈرامے بالخصوص مجھے گھر یاد آتا ہے، زندگی کی طرف، بازار میں نیند منظر عام پر آچکے ہیں ان ڈراموں کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ ان میں فن اور زندگی کا حسین امتزاج موجود ہے۔ ایک ایسے دور میں انھوں نے فن ڈرامہ کی آبیاری کی جب اس اہم ترین ادبی صنف کو تقریباً مردہ تصور کر لیا گیا۔ اس فن پر طبع آزمائی کرنے والوں کا فقدان ہو چلا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ اس اہم فن پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی اور آہستہ یہ فن زوال پذیر ہوتا گیا۔

عہد حاضر میں ترجمہ نگاری کو ایک پیشہ ورانہ فن تسلیم کیا گیا ہے۔ فنی اور تکنیکی مہارت کے ساتھ اس میں ذولسانی فارمولہ اصولی طور پر کام کرتا ہے۔ یعنی معیاری مترجم کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے کم از دو زبانوں پر عبور حاصل ہو۔ ایک وہ زبان جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہو دوسری وہ جس زبان میں ترجمہ ہو رہا ہو۔ ان کے علاوہ بھی معیاری ترجمے کے اپنے تقاضے ہیں غرض یہ خاصا مشکل اور پیچیدہ فن ہے۔ حنفی صاحب اس مشکل ترین پیشہ ورانہ فن اور اس کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھیں اردو و فارسی کے علاوہ کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی قدرت ومہارت رکھتے تھے۔ مختلف تاریخی، سیاسی وسماجی موضوعات پر ان کے تراجم اس کے غماز ہیں۔ ان تراجم میں مولانا آزاد کی معرکتہ آلارا تصنیف انڈیا ونس فریڈم کا اردو ترجمہ ہماری آزادی اور ممتاز مورخ ڈاکٹر تاراچند کے خطبات، پنڈت نہرو کی تحریر Years of struggle کا اردو ترجمہ جدوجہد کے سال ودیگر تراجم ان کی علمیت کا بین ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ڈرامہ اور ترجمہ جیسے مشکل فن پر طبع آزمائی کے ساتھ حنفی صاحب نے ادب اطفال پر بھی اپنی توجہ مرکوز کی۔ موجودہ دور میں بچوں کے ادب پر لکھنے کا تقریباً فقدان ہو چلا تھا۔ انھوں نے اس اہم گوشے کو بھی منور کیا۔ اس موضوع پر ان کی کئی اہم کتابیں ہیں ان میں مرزا غالب، پنڈت جواہر لعل نہرو، اندرا گاندھی کی کہانی، بھوتوں کا جہاز، کٹا ہوا ہاتھ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حنفی صاحب کو فن مصوری اور دیگر فنون سے گہرا شغف تھا۔ وہ اردو کی سیکولر اقدار کے حامی تھے۔ تمام عمر اس کی پاسداری کرتے رہے۔

پروفیسر شمیم حنفی اردو کی مختلف تنظیموں واداروں سے وابستہ تھے۔اپنے مفید مشوروں سے وہ ان کی سرپرستی اور رہنمائی کرتے رہے۔

17 مئی 1939 میں اتر پردیش کے شہر سلطان پور میں پیدا ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے اعلی تعلیم کے لیے الہ آباد یونیورسٹی کا رخ کیا۔فراق جیسی عبقری شخصیت نے انھیں بے حد متاثر کیا۔مزید تحصیل علم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گئے جہاں بعد میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اعزازی پروفیسر مقرر ہوئے۔وہ استادالاساتذہ تھے۔ ان کے لائق اور فائق شاگردوں نیز ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جو ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھا رہی ہے ملک وبیرون میں منعقد ہونے والی علمی وادبی سرگرمیوں کا وہ حصہ بنے اور اپنی علمی وادبی بصیرت سے اردو دنیا میں اجالا کرتے رہے۔ان کی خدمات کا اعتراف قومی و بین الاقوامی دونوں سطحوں پر کیا گیا۔ حال ہی میں دوحہ قطر کی مجلس فروغ اردو نے اپنے سب سے باوقار ادبی ایوارڈ سے انھیں سرفراز کیا۔انھوں نے اخبارات کے لیے کالمس لکھے جن کی تعداد تقریباً سو ہے یہ کالمس اب کتابی زینت بن چکے ہیں جو ان کی صحافتی خدمات کا مظہر ہیں۔یہی نہیں بلکہ وہ اردو کی بقا اور اس کے تحفظ کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کا جواب دیتے رہے۔خواہ اردو کے رسم الخط کا مسئلہ ہو یا اردو تعلیم اور اسے روزی روٹی سے جوڑنے کا مسئلہ، حنفی صاحب نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے اردو کا بھرپور دفاع کیا۔

حنفی صاحب نے نثر کی مختلف اصناف کے ساتھ انصاف تو کیا ہی ساتھ ہی انہوں نے اردو شاعری کے گیسوؤں کو بھی سنوارا ہے۔وہ ایک سنجیدہ شاعر تھے۔ انھوں نے زندگی کے کھٹے میٹھے تجربات کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان کا شعری ذوق ان کی ادبی کائنات میں تنوع پیدا کرتا ہے۔ان کی شاعری آج کی شاعری ہے جس میں کلاسکیت اور جدیدیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔وہ میر، غالب، اقبال، فیض اور فراق کے شیدائی ضرور ہیں لیکن خود کو وہ کبیر کے مسلک سے جوڑتے ہیں۔کبیر سے ان کا روحانی رشتہ ہے جس کا ذکر وہ مختلف موقعوں پر کرتے رہے ہیں۔ان کا یہ انتخاب انھیں مسلک خسرو سے جوڑ دیتا ہے۔ اس مسلک نے انھیں کسی کا بے جا مداح نہیں بنایا بلکہ وہ ان حقائق کی ترجمانی کرتے رہے جن کا گہرا تعلق سماج وادب سے ہے۔اپنے گہرے مشاہدات اور تجربات کو انھوں نے شعری پیکر میں کچھ اس طرح ڈھالا ہے جن سے ان کی ذہنی وروحانی دونوں کیفیات مترشح ہوتی ہیں. نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے۔

کچھ دن جینا پھر مرجانا یہی سب کی رام کہانی ہے
کچھ رنگ نئے بھی آنے تھے کچھ روپ بدلتے رہنا تھا
مٹی کی کچی ہانڈی میں کچھ خواب تھے کچھ تعبیریں تھیں
انھیں کسی کی بھوک مٹانی تھی کیوں روز ابلتے رہنا تھا
یہ کار عبث ہم نے بھی کیا سورج کی طرح تا عمر یہاں
ہر شام ہمیں ڈھل جانا تھا ہر صبح نکلتے رہنا تھا

زندگی، موت اور ان سب کے درمیان اپنے فرائض کو سمجھنا ہی دراصل دانشوری ہے۔حنفی صاحب کو یہ ہنر بحسن خوبی آتا تھا۔اپنے علمی وادبی سفر کے دوران انھوں نے اس جوہر کو پہچان لیا تھا اسی لیے وہ کھرے کھوٹے کی پرکھ رکھتے تھے۔وہ جبرایا روایتاً کسی چیز کو قبول نہیں کرتے بلکہ ردوقبول میں وہ اپنے پیمانوں سے کام لیتے ہیں چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں مذکورہ خصائص کی ترجمانی ہوتی ہے۔

کتاب پڑھتے رہے اور اداس ہوتے رہے
عجیب شخص تھا جس کے عذاب ڈھوتے رہے
بس اپنے آپ کو پانے کی جستجو تھی کہ ہم
خراب ہوتے رہے اور خود کو کھوتے رہے
ہمیں خبر نہ ہوئی اور دن بھی ڈوب گیا
چٹختی دھوپ کا بستر بچھا کے سوتے رہے

انھیں ذاتی کیفیات واحساسات کی ترجمانی کرتے ان اشعار کو بھی ملاحظہ کیجیے جن میں زبان وبیان اور لب و لہجے کی تازگی وشگفتگی میں مقامیت کا رنگ نمایاں ہے۔

لکڑ ہارے تمھارے کھیل اب اچھے نہیں لگتے
ہمیں اب یہ تماشے سب کے سب اچھے نہیں لگتے
یہ کہہ دینا کہ ان سے کچھ گلے شکوے نہیں ہم کو
مگر کچھ لوگ یونہی بے سبب اچھے نہیں لگتے

ایک واقعے کا ذکر ناگزیر ہے۔اس واقعہ سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ اردو کے علاوہ وہ دیگر ماہرین ودانشوروں میں کس قدر محترم تھے۔ یہ بات ان دنوں کی ہے جب پروفیسر مشیر الحسن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر تھے۔ ایک بڑی تقریب کا انعقاد جامعہ کے ایڈورڈ سعید ہال میں کیا گیا تھا۔ان دنوں میں ای ٹی وی اردو نیوز سے وابستہ تھا۔ایک اہم مسئلے پر مشیر صاحب سے بائٹ لینی تھی۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔حنفی صاحب اپنا پر مغز لیکچر اپنے مخصوص انداز میں پیش کر رہے تھے۔وقت کی تنگی کے باعث میں زیادہ دیر رک نہیں سکتا تھا میں نے کیمرہ مین کو نیوز رپورٹنگ کے مقصد سے پروگرام کے وزیولس بنانے نیز ریکارڈنگ کرنے کی ہدایت دے دی

> حنفی صاحب نے نثر کی مختلف اصناف کے ساتھ انصاف تو کیا ہی ساتھ ہی انہوں نے اردو شاعری کے گیسوؤں کو بھی سنوارا ہے.وہ ایک سنجیدہ شاعر تھے. انہوں نے زندگی کے کٹھے میٹھے تجربات کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے. ان کا شعری ذوق ان کی ادبی کائنات میں تنوع پیدا کرتا ہے.ان کی شاعری آج کی شاعری ہے جس میں کلاسکیت اور جدیدیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے.

تھی۔اسی درمیان میں نے مشیر صاحب سے چند منٹ ہال سے باہر آکر بائٹ دینے کی درخواست کی۔ بالعموم وہ میری درخواست قبول کرلیا کرتے تھے۔ان کے قریب میں سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی صاحب تشریف فرما تھے۔مشیر صاحب نے مجھے تھوڑا انتظار کرنے کو کہا اور فرمایا کہ ہم حنفی صاحب کو سننا چاہتے ہیں۔ایسی ذی علم، بلند قامت اور محترم شخصیت تھی حنفی صاحب کی۔آج یقیناً پوری اردو دنیا کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے در و دیوار بھی اشک بار اور سوگوار ہوں گے۔

موت برحق ہے اس ابدی حقیقت کا بیان اردو شعر و ادب میں مختلف زاویوں سے کیا گیا ہے۔ان میں موت کی فطرت۔ابدیت اور انسان کی بے بسی کی جو عکاسی استاد ذوق دہلوی نے کی ہے۔پوری اردو شاعری میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ان کا یہ شعر آفاقی حیثیت رکھتا ہے۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اب حنفی صاحب بھی رخصت ہوئے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے چلے جانے سے زبان وادب کی ایک مستحکم روایت کمزور پڑ گئی ہے اور جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی بھرپائی ممکن نہیں۔

کورونا وائرس کی اس وبا میں قضا کی آندھی تو چار سو چلی لیکن حیات کی ہوائیں بہت کم۔ہم مایوس ہرگز نہیں بس بارگاہ خداوندی میں دعا گو ضرور ہیں کہ خدارا اب مزید موتیں نیز زبان وادب کا اور خسارہ نہیں۔

■

Dr. Mohd Qasim Ansari
Asst Prof., Dept of Urdu
Banaras Hindu University (BHU), Ajagara
Varanasi - 221005 (UP)

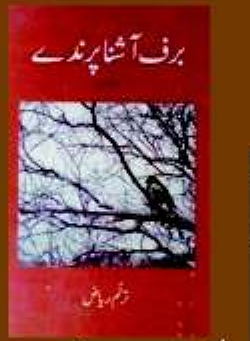

قدوس جاوید

ترنم ریاض

کشمیر کی درد آشنا

"میرا عظیم وطن، میرا کشمیر، نرم خو، حلیم اور حسین کشمیریوں کی زمین۔ دانشوروں، فنکاروں اور دستکاروں کا خطہ، ریشم وپشم، زعفران زاروں اور مرغزاروں کی سرزمین، پہاڑیوں اور وادیوں کا مسکن، یہ جنتِ بے نظیر، جس کی پانچ ہزار سالہ پرانی تاریخ موجود ہے، جس کی مثال شاید ہی دنیا میں کہیں ملے۔ قدیم ترین زبان و تہذیب کا مرکز کشمیر، رشیوں، منیوں کا کشمیر، شیخ العالم اور لل دید کا کشمیر، شاکیہ منی کی پیش گوئی کا بودھ گہوارہ کشمیر، کشیپ رشی اور پرورسین کا کشمیر، للتا دتیہ اور سویّہ کا کا کشمیر، اشوک، کنشک، کلہن، اور بڈشاہ کا کشمیر، حبہ خاتون کا کشمیر، ارنی مال کا کشمیر۔"

یہ اقتباس، اسی کشمیر کی خاک سے اٹھنے والی ایک غیر معمولی قلم کار خاتون ترنم ریاض کے ناول 'برف آشنا پرندے' سے ماخوذ ہے۔ اس اقتباس کے الفاظ، کشمیر کے تئیں ترنم ریاض کے فخر آمیز عشق اور عقیدت مندی کا مظہر ہی نہیں، اس حقیقت کا اشاریہ بھی ہے کہ 'اٹوٹ انگ' اور 'شہہ رگ' کی دو چکیوں کے بیچ پستی ہوئی کشمیری سائکی، معاشرت، سیاست اور ثقافت کے پاکیزہ منظر نامے کو لہو کی چھینٹوں سے بدنما بنانے کی کیسی کیسی کوششیں اور سازشیں کی گئیں اور صرف 'برف آشنا پرندے' ہی نہیں، کم و بیش ترنم ریاض کی ہر تحریر کسی نہ کسی زاویے سے ان کے وطن عزیز کشمیر کو لازماً مس کرتی نظر آتی ہے۔

محمد الدین فوق، چراغ حسن حسرت، پریم ناتھ پردیسی اور نور شاہ کے فکشن، اور زینب بی بی محجوب، مہجور، غلام رسول نازکی اور حکیم منظور کے شعری سرمایے کی امین ترنم ریاض کشمیر کے معروف علاقہ 'کرن نگر' میں ایک معزز گھرانے میں (9 اگست 1960) کو پیدا ہوئیں۔ اسکول اور کالج کے بعد اول تو انھوں نے کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا اور پھر کشمیر یونیورسٹی سے ہی 'ایجوکیشن' میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔ ترنم ریاض کی شادی کشمیر کے مشہور ادیب، پروفیسر ریاض پنجابی سے ہوئی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مواقع ملنے کے باوجود ترنم ریاض نے کہیں باضابطہ ملازمت نہیں کی۔ یہاں تک کہ جب ان کے شوہر مشہور سوشل سائنٹسٹ اور ادیب، J.N.U کے پروفیسر ریاض پنجابی کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر (جنوری 2008، جون 2011) مقرر ہوئے تو کئی شعبوں کی جانب سے آفر کے باوجود ترنم ریاض نے کوئی عہدہ قبول کرنا منظور نہ کیا۔ البتہ وہ کئی یونیورسٹیوں اور باوقار تعلیمی اداروں کے ساتھ 'وزٹنگ فیلو' اور 'گیسٹ پروفیسر' کے بطور وابستہ رہیں۔ 2014 میں انھیں SAARC Literary Award سے نوازا گیا۔ غالباً اس سے قبل اور بعد یہ اعزاز جموں و کشمیر کے کسی اور قلم کار کے حصے میں نہیں آیا۔ ترنم ریاض تادمِ حیات، وزارت ثقافت (حکومت ہند) کی 'سینئر فیلو' کی حیثیت سے بھی سرگرم رہیں۔ ترنم ریاض نے ہندوستان کے کئی صوبوں کے تعلیمی اور ثقافتی اداروں کے علاوہ مختلف ممالک میں 'سارک' کے کئی 'لٹریری فیسٹول' میں اجلاس کی صدارت کی اور اپنی شعری اور نثری تخلیقات بھی پیش کیں۔ 2005 میں اسلام آباد پاکستان میں منعقدہ 'ورلڈ اردو کانفرنس' میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

2010 میں کراچی پاکستان میں ہونے والے 'امن کی آشا' لٹریری فیسٹول میں بھی ترنم ریاض نے شرکت کی۔ 2011 میں انھوں نے کناڈا میں 'انڈین رائٹرس فیسٹول' میں لیکچر دیا اور کولمبیا یونیورسٹی میں اپنی شعری تخلیقات سے سامعین کو مسحور کیا۔ مرزا غالب، قرۃ العین حیدر، وارث علوی پر ان کے لیکچرس یادگار مانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسانی حقوق، تصوف، تانیثیت اور مشترکہ تہذیب کے موضوعات پر ان کے مضامین خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ترنم ریاض ایک عمدہ شاعرہ بھی تھیں اور کشمیر کی معاصر شاعرات رخسانہ جبیں اور شبنم عشائی کی طرح وہ بھی ملکی اور بین الاقوامی مشاعروں میں مدعو کی جاتی رہیں۔

ترنم ریاض کو ہندوستان، پاکستان اور کناڈا کے علاوہ قطر اور ریاض (سعودی عرب) میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ ترنم ریاض کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، مثلاً پرانی کتابوں کی خوشبو، بھادوں کے چاند، زیرِ سبزہ محو خواب وغیرہ۔ ترنم ریاض کی شاعری کے مزاج اور معیار کا اندازہ ان کی ایک غزل کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

میں درد جاگتی ہوں زخم زخم سوتی ہوں
نہنگ جس کو نگل جائے ایسا موتی ہوں
وہ میری فکر کے روزن پہ کیل جڑتا ہے
میں آگہی کے تجسس کو خون روتی ہوں
مری دعا میں نہیں معجزوں کی تاثیریں
نصیب کھولنے والی میں کون ہوتی ہوں
شجر کو دیتی ہوں پانی تو آگ اُگتا ہے
میں فصل خار کی چننے کو پھول بوتی ہوں
فضا میں پھیل گیا ہے، تری زبان کا زہر
میں سانس لینے کی دشواریوں پہ روتی ہوں

ترنم ریاض کے ادبی اعمال نامے میں تقریباً بیس تصنیفات شامل ہیں۔ ترنم ریاض نے دو ناول لکھے ہیں۔ پہلا ناول 'مورتی' کے نام سے 2004 میں شائع ہوا۔ جس میں ایک حساس (مجسمہ ساز) عورت کی نفسیاتی کشمکش اور شوہر کے رویے کے سبب 'انا' کی شکستگی کو بڑی سادگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اگر 'مورتی' کو ابتدائی تانیثی ناولوں میں شمار کیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ترنم ریاض کا دوسرا ناول 'برف آشنا پرندے' پہلی بار 2009 میں شائع ہوا اور اب تک اس ناول کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ترنم ریاض کے مختصر ناولوں کا ایک مجموعہ 2005 میں 'فریب خطائے گل' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں: یہ تنگ زمیں (1998)، ابابیلیں لوٹ آئیں گی (2002)، یمبرزل

(2004)، مرارِ رختِ سفر (2008)

اردو فکشن کے معتبر نقاد وارث علوی نے اپنی کتاب 'گنجفہ بازِ خیال' میں لکھا ہے:

''ترنم ریاض ایک غیر معمولی صلاحیت کی افسانہ نگار ہیں۔ ترنم ریاض کے یہاں اچھے افسانے اتنی وافر تعداد میں ملتے ہیں کہ ہمواری اور ثروت مندی کا احساس ہوتا ہے۔ ترنم ریاض کی ایک بڑی خوبی ان کی فن کارانہ شخصیت کی سادگی ہے۔ ان کے یہاں کوئی Artistic Pretensions نہیں، کوئی بلند بانگ دعوے نہیں، کوئی تکنیک کی طراریاں نہیں۔ کہیں نظر نہیں آتا کہ استعارے، علامتیں اور اساطیر مُنہ میں سو کینڈل پاور کا بلب لیے جلوہ افروز ہیں۔ ان کے یہاں کاوش اور کاہش کی جگہ برجستگی اور بے ساختگی ہے''۔

ترنم ریاض کے مضامین کا ایک مجموعہ بھی 'اجنبی جزیروں میں' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ ترنم ریاض ساہتیہ اکیڈمی، منسٹری آف کلچر اور ادبی سیمناروں کے لیے تنقیدی مضامین بھی لکھتی رہیں۔ ان مضامین کو انھوں نے 'چشمۂ نقشِ قدم' کے نام سے ترتیب دیا تھا، لیکن بحیثیت مجموعی میرے خیال میں ترنم ریاض کو ان کے شاہکار کشمیر مرکوز ناول 'برف آشنا پرندے' کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ برف آشنا پرندے، کشمیری سائیکی، سماج اور ثقافت کا رزمیہ ہے۔ اکیسویں صدی میں یوں تو 'نادید' (جوگندر پال)، چاندنی بیگم (قرۃ العین حیدر)، مکان (پیغام آفاقی)، مسلمان (مشرف عالم ذوقی)، اور دو یہ بانی (غضنفر) اور برف آشنا پرندے کے بعد یا ساتھ ساتھ جو کئی شاہکار ناول منظر عام پر آئے مثلاً 'اماوس میں خواب' (حسین الحق)، جہاں تیرا ہے یا میرا (عبدالصمد)، فائر ایریا (الیاس احمد گدی)، عندلیب بر شاخِ شب (شائستہ فاخری)، کہانی کوئی سناؤ متاشا (صادقہ نواب سحر)، خواب سراب (انیس اشفاق)، ندی (شموئل احمد)، بَہا کیہ جاناں میں کون' (ذکیہ مشہدی) اور شبیر احمد کے 'ہجور آما' سے لے کر محسن خان کے 'اللہ میاں کا کارخانہ' تک ایک سے بڑھ کر ایک عمدہ ناول سامنے آئے لیکن ان میں ترنم ریاض کے ناول 'برف آشنا پرندے' کا انفرادو امتیاز یہ ہے کہ اس ناول میں پہلی بار سکھ دور سے لے کر ڈوگرہ دور تک کے جبر اور صبر کے واقعات کمال فنی و جمالیاتی در و بست کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ تاریخی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی نشیب و فراز اور انتشار و بحران نے کشمیری عوام کی نفسیات، جذبات اور محسوسات پر کس قدر منفی اثرات مرتب کیے ہیں، ترنم ریاض نے اس کی تصویر کشی ناول کے کرداروں، شیبا، پروفیسر دانش، پروفیسر شہاب، نجم خان، سلیم میاں، ثریا بیگم، سیمیں، خدا بخش، سکینہ بیگم اور باب صاحب وغیرہ کے حوالے سے بڑی خوبی سے کی ہے۔ ترنم ریاض نے کشمیر کے مختلف طبقوں کے ان کرداروں کے شعور اور لاشعور میں اتر کر، لامحدود امکانات کے ساتھ جس طرح ان کا Impersonal Narration کیا ہے اس کی بنا پر برف آشنا پرندے کی موضوعی پرواز کشمیر سے شروع تو ہوتی ہے لیکن اس کا آسمان آفاقی ہے۔ اس ناول میں 'بیانیہ' کا ایسا منفرد روپ ملتا ہے جس میں کردار کی خارجی زندگی سے کہیں زیادہ داخلی زندگی کی وضاحت کی گئی ہے۔ ترنم ریاض نے کشمیر اور اہل کشمیر کے تئیں استحصالی قوتوں کے Colonial Attitude کے خلاف اہل کشمیر کی احتجاجی سوچ کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''عجب محرومی تھی اس وادی کی معصومیت اور سادگی کی، کہ کوئی دوسرے خطوں سے اور کوئی سمندر پار سے آکر اس کی قسمت کا مالک ہو جاتا تھا۔ افغانوں اور سکھوں نے اگر کوئی کسر چھوڑی تھی تو وہ ڈوگرہ راج میں پوری ہو گئی۔'' (ص 259)

آزادی سے قبل کشمیریوں پر جو مظالم ڈھائے گئے، ویسے مظالم 'ابو غریب' کے عقوبت خانوں میں امریکیوں نے عراقیوں پر بھی نہ ڈھائے ہوں گے۔ اس کا اندازہ 'گلگت بیگار' کے حوالے سے درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''...گلگت' ریاست جموں کشمیر کی آخری سرحد تھا.... جہاں بدنصیب کشمیریوں کو (بیگار کے لیے) سالم و ثابت بھیجا جاتا تھا، اور اکثر ان کے جسم کا ایک ٹکڑا یعنی 'سر' واپس آتا تھا، بہت سے سر، لاریوں میں ٹھنسے ہوئے بے شمار سر۔ بچ گئے افراد کی لاشوں کی بجائے اُن کے مجبور و مظلوم وارثوں کے حوالے ان کے عزیزوں کے 'سر' کیے جاتے تھے کہ کوئی کیوں غلام قوم کے لواحقین کی سالم لاشیں ان کے حوالے کرتا اور وہ انھیں صحیح طرح سپردِ خاک کر کے اپنے مجروح سینوں پر جدائی کی سِل رکھ لیتے۔'' (ص 261)

برف آشنا پرندے میں ترنم نے کشمیر کی تاریخ نہیں دُہرائی ہے بلکہ تاریخی حقائق کی تہوں کو کھولا ہے اور جو کچھ ہاتھ آیا ہے انھیں گرفت میں لے کر بڑی مہارت کے ساتھ ناول کے اصل موضوع کی طرف لوٹ آئی ہیں۔ لیکن ناول کے بیانیہ کو آگے بڑھانے اور اپنے نقطۂ نظر کو مستحکم کرنے کی غرض سے کشمیر کی دلدوز تاریخی جہات کو بھی مزید واضح بھی کرتی گئی ہیں:

''سن انیس سو اکتیس سے لے کر سن چھیالیس تک کشمیر کی عوامی تحریک نہ صرف برصغیر میں بلکہ عالمی سطح پر بھی تسلیم کر لی گئی تھی۔'' (ص 260)

''اس تاریخی حقیقت سے چشم پوشی کی جاتی ہے کہ جب سرحدوں پر قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا، وادی کشمیر پُر سکون تھی، غیر مسلم اقلیتیں، مسلم اکثریت کے حفظ و امان میں شادماں تھی۔ پوری وادی میں لوگ ٹولیاں بنا بنا کر عوام کو صبر و تحمل کی تلقین کر رہے تھے۔

حملہ آور خبردار، ہم کشمیری ہیں تیار

شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد۔'' (ص 272)

ترنم ریاض اردو اور ہندی ادبیات کے علاوہ مغربی ادبیات کے بھی جدید ترین تخلیقی رویوں، رجحانات اور نظریات کا گہرا شعور رکھتی تھیں۔ اسی لیے ان کی تخلیقات میں، خواہ وہ شاعری ہو یا افسانہ، ناول ہو یا سماجی یا تنقیدی مضامین، ہر جگہ ان کی فکریات، اظہار و بیان اور اصناف کے فنی و جمالیاتی تقاضوں کے برتاؤ میں اجتہاد اور آزادہ روی کے عناصر کا غلبہ نظر آتا ہے۔ دراصل ترنم ریاض کے ادبی سفر کا زمانہ 1980 کے آس پاس سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو میں سوسیئر کے نظریۂ لسان اور رولاں بارتھ اور دریدا کے ساختیات، پس ساختیات اور ردِ تشکیل وغیرہ نظریات کے زیر اثر جدیدیت کا رجحان مجہول اور مابعد جدید تصور مضبوط و مستحکم ہو رہا تھا۔ عالمی سطح پر تخلیقی اور تنقیدی ادب میں داخلی اور خارجی ہر اعتبار سے اجتہاد اور تجربہ پسندی کا رجحان عام ہو رہا تھا۔ خاص طور پر گیبریل گارسیا مارکیز کے ناول 'تنہائی کے سو سال' کی مقبولیت، اور روسی ہیئت پسندوں جیکوبسن اور شکلووسکی کے علاوہ جولیا کرسٹیوا وغیرہ کے 'ادب میں زبان کی کارکردگی' اور 'ادب کی ادبیت' جیسے نظریات کی مقبولیت کے بعد عالمی سطح پر (تخلیقی اور تنقیدی) ادب میں تعمیری اور انسان دوست بصیرت مندی کو برتنے کا جو رجحان عام ہوا، اردو میں اس کی عمدہ مثالیں قرۃ العین حیدر اور لالی چودھری کے بعد ترنم ریاض کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ اگر برف آشنا پرندے اور ترنم ریاض کی دیگر تخلیقات کی بھی سنجیدہ قرأت کی جائے تو ادب عالیہ سے متعلق یہ بات درست معلوم ہوگی کہ کسی بھی فن کار کے فن کے انفراد اور اعتبار کا ایک جواز یہ بھی ہوتا ہے کہ جس معاشرے اور ثقافت کے حوالے سے اس فن کار کا فن پارہ (ناول، افسانہ، نظم یا شعر) لکھا گیا ہے، اس معاشرے کی سائیکی اور ثقافت کی 'تعمیر نو' کے امکانات بھی اس فن پارے میں موجود ہوں۔ اس اعتبار سے بحیثیت مجموعی ترنم ریاض کا فن (فکشن، شاعری اور مضامین) کشمیری سائیکی کا بے باک ترجمان تو ہے ہی، ساتھ ہی فکری اعتبار سے اہل کشمیر/ قارئین کو، کشمیر کی 'تعمیر نو' کے امکانات سے رُوبرو کرنے کی کامیاب کوشش سے بھی عبارت ہے۔

■

Quddus Javed
Ex. Head Dept of Urdu
Kashmir University- 190006 (J&K)
Mob.:9419010472

ناصرالدین انصار

شگفتہ مزاج نقاد

ڈاکٹر صفدر

علاقہ وِدربھ کے جدید شاعر، معروف نقاد اور طنز و مزاح نگار ڈاکٹر صفدر 26 اپریل 2021 کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کا شمار اردو کے معروف ترین ادبا میں ہوتا تھا۔ حال ہی میں ماہنامہ 'اردو دنیا' میں حسن بشیر مرحوم پر لکھا ان کا خاکہ شائع ہوا تھا۔ آج ایک مہینے کی قلیل مدت کے بعد انھیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان سے وابستہ بہت سی یادیں ہیں۔ میں نے ان کی زندگی ہی میں ان کی یادوں کا ایک کولاژ تیار کیا تھا، کاش یہ ان کی حیات ہی میں شائع ہو جاتا تو انھیں بڑی خوشی ملتی مگر موت سے کس کو مفر ہے۔ وہ اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ گئے لیکن اپنے پیچھے بہت سی یادوں کا قیمتی سرمایہ چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر صفدر بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ میں نے انھیں کبھی غمگین اور فکر مند نہیں دیکھا۔ جب تک وہ خاموش ہوتے ہیں نہایت سنجیدہ اور متین نظر آتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی گفتگو شروع کرتے ہیں بلبل ہزار داستاں معلوم ہوتے ہیں۔ شگفتہ مزاجی ان کی شخصیت کا خاص وصف ہے۔ وہ جس جگہ جاتے ہیں شگفتگی بکھیر دیتے ہیں۔ موصوف مجلسی گفتگو کے آداب سے خوب واقف ہیں۔ وہ باتیں کیا کرتے ہیں پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں۔ سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی ان کی محفل میں زیرِ لب مسکراہٹ سے لے کر قہقہے تک پہنچ جاتا ہے۔ شگفتگی کے ساتھ حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور برجستگی ان کی شخصیت کے خاص جوہر ہیں۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے کے ہنر سے خوب واقف ہیں۔ پھر ترکی بہ ترکی جواب تو ان کو خوب سوجھتا ہے۔ وہ نہ تو کبھی جواب دینے سے چوکتے ہیں اور نہ ہی ان کا نشانہ خطا ہوتا ہے۔ خاکسار نے ان کی طبیعت کے تمام رنگ دیکھے ہیں۔ لہٰذا ان کی ذات سے متعلق اتنے واقعات، لطائف اور ظرائف ہیں جن کو بیان کرنے بیٹھوں تو بقول شخصے سویرا ہو جائے۔

ڈاکٹر صفدر کی شگفتگیِ طبع سے مکمل طور پر مستفیض ہونے کے لیے ان کی صحبت اختیار کرنا یا ان کے ساتھ سفر کرنا ضروری ہے۔ ان کے ہم وطن خلش تسکینی کا شعر ہے۔

فاصلے کیسے سمٹتے ہیں یہ میں بھی جانوں
تم کسی وقت مرے ساتھ سفر میں رہنا

صفدر صاحب اس شعر کی عملی تعبیر ہیں۔ ان کے ساتھ سفر میں وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کی خوش گوئی اور بذلہ سنجی سفر کی طوالت کو کم کر دیتی ہے۔ اللہ کے فضل

ڈاکٹر صفدر بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ میں نے انہیں کبھی غمگین اور فکر مند نہیں دیکھا جب تک وہ خاموش ہوتے ہیں نہایت سنجیدہ اور متین نظر آتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی گفتگو شروع کرتے ہیں بلبل ہزار داستاں معلوم ہوتے ہیں۔ شگفتہ مزاجی ان کی شخصیت کا خاص وصف ہے۔ وہ جس جگہ جاتے ہیں شگفتگی بکھیر دیتے ہیں۔

سے مجھے مسلسل اس ہم سفری کے مواقع حاصل ہیں۔ انھیں ٹرین میں جب بھی اوپر کا برتھ ملتا ہے وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ اگر چہ میں ہر بار جگاڑ کر کے انھیں لوور برتھ دلا دیتا ہوں۔ برتھ ملنے پر بھی ان کا تجسس ختم نہیں ہوتا۔ سرگوشی کے انداز میں پوچھتے ہیں۔'' ناصر صاحب! خوب جمایا! جلد منوالیا۔'' میں جواب دیتا ہوں۔ وہ صاحب تو باتوں ہی سے رام ہوگئے ورنہ میرے پاس تو آخری

ڈاکٹر صفدر جدید شاعر و نقاد ہیں اور شاید دنیا بھر میں جدیدیت کے سب سے بڑے موید بھی۔ وہ جدیدیت کی تحریک کو اردو زبان کی سب سے توانا تحریک سمجھتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے جدید ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ جدید قلمکاروں کے فنی محاسن بیان کرتے ہوئے رطب اللسان ہوتے ہیں۔ جدید تخلیقات کی گرہ کشائی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس طرح انہیں پھر فاروقی نوازی کا موقع مل جاتا ہے۔ ان کا مطالعہ واقعتاً بہت وسیع ہے اور ادب فہمی اور شعر فہمی کا ذوق بھی اعلیٰ ہے۔ وہ جدیدیت کے ضمنی رجحان 'تخلیقیت پسندی' کے بھی موید رہے ہیں۔

ہتھیار کے طور پر منور رانا کا لطیفہ بھی ہے۔ ایک دن اصرار کر کے مجھ سے منور رانا کا لطیفہ پوچھ ہی لیا۔ میں نے کہا۔ ایک بار لکھنؤ سے دہلی کے سفر کے دوران منور رانا کو اوپر کا برتھ ملا۔ انھیں اپنے 110 کلو وزن کے ساتھ اوپر چڑھنا محال نظر آیا تو انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی یحییٰ سے لوور برتھ کی خواہش ظاہر کی۔ یحییٰ نے لوور برتھ پر بیٹھے ایک صاحب سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا اور منور رانا کو خدا حافظ کہتے ہوئے کہا کہ بھائی جان! اطمینان رکھیے! آپ کا کام ہو جائے گا۔ جب رات دس بجے منور رانا اپنا بستر لگانے لگے تو لوور برتھ والے صاحب نے انھیں اپنا برتھ آفر کرتے ہوئے نیچے سو جانے کا کہا۔ منور رانا نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا بستر لگانا جاری رکھا۔ اب کی بار اس شخص نے منور رانا کے پیر پکڑ لیے اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ بھائی صاحب! آپ سے وِنتی ہے کہ آپ نیچے سو جائیے! آپ کے بھائی نے مجھے بتادیا ہے کہ آپ کو نیند میں پیشاب نکل جاتا ہے... اب جب بھی میں انھیں لوور برتھ دلاتا ہوں۔ صفدر صاحب جھٹ پوچھ لیتے ہیں۔ منور رانا کا لطیفہ تو نہیں سنایا!

صفدر صاحب معروف نقاد شمس الرحمن فاروقی کے انتہائی قدر شناس، عقیدت مند اور مداح ہیں۔ فاروقی کو وہ امام العصر ہی نہیں، اردو تاریخ کا سب سے بڑا ادیب و نقاد سمجھتے ہیں۔ فاروقی کی مدافعت میں وہ ہر محاذ پر سینہ سپر نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں خاکسار کی ان سے بڑی دلچسپ بحثیں بھی ہوئی ہیں۔ ایک طرف میں مولانا شبلی کی علمی فتوحات پیش کرتا تو دوسری طرف وہ فاروقی کے کارنامے گنواتے۔ میں جب زور دے کر کہتا کہ شبلی کے مقابلے فاروقی کے سامنے اردو تنقید کی ایک مستحکم روایت رہی ہے۔ انھیں دنیا بھر کے ادب اور ادبی رجحانات سے استفادے کے راست مواقع ملے ہیں۔ انھیں جدید ٹکنالوجی کا سہارا بھی حاصل ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ شبلی کے مقابلے عمر نے ان سے وفا کی ہے... تو میرے ان دلائل کے بعد وقتی طور پر تو وہ خاموش ہو جاتے مگر فاروقی کی عقیدت سے منحرف نہیں ہوتے۔ ان کی فاروقی پرستی پر ہمارے ایک مشترک دوست نے خوب جملہ کسا ہے۔'' صفدر صاحب ایسے سلفی ہیں جو فاروقی کے مرید ہیں۔''

ڈاکٹر صفدر جدید شاعر و نقاد ہیں اور شاید دنیا بھر میں جدیدیت کے سب سے بڑے موید بھی۔ وہ جدیدیت کی تحریک کو اردو زبان کی سب سے توانا تحریک سمجھتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے جدید ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ جدید قلمکاروں کے فنی محاسن بیان کرتے ہوئے رطب اللسان ہوتے ہیں۔ جدید تخلیقات کی گرہ کشائی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس طرح انھیں پھر فاروقی نوازی کا موقع مل جاتا ہے۔ ان کا مطالعہ واقعتاً بہت وسیع ہے اور ادب فہمی اور شعر فہمی کا ذوق بھی اعلیٰ ہے۔ وہ جدیدیت کے ضمنی رجحان 'تخلیقیت پسندی' کے بھی موید رہے ہیں۔ اس کا انھیں راست فائدہ یہ ہوا کہ ان کے اندر زبان کا اعلیٰ درک پیدا ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی برجستہ گوئی میں بھی زبان کا حسن اور تخلیقیت موجود ہوتی ہے۔ ہمارے عہد میں جس طرح مشفق خواجہ نے تحقیق کی خشکی کے ساتھ طنز و مزاح کی شگفتگی کو نبھایا ہے، صفدر صاحب کے یہاں بھی تنقید کی کسوٹی اور ظرافت کی چاشنی ساتھ ساتھ ملتی ہے۔

ڈاکٹر صفدر متعدد خوبیوں کے مالک ہیں۔ انھیں حسن سیرت بڑی فراوانی سے ودیعت کی گئی ہے۔ وہ صورت، سیرت، چال ڈھال، وضع قطع اور نشست و برخاست میں اسلامی شرافت اور مشرقی تہذیب و تمدن کا نمونہ نظر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی اہم خوبی ان کی راست فکر ہے۔ وہ سر سے پیر تک اور دل سے نگاہ تک مومن ہیں۔ طبیعت میں سادگی اور مزاج میں انکسار ہے۔ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ مسلکاً سلفی ہیں۔ غالب کے بارے میں مشہور ہے کہ گرفتاری کے وقت انگریز افسر نے ان کا مذہب اور مسلک پوچھا تو غالب نے خود کو آدھا مسلمان کہا تھا۔ وجہ یہ بتائی تھی کہ وہ شراب پیتے ہیں لیکن سور نہیں کھاتے۔ صفدر صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے میں بھی جمع بین الصلواۃ کا فائدہ اٹھاتا ہوں۔ اس طرح مسلکاً نہیں تو کم از کم عملاً تو میں بھی آدھا سلفی ہو جاتا ہوں۔

علم و آگہی اور اخلاق و کردار کی دولت حاصل ہونے کے باوجود صفدر صاحب کے معمولات میں کچھ باتیں ان کے ملاقاتیوں کو قدرے تعجب خیز معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ہر ملنے والے سے اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ انھیں شعر و ادب کی دنیا میں نظر انداز کیا گیا ہے اور ان کے کام کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی ہے۔ میں انھیں بارہا تسلی دیتا ہوں کہ آپ کی جو کچھ پذیرائی ہوئی ہے اسے غنیمت جان کر اللہ کا شکر ادا کیجیے۔ یہ پروپگنڈے کا عہد ہے اور اس میں آپ جیسے کم آمیز شخص کو ریاستی سطح ہی کے موقر انعامات کا مل جانا کسی معجزے سے کم نہیں۔ لیکن اس پر ان کی تشفی نہیں ہوتی۔ شہرت و ناموری کی شدید خواہش انھیں اندر سے مسلسل کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ چاہے جتنے بڑے قلمکار ہوں، جب تک آپ اپنی بات دوسروں تک نہیں پہنچاتے، تب تک لوگ آپ کے نام اور کام سے واقف نہیں ہوتے۔ پھر اس کے لیے آپ کو سو جتن بھی کرنے پڑتے ہیں۔ اس طرح کی تمام تکڑم سے صفدر صاحب واقف نہیں۔ لہٰذا ان کے کام کی حسب خواہش شہرت نہ ہونے میں ان کے مزاج اور طبیعت کو بھی دخل ہے۔ خوش قسمتی سے انھیں ایسے احباب میسر آئے ہیں جو ان کے مضامین کو مسلسل شائع کروانے کا بندوبست

"علم و آگہی اور اخلاق و کردار کی دولت حاصل ہونے کے باوجود صفدر صاحب کے معمولات میں کچھ باتیں ان کے ملاقاتیوں کو قدرے تعجب خیز معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ہر ملنے والے سے اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ انہیں شعر و ادب کی دنیا میں نظر انداز کیا گیا ہے اور ان کے کام کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی ہے۔"

لعل و گہر

کرتے ہیں۔ ورنہ ادبی دنیا میں انھیں جو کچھ شناخت حاصل ہے عین ممکن ہے وہ بھی نہ ہوتی۔ اس میں ان کے شاگر رشید ڈاکٹر محمد اسد اللہ کا نہایت اہم کردار ہے۔

انا کا اظہار ہر فنکار اور قلمکار میں ہوتا ہے۔ بعض موقعوں صفدر صاحب کے اندر کا قلمکار ان کی شخصیت کے دیگر اوصاف پر غالب آجاتا ہے۔ ایک مرتبہ احباب کی محفل میں ڈاکٹر محبوب راہی نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''صفدر صاحب! عام طور پر لوگ آپ کو نہیں جانتے!'' یہ سننا تھا کہ صفدر صاحب آگ بگولہ ہوگئے۔ ''کیا کہا؟ لوگ نہیں جانتے! کون نہیں جانتے! میں پان ٹپری اور چائے خانے والوں کے لیے تھوڑے ہی لکھتا ہوں' مجھے وارث علوی جانتے ہیں' فاروقی جانتے ہیں' وزیر آغا جانتے ہیں... !!۔ یہی میرے لیے کافی ہے۔'' جیسے تیسے اس قضیہ نامرضیہ کو ختم کیا گیا۔

میری ان سے مسلسل اور طویل ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہر ملاقات میں علم و ہنر کے موتیوں کے ساتھ شکایات کے کنکر پتھر بھی ہاتھ آتے ہیں۔ جب میں ان سے کہتا ہوں آج فلاں فلاں ادیب اور شاعر کا فون آیا تھا تو جواب دیتے ہیں آپ کو سب لوگ فون کرتے ہیں۔ ہمیں تو کوئی فون ہی نہیں کرتا۔ ہمیں دوست بنانے کا ہنر آج تک نہ آسکا۔ میں جب کہتا ہوں کہ لوگوں سے آپ کے تعلقات کی نوعیت آپ کے مزاج اور طبیعت پر منحصر ہوتی ہے۔ آپ کبھی سوشل نہیں رہے۔ آپ نے کبھی کسی سے دوستی کرنے میں بھی تو پہل نہیں کی۔ یہاں تک کہ اپنے پیر و مرشد فاروقی سے بھی آپ مسلسل ربط میں نہ رہے۔ تو اس پر وہ خاموش ہوجاتے ہیں اور شعر و ادب کی کوئی دوسری بات چھیڑ دیتے ہیں۔ ان معمولی کوتاہیوں کے باوجود وہ دوسروں کے جذبات کو مجروح نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ اپنے مخاطب کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔

میری ان سے مسلسل اور طویل ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہر ملاقات میں علم و ہنر کے موتیوں کے ساتھ شکایات کے کنکرپتھر بھی ہاتھ آتے ہیں۔ جب میں ان سے کہتا ہوں آج فلاں فلاں ادیب اورشاعر کا فون آیا تھا تو جواب دیتے ہیں آپ کو سب لوگ فون کرتے ہیں۔ ہمیں تو کوئی فون ہی نہیں کرتا۔ ہمیں دوست بنا نے کا ہنر آج تک نہ آسکا۔ میں جب کہتا ہوں کہ لوگوں سے آپ کے تعلقات کی نوعیت آپ کے مزاج اورطبیعت پر منحصر ہوتی ہے۔

اردو میں ظرافت کو خالصتاً مزاح اور تفریح طبع کے معنوں میں اپنا لیا گیا ہے۔ ورنہ لفظ ظرافت اپنی بنیاد میں دانائی' ذہانت اور عقل مندی کا مفہوم رکھتا ہے۔ دراصل 'حس مزاح' کے لیے اعلیٰ درجے کی ذہانت' فکری بالیدگی اور زبردست قوتِ مشاہدہ درکار ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صفدر قابل رشک 'حس مزاح' کے مالک ہیں۔ نجانے کیسے ان کی شگفتہ طبعی پر تنقید کی خشکی اور سکہ بندی نے مدتوں قبضہ کیے رکھا، یہاں تک کہ مزاح ان کی ادبی حیثیت کا ثانوی روپ بن گیا۔ درحقیقت زندگی کی تلخیوں' ناہمواریوں اور اپنے پرایوں کی نوازشات کے بعد ہی تخلیق کار اس قابل ہوتا ہے کہ وہ مزاح لکھے۔ مزاح نگار زندگی کے کرب کو اپنے دل میں سمو کر اپنے مخاطب کی خوشی اور دل جمعی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

ڈاکٹر صفدر قابل رشک 'حس مزاح' کے مالک ہیں۔ نجانے کیسے ان کی شگفتہ طبعی پر تنقید کی خشکی اور سکہ بندی نے مدتوں قبضہ کیے رکھا۔ یہاں تک کہ مزاح ان کی ادبی حیثیت کا ثانوی روپ بن گیا۔ در حقیقت زندگی کی تلخیوں ' نا ہمواریوں اور اپنے پرایوں کی نوازشات کے بعد ہی تخلیق کار اس قابل ہوتا ہے کہ وہ مزاح لکھے۔

شگفتہ لوگ بھی ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں اندر سے
بہت روتے ہیں وہ جن کو لطیفے یاد ہوتے ہیں

ڈاکٹر صفدر نے ان تمام ناہمواریوں اور کرب کو عملاً جھیلا ہے۔ وہ زندگی کی تنگ و تار راہوں سے رقص کرتے ہوئے گزرے ہیں۔ تب جاکر ان کے قلم میں یہ شگفتگی آئی ہے۔

ہمارے لہجے میں یہ توازن بڑی صعوبت کے بعد آیا
کئی مزاجوں کے دشت دیکھے کئی رویوں کی خاک چھانی

عام طور پر ایک طربیے کا اختتام المیے پر ہوتا ہے۔ طربیے کی نشاط آفرینی، زمزمہ سنجی اور واہ واہی میں سسکیوں کی صدا کون سنتا ہے۔ ڈاکٹر صفدر اپنے والد کو پہچان پانے کی عمر سے پہلے ہی یتیم ہوگئے تھے۔ نانا کے گھر پرورش، حالات کی کسمپرسی، مفلسی و ناداری اور تلخی دوراں نے انھیں بچپن ہی سے بجھا کے رکھ دیا تھا۔ پھر ایک خانگی ادارے میں ملازمت نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ برار میں کسی خانگی ادارے میں ملازمت کے لیے امیدوار سر کے بل جاتا ہے۔ وہاں وہ آئے دن عزت نفس کا سودا کرتا ہے اور نتیجتاً کرب لے کر لوٹتا ہے۔ یہ المیہ تقریباً ہر خانگی ادارے کے ملازم کا مقدر ہوتا ہے۔ اب ذرا یہ منظر بھی دیکھ لیجیے۔ دو در ہے پاس اسکول چیرمین صاحب کرسی پر جلوہ افروز ہیں اور چھے کتابوں کا مصنف ان کے سامنے ہاتھ باندھے باادب کھڑا ہے۔ وہ دھیمی آواز اور گزارش کے لہجے میں کچھ عرض کرتا ہے۔ اس پر چیرمین صاحب خالص براری لہجے میں گویا ہوتے ہیں۔ ''تم نے جو وٹ وا پرے وہ اردو نہیں ہے۔'' (تم نے جو الفاظ استعمال کیے وہ اردو نہیں ہیں۔) اس پر اردو کا یہ نقاد جس کی زبان اور اسلوب کو وارث علوی جیسے جغادری عالم کی پسندیدگی حاصل تھی۔ ''جی سر'' کہہ کے رہ جاتا ہے۔ یہ ایک سانحہ ڈاکٹر صفدر کے توسط سے ان تمام ملازمین کی بپتا بیان کرتا ہے جو خانگی اداروں میں ملازمت کرتے ہیں۔ بچپن سے لے کر ملازمت تک کے حالاتِ زندگی نے ڈاکٹر صفدر کو توڑ کے رکھ دیا تھا۔

وہ اپنی زندگی کو انجوائے نہ کرسکے۔ نتیجتاً یہی کرب ان کے یہاں تخلیقیت کے مراحل سے گزر کر خوش گفتاری میں تبدیل ہوگیا۔ پھر ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انھیں فراغت اور آسودگی میسر نہ ہوسکی۔ آج بھی گھر کے پندرہ افراد کا 'ٹبر' انھیں اپنی پنشن کے سہارے کھینچنا پڑتا ہے۔ اگر ان کے معاشی حالات بہتر ہوتے اور انھیں آذوقہ حیات کی کشادگی نصیب ہوتی تو عین ممکن تھا کہ عمر کے اس پڑاؤ پر وہ طویل سفر کر کے بال بھارتی نہ آتے۔ رات کے دو بجے ہیں، سردی اپنے شباب پر ہے۔ ٹکٹ کنفرم نہ ہو سکا۔ گاڑی تبدیل کرنی ہے۔ بھساول اسٹیشن پر ایک بہتر سالہ شخص اپنا بیگ اٹھائے میرے پیچھے پیچھے ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ خوددار اتنا کہ اپنا بیگ خود اٹھانے پر بضد ہے اور مسابقت کا جذبہ ایسا کہ میرے قدم سے قدم ملا کر دوڑنا تک گوارا ہے۔

ہم دوہری اذیت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی ہیں شل ذوق سفر بھی نہیں جاتا

■

Dr. Nasiruddin Ansar
Near Baga House, Jameel Colony
Walgaon Road
Amravati - 444601 (MS)

فکرو احساس کا شاعر
نیر سلطانپوری

نشاں زیدی

نیر سلطانپوری (4راکتوبر 1908 - 15راگست 1985) کا شماران شخصیات میں ہوتا ہے، جنھوں نے ایک مدت تک اردو ادب کی خدمت کی۔ انھوں نے نہ صرف اردو غزل کے گیسوسنوارے بلکہ عمدہ نظمیں بھی لکھیں اور نعت و منقبت لکھ کر دربار رسالتؐ میں اپنی حاضری بھی درج کرائی۔ علاوہ ازیں ایک صحافی کی حیثیت سے بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ سرفراز پریس لکھنؤ سے 1930 سے 1938 تک وابستہ رہے۔ 1940 میں ایک ادبی ماہ نامہ 'فردوس' کے نام سے لکھنؤ سے نکالا جو کئی برس تک ادبی حلقہ میں مقبول رہا۔ اس کے بعد 1959 میں 'شمع ادب' کا اجرا عمل میں آیا یہ رسالہ نیر سلطانپوری کی ادارت میں ان کے وطن سلطانپور سے شائع ہوتا تھا، جو چودہ سال 1972 تک شائع ہوتا رہا اور ہندوستان کے مختلف گوشوں میں مشہور ومعروف ہوا۔ 1975 میں حمد ونعت ومنقبت کا مجموعہ 'انوارعرفان' اور 1985 میں غزل اور نظم کے مجموعے 'ریزۂ مینا' کی اشاعت عمل میں آئی۔ 'ریزۂ مینا' میں غزلیں حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کی گئی ہیں۔

نیر سلطانپوری نے اپنی شاعری میں اپنی تہذیب واقدار کو زندہ رکھا ہے۔ ان کی شاعری میں ماضی سے لگاؤ بھی ہے، حال سے وابستگی بھی ہے اور روشن مستقبل کے خواب بھی ہیں۔ ان کے اشعار میں فطری حسن ہے، جس سے ان کی شاعری میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل نیر سلطانپوری کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''نیر سلطانپوری دراصل فطری شاعر ہیں۔ وہ جذبات کی باز آفرینی ہی کو اصل شاعری سمجھتے ہیں، جو ان کے تجربات عشق کے بیچ وبن میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ عشقیہ شاعری میں منطقی تعمیر اور تعبیر کی تلاش احساسات کی ان لہروں کو اسیر نہیں کرسکتی جس سے شاعر گزرتا ہے۔ اس لیے شاعر کے محسوسات ہی کو عشقیہ شاعری میں اہمیت ہوتی ہے۔ نیر صاحب کے محسوسات قاری کے ساتھ متحرک رہتے ہیں اور ان کی شاعری کا کلاسیکی انداز۔ قاری کو اپنی گرفت میں لیے رہتا ہے۔'' (ریزۂ مینا از نیر سلطان پوری، ص 5)

نیر سلطانپوری کی شاعری میں ماضی کی حسین وادیوں کی خوشبو کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں کلاسکی شعرا جیسا رنگ تغزل ہے، وہیں احساس میں وہ خوشبو محسوس ہوتی ہے، جس کا تعلق ماضی کی دلکش ہواؤں سے ہے اور یہ ہوائیں قاری کے دل و دماغ میں توانائی پیدا کرتی ہیں۔

جو دور میں تھا کل وہی ساغر اٹھائیے
ماضی کو بھی شریک تمنا بنائیے
شعروادب ہے آج نقاہت سے جاں بلب
ماضی کا خوں ملے تو رگوں میں چڑھائیے

نیر صاحب نے جہاں ماضی کی یاد تازہ کی ہے وہیں تابناک مستقبل کے خواب بھی دیکھے ہیں۔ ان کا دل عصری کرب سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ وہ روشن مستقبل کی تمنا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حال کے اندھیروں سے گھبراتے نہیں ہیں بلکہ ستاروں سے شعور لے کر حوصلے کے ساتھ تقدیر بدلنے کی بات کرتے ہیں۔

مری خاکستر دل سے بنا لو آفتاب نو
نہ ظلمت کاٹ پائے گی سحر کی روشنی تنہا
شعور ربط باہم بھی ستاروں سے اگر لیلے
بدل سکتا ہے تقدیر جہاں ہر آدمی تنہا
نہ جب تک ہم سفر ہوں گے خلوص وعزم مستحکم
تمنا طے نہ کرپائے گی راہ عاشقی تنہا

شاعر کی انا اس کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہے۔ اپنی خودداری اور انا اس کو بہت ہی عزیز ہوتی ہے۔ نیر سلطانپوری جھوٹی شہرت کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ زمانے کی بدلتی ہوئی فضا کو وہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ ان کو اس بات کا گلہ نہیں ہے کہ زمانے میں تیزی سے تبدیلی ہورہی ہے بلکہ ان کو یہ احساس کچوکے دے رہا ہے کہ بدلتے زمانے کے ساتھ انسان خاموش ہے۔ ہر طرح کے ظلم وجبر کو دیکھ رہا ہے لیکن ایک چپی سادھے ہوئے ہے۔ سب کو اپنی اپنی فکر ہے۔

بدلی تھی گلستاں کی ہوا کوئی نہ بولا
ہر گل نے سنی میری صدا کوئی نہ بولا
کی چرخ نے جب ہم پہ جفا کوئی نہ بولا
تاروں نے سنی میری نوا کوئی نہ بولا
جس وقت فغاں میری صنم خانوں میں پہنچی
کہنے کو ہراک بت تھا خدا کوئی نہ بولا
جب دل کی گرہ کھلنے کی بات آگئی نیر
بنتے تھے سبھی عقدہ کشا کوئی نہ بولا

نیر سلطانپوری کے اشعار میں سیاسی اور سماجی شعور کا حسین امتزاج بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے منفرد تخلیقی زاویوں کے سبب اپنی شاعری کا وسیع کینوس تعمیر کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مزاحمتی آہنگ بھی ہے اور رومانی جذبہ واحساس بھی۔

شورش انقلاب بھی نعرۂ احتجاج بھی
مانگ رہے ہیں بادہ کش کل کی شراب آج بھی
گم ہوں تغیرات میں قید قفس کو چھوڑ کر
بدلے ہوئے دیار بھی بدلے ہوئے مزاج بھی
جب سے ہوائیں دہر کی مائل انقلاب ہیں
نیر حق پرست کا ملتا نہیں مزاج بھی

نیر سلطانپوری کی شاعری میں حقیقی دنیا ہے وہ گل و بلبل کے فرسودہ قصے بیان نہیں کرتے اور نہ ہی محبوب کی تعریف میں آسمان سے ستارے توڑنے کی بات کرتے ہیں اور نہ ہی محبوب کی روایتی ستم گاریوں کو اپنی شاعری میں سموتے ہیں۔ وہ سماج میں بکھری ہوئی زندگی اور مسائل پر غور کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں ایک حقیقت ہے ایک مقصد ہے جو قاری کو دیر تک سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

اک عجیب حیرت ہے یہ جبیں کہاں رکھ دیں
ہر صنم کے چہرے پر داوری جھلکتی ہے
ساتھ ہم زمانے کے کس طرح چلیں نیر
چال سے زمانے کی کجروی جھلکتی ہے

ان کی شاعری میں ایک حوصلہ ہے ایک عزم ہے جس پر ان کو نہ صرف فخر ہے بلکہ پورا یقین بھی ہے، کہ حالات چاہے کتنے بدتر ہوں، ہوائیں کتنی بھی مخالف سمت میں چلیں ان کے قدم لڑکھڑائیں گے نہیں بلکہ وہ اپنی منزل پا کر ہی رہیں گے۔

نقش قدم مٹائیں گے نقش جبیں بنائیں گے
ہم ترے اعتبار کو اور حسیں بنائیں گے
تاروں سے لے کے اضطراب شمس وقمر سے انقلاب
جس پہ فلک بھی جھوم جائے ایسی زمیں بنائیں گے

ان کے یہاں سماجی حالات پر تبصرہ بھی ہے، زمانے کی سیاست کا رنگ بھی ہے۔وہ زمانے کی بے راہ روی پر طنز کے نشتر بھی لگاتے ہیں اور زمانے کی مکاری و ناانصافی کا شکوہ بھی کرتے ہیں لیکن ایک صحت مند معاشرے کا خواب بھی دیکھتے ہیں۔

عظمت قوم کا احساس جگا لیں تو چلیں
آج روٹھے ہوئے ماضی کو منا لیں تو چلیں
جن کے پھولوں کی مہک حشر تک عالم میں رہے
مادر ہند کو وہ ہار پہنا لیں تو چلیں
اب تو منزل پہ پہنچنا ہے اندھیرا ہی سہی
شمع ہر گام پہ دانش کی جلالیں تو چلیں

یہ دنیا ایک سرائے کے مانند ہے یہاں کس کو کتنا وقت گزارنا ہے کچھ نہیں پتہ۔لیکن اس حقیقت کو جاننے کے باوجود انسان انتظام اس طرح کرتا ہے کہ جیسے اسے اس دنیا ہی میں رہنا ہے۔دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کو مختلف شعرا نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے مثال کے طور پر خدائے سخن میر تقی میر کا یہ شعر ہے۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

مرزا غالب نے دنیا کی ناپائیداری کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اسی طرح حیرت الہ آبادی اس مضمون کو اس طرح باندھتے ہیں۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

ان کے علاوہ بھی بہت سے شعرا نے اس موضوع کو مؤثر انداز میں برتا ہے۔نیر سلطانپوری نے زندگی کی بے ثباتی کے تئیں اپنے خیالات کا اظہار اچھوتے انداز میں کیا ہے۔ساتھ ہی انگریزی کے الفاظ کو بھی خوبصورتی سے اشعار میں پرو دیا ہے۔

کہتے ہیں عرف عام میں سب جس کو زندگی
وہ ہے عدم سے ہستی میں آنے کا پاسپورٹ
ویزا ہے کتنے دن کا کوئی جانتا نہیں
یہ موت کے فرشتے کی ہے ڈائری میں نوٹ
وہ جس کو عرف عام میں سب موت کہتے ہیں
ویزا کے ختم ہونے کی ہے آخری رپورٹ
کہتے ہیں جس کو قبر وہ ہے سرحد عدم
اس بارڈر پہ ہوتا ہے چیک سب کا پاس پورٹ
حکم خدا کے سانچے میں ایماں ڈھلے بغیر
نیر شافع حشر کا ممکن نہیں سپورٹ

شاعری زندگی کی عکاس ہوتی ہے۔نیر سلطانپوری کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت میں سادگی، وضع داری اور اس کا رکھ رکھاؤ بدرجہ اتم موجود ہے یہی اظہار ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ان کی شاعری ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔انھوں نے کائنات کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور اپنے جذبات کو شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ انھیں سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کا شدت سے احساس ہے انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ سماج میں ایسے افراد بہت ہیں جو مساوات اور انصاف کے جھوٹے دعوے کرتے ہیں۔لیکن جہاں بات عمل کی آتی ہے تو کوئی نہیں بولتا۔نیر سلطانپوری عوام کے استحصال نابرابری، حق تلفی اور انصاف کشی کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور معاشرے میں امن وامان کی گہار ناخدائے قوم سے اس طرح لگاتے ہیں۔

لائیے سب کو خدارا ایک مرکز کی طرف
منتشر ہے دیکھیے شیرازۂ قومی تمام
کیجیے کچھ کام آخر آپ ہیں اک رکن قوم
ذی اثر ذی مرتبہ ذی حیثیت ذی احترام
جھومتی ہے ایک دنیا آپ کی تقریر پر
مانتی ہے بزم ملت آپ کا زور کلام
ایک میدان عمل پنڈال سے باہر بھی ہے
اس میں بھی سرگرمیاں دکھلائیے عالی مقام

جس طرح ایک مصور اپنے احساس کے مختلف رنگ صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر ایک تصویر بناتا ہے اسی طرح ایک شاعر بھی اپنے قلم کی جولانیوں سے اپنے احساس کو شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔نیر سلطانپوری کی شاعری بھی تخلیقی فکر و احساس کی زندگی کی ضمانت ہے۔نیر سلطانپوری ایسے شاعر ہیں جن کی کج کلاہی ہمیشہ ان کی شاعری اور شخصیت کا ثبوت دیتی رہے گی۔ان کی شاعری ان کے دل کی آواز ہے انھوں نے جو محسوس کیا اس کو سادہ الفاظ میں قاری کے سامنے پیش کر دیا۔ان کی شاعری میں حال سے وابستگی، مستقبل کی آئینہ داری، اقتصادی اور سماجی حالات پر تبصرہ اور سیاسیات عالم کی بے راہ روی پر تنقید رومانی اور انقلابی فکر بھی کچھ موجود ہے۔انھوں نے اپنے فن تخیل سے کام لے کر وطن عزیز میں اخوت ومحبت اور انسان دوستی کا خواب دیکھا ہے۔انسانی رشتے کی فطری مہک نے ہی ان کی شاعری کو تازگی تحرک اور توانائی عطا کی ہے۔

■

Nishan Zaidi
B-63/S-2,D.L.F. Colony
Sahibabad,
Distt.Ghaziabad - 201005 (UP)
Mob.: 9873297860

نیر سلطانپوری کی شاعری میں حقیقی دنیا ہے وہ گل و بلبل کے فرسودہ قصے بیا ن نہیں کرتے اور نہ ہی محبوب کی تعریف میں آسمان سے ستارے توڑنے کی بات کرتے ہیں اور نہ ہی محبوب کی روایتی ستم گاریوں کو اپنی شاعری میں سموتے ہیں۔ وہ سماج میں بکھری ہوئی زندگی اور مسائل پر غور کرتے ہیں۔

نازش پرتاپ گڑھی کا شعری اختصاص

جاوید احسن

ادب کی دنیا میں نازش پرتاپ گڑھی کی شخصیت کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ ایک شہرت یافتہ شاعر تھے۔ وہ قصبہ سٹی (بیگم وارڈ) پرتاپ گڑھ کے ایک معزز زمیندار گھرانے میں 12 جولائی 1924 کو پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محمد احمد تھا لیکن ادبی دنیا انھیں نازش پرتاپ گڑھی کے نام سے جانتی ہے۔ 10/اپریل 1984 کو انھوں نے اس دارفانی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا۔

وطن کے ذی حشم لوگوں سے تو کچھ بھی نہ ہو پایا
اُجالا کم سے کم پرتاپ گڑھ کا نام ہی میں نے

نازش پرتاپ گڑھی ایک فطری شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز محض تیرہ برس کی عمر میں کیا لیکن اپنے فن میں نکھار پیدا کرنے کے لیے انھوں نے علامہ سیماب اکبر آبادی سے مشورۂ سخن کیا جس کا ذکر انھوں نے اس انداز میں کیا ہے:

''شعر گوئی کی ابتدا 1937 سے ہوئی جب میں پرتاپ گڑھ سے گورنمنٹ ہائی اسکول کے ساتویں درجے میں زیرِ تعلیم تھا۔ جنوری 1943 میں ایک عریضے کے ذریعے میں نے حضرت مولانا علامہ سیماب اکبرآبادی کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ مجھے بھی اپنے حلقہ تلامذہ میں شامل کرلیا جائے۔ حضرت مولاناؒ نے میری درخواست قبول فرمائی اور میں سلسلۂ سیمابیہ میں شامل ہوگیا۔ 1945 کے وسط میں حضرت مولاناؒ نے اپنے تلامذہ کی ایک مختصر سی فہرست ماہنامہ شاعر آگرہ میں شائع فرمائی اور حکم دیا کہ ان کے بقیہ تلامذہ اسی فہرست میں سے کسی بھی ایک شاعر کو اپنے لیے پسند کرلیں اور آئندہ اسی سے مشورۂ سخن کریں۔ ضعف اور کثرت کار کی وجہ سے اب وہ اپنے بے شمار تلامذہ کے کلام پر اصلاح دینے سے معذور ہیں۔ اس فہرست میں میرا نام بھی شامل ہے۔''

(دستاویز (مصنفین کے قلم سے) اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ 1983 ص 347)

نازش پرتاپ گڑھی نے پورے انہماک وارتکاز کے ساتھ حسینۂ شاعری کے گیسوئے خمیدہ کی مشاطگی کی جس کے سبب بعض ناقدین نے ان پر بسیار نویسی کا الزام بھی عائد کیا، لیکن چونکہ ان کے اندر تخلیقیت کا ایک بحرِ زخار ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس لیے وہ متواتر لکھتے رہے اور ان میں جمود و تعطل کی کیفیت پیدا نہ ہوسکی۔ ان کے گیارہ مجموعے شائع ہوئے جو اس طرح ہیں: قدم قدم 1971، لکیریں 1972، متاعِ قلم 1973، زندگی سے زندگی کی طرف 1976، جہاں اور بھی ہیں 1978، نیا ساز نیا انداز 1980، دُردتہ جام 1981، نغمۂ سرمدی 1983، اپنی دھرتی اپنی بات 1985، چرخِ وطن کے مہر وماہ 1987، گلاب کی بات۔ یہ تمام مجموعے ان کی گراں قدر تخلیقی صلاحیتوں پر دلالت کرتے ہیں۔

نازش پرتاپ گڑھی ایک محبِ وطن شاعر تھے۔ ان کی حُب الوطنی کا جذبہ مثالی ہے اور ان کی شاعری اس جذبے سے پوری طرح سرشار ہے۔ ان کی حب الوطنی کا اندازہ اس واقعے سے بھی بحسن وخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جب ملک کی تقسیم ہوئی تو انھوں نے ہندوستان کو ترجیح دی اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ پاکستان جانا قبول نہیں کیا۔ اگر چہ ان کی زندگی مالی دشواریوں سے دو چار رہی اس کے باوجود انھوں نے اپنی خودداری کا پاس رکھتے ہوئے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا اور قناعت کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتے رہے۔ انھوں نے نہایت ہی خلوص واہتمام کے ساتھ ادب کی خدمت انجام دی اور شہرت ونام آوری کا روگ کبھی بھی نہیں پالا جس کے سبب ان کے فن کا وقار کبھی مجروح نہیں ہوا اور وہ ایک حقیقی فنکار کی حیثیت سے ادب کی دنیا میں ممتاز مقام پر فائز رہے۔

نازش پرتاپ گڑھی کے اندر حُب الوطنی کا عنصر فطری طور سے موجود تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ طالب علمی کے زمانے میں ہی بابائے قوم مہاتما گاندھی کی تحریک کا اثر قبول کرتے ہوئے جدوجہد آزادی کے کارکن بن گئے اور وطن کی آزادی کی تحریک میں پیش پیش رہے جس کا سب سے بڑا اثر ان کی تعلیم پر پڑا اور وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہے، لیکن انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا برملا اظہار کرتے ہوئے اپنی شاعری کے ذریعے اپنا پیغام ملک کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔ وہ اپنی حب الوطنی سے مملو جذبات کا اظہار جب شاعری کے پیرائے میں کرتے ہیں تو ایک عجیب قسم

کا سماں بندھ جاتا ہے اوران کی شاعری کا اثر عوام پر بہت گہرا پڑتا ہے۔اس ضمن میں ان کی مشہور نظم 'شعلۂ آزادی' کے چند بند ملاحظہ ہوں ۔

ہاں یوں ہی بھڑکتا جا، اے شعلۂ آزادی!
رگ رگ میں مہکتا جا، اے شعلۂ آزادی!
پھیلا حدِ آخر تک دورِ ستم ایجادی
بپھری تو بہ ہر عنواں افرنگ کی جلادی
چلتا ہی رہا لیکن دورِ ے آزادی
تقدیرِ وطن آخر دیوانوں نے چمکادی
اے شعلۂ آزادی...
سُرخی ہے ترے رُخ پر اس خونِ شہیداں کی
حل ہوتی رہی جس میں جرات دلِ انساں کی
صحرا میں رکھی تو نے بنیاد گلستاں کی
منسوب تجھی سے ہے احساس کی آبادی
اے شعلۂ آزادی...

نازش پرتاپ گڑھی کی ایک مشہور نظم 'ہم بھارت دیش کے باسی ہیں' کے عنوان سے ہے، جس میں انھوں نے ہندوستان کے لوگوں کی خصوصیات کا اظہار کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس ملک کے لوگ کن خوبیوں کے باعث ساری دنیا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں ۔

ہم اہنسا کے پرستار کہے جاتے ہیں
پریت کے، پریم کے شہکار کہے جاتے ہیں
امنِ عالم کے نگہ دار کہے جاتے ہیں
زیست کے قافلہ سالار کہے جاتے ہیں
فطرتاً شور سے، غل سے ہمیں بیزاری ہے
ہم تو وہ ہیں جنھیں ہنسی کی صدا پیاری ہے
زیست کو فرض کا احساس دیا کرتے ہیں
باپ کے حُکم پہ بَن باس لیا کرتے ہیں
سچ کو ہر دَور میں ہم زندہ کیا کرتے ہیں
پرہلاد آگ میں جل جل کے جِیا کرتے ہیں

غلبۂ حق ہے یہاں فطرتِ انسانی پر
راجہ مجبور ہے مرگھٹ کی نگہبَانی پر

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان ابتدا ہی سے امن پسند ملک رہا ہے اور یہاں کے لوگوں نے منافرت پر اخوت کو ترجیح دی ہے، لیکن کچھ شر پسند سماج دشمن عناصر اس ملک کی خوشگوار فضا میں نفرت کا زہر گھول کر یہاں کی ہواؤں کو مسموم بنانے کی کوشش بھی کرتے رہے ہیں جس کے باعث کبھی کبھی یہاں کشیدگی کی کیفیت بھی پیدا ہوتی رہی ہے۔ نازش پرتاپ گڑھی فرقہ پرستی کے سخت خلاف تھے۔انھوں نے اپنے پرائے کے تصّور سے اوپر اٹھ کر ملک کی فلاح و بہبود کو اولیت دینے کی ہمیشہ تلقین کی اور اپنی شاعری کے ذریعے فرقہ پرستی کے عفریت سے اپنے ملک کو بچانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہے۔اس تعلق سے کئی نظمیں ان کے مجموعوں میں موجود ہیں۔ نموتاً ان کی ایک نظم 'جواب آں عزیزم' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

مرے عزیز! تمھارے کئی خطوط ملے
مگر ہیں سب کے مضامین ایک ہی جیسے
لکھا ہے تم نے، میں بے یار و بے سہارا ہوں
تمھیں یہ غم ہے میں اپنے وطن میں تنہا ہوں
تمھیں ہے فکر یہاں کون ہو سکے گا مرا
خدا نہ کردہ اگر مجھ پہ کوئی وقت پڑا
ہر ایک موڑ پہ ظلمت یہاں برستی ہے
لکھا ہے تم نے کہ یہ 'ظالموں کی بستی' ہے
تمہارے پاس پہنچ جاؤں میں تو اچھا ہے
لکھا ہے تم نے کہ 'ہندوستان میں خطرہ ہے'
یہ... اور ایسے ہی دو چار اور بھی فقرے
بڑے خلوص و محبت کے ساتھ تم نے لکھے
مگر عزیز برادر! تمھیں یہ کیا معلوم
کہ میں نہ بے کس و بے بس ہوں اور نہ ہوں مغموم
یہ 'ظالموں کا وطن' ہے لکھا ہے تم نے مگر
مجھے تو صرف دعائیں ملی ہیں ہونٹوں پر
یہاں سبھی مرے دشمن ہیں مان لوں کیسے
کہ مجھ کو جتنے ملے، دوست اور بھائی ملے
ہر ایک ہونٹ نے جینے ہی کی دعا دی ہے
ہر ایک ماں نے مجھے اپنی ممتا دی ہے
ہر ایک شخص مجھے اپنے ساتھ رکھتا ہے
ہر اک بزرگ مرے سر پہ ہاتھ رکھتا ہے
جو مجھ سے چھوٹے ہیں وہ احترام کرتے ہیں
مجھے بھی اپنا سمجھ کر سلام کرتے ہیں
درست ہے کہ میں چھوٹا ہوں کچھ عزیزوں سے
درست ہے کہ میں بچھڑا ہوں تین بہنوں سے
مگر... عزیز برادر! یہ واقعہ بھی سنو
ہزاروں بہنوں نے باندھی ہیں راکھیاں مجھ کو
نہ جانے کتنے محبّ و عزیز دار ملے
مجھے دو تین کے بدلے میں بے شمار ملے
میں اس دیار کو کیوں کر کہوں پرایا ہے
یہیں کی خاک پہ میں نے شعور پایا ہے
رفیق و مونس و غم خوار ہر بشر ہے مرا
مرے وطن کا اک اک فرد ہم سفر ہے مرا

اس ضمن میں نازش پرتاپ گڑھی کی وطنی شاعری سے متعلق علی جواد زیدی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''نازش کو وطن کے ذرّے ذرّے سے پیار ہے۔ عظیم وطنی کرداروں سے ان کی نظموں کا دامن بھرا ہوا ہے۔کرشن، رام، بدھ، گرونانک، لکشمن، پرہلاد، سیتا، وششٹ، وکرمادیتیہ سے نہرو، گاندھی تک بلکہ حسرت موہانی تک ہر ایک کا ذکر محبت اور احترام سے کرتے ہیں اور خاص عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔شاعروں کی صف میں ان کی نظمیں تلسی داس، کیشو اور نرالا کو تلاش کرتی ہیں ۔ وطن کے ماحول اور فضا کو وہ بڑی خوبصورتی سے اپنی نظموں میں جذب کر لیتے ہیں''

(نیا ساز نیا انداز، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 2009، ص 10-9)

نازش پرتاپ گڑھی نے جہاں حب الوطنی کے جذبے سے معمور معیاری نظمیں لکھیں وہیں انھوں نے صنف غزل کو بھی اپنی فکر کا محور بنایا، لیکن چونکہ کمیت کے اعتبار سے ان کی نظمیں اس قدر مایہ دار ہیں اور ان کی نظموں نے ایسی بے پناہ شہرت حاصل کی کہ ان کے آگے ان کی غزل گوئی ماند پڑ گئیں اور اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی، حالانکہ ان کی غزلیں بھی اپنی فکری و فنّی خصوصیات کے لحاظ سے قابل اعتنا ہیں۔ان کی غزل گوئی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں

میں بھی اپنے تخلیقی جوہر کا بھرپور اظہار کیا ہے جس کے باعث ان کی غزلیں فکری اور فنی دونوں اعتبار سے قاری کے ذہن کو اپنی طرف منعطف کرنے کے قابل ہو گئی ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں روایتی انداز اپنانے کے بجائے جدت طرازی سے کام لیا جس کے باعث ان کی غزلیں معنوی اعتبار سے نئے رنگ کی حامل نظر آتی ہیں۔ ان کی غزلیں محض عشق کے روایتی تصورات و خیالات سے مملو نہیں بلکہ ان میں عصری حسیت بدرجۂ اتم بھی موجود ہے جس کی وجہ سے وہ عصری معنویت سے ہم کنار ہیں۔ محی الدین قادری زور نے ان کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے جو باتیں کہی ہیں وہ حقیقت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''جو لوگ غزل کو محض عاشقی کی داستان پارینہ سمجھتے ہیں اور عہد حاضر کے لیے ناموزوں قرار دیتے ہیں وہ اگر نازش کی غزلیں پڑھیں تو محسوس کریں گے کہ اس زمیں میں زندگی اور زرخیزی کی کتنی لامحدود وسعتیں پنہاں ہیں ضرورت اس کی ہے کہ کوئی ان سے کام لے۔ نازش اس گُر سے واقف ہیں اور ان کی غزل قدیم اور از کار رفتہ خصوصیاتِ تغزل سے ہٹ کر ایک ایسی فضائی تخلیق کا باعث ثابت ہوئی جو ایک صحت مند اور ترقی پزیر قوم کی شاعری کے لیے از بس ضروری ہے... انتخاب الفاظ اور بندشوں کا لطف برابر موجود ہے جس کی وجہ سے غزل کو انفرادیت حاصل ہے۔''

(لکیریں' مجموعہ کلام' نازش پرتاپ گڑھی، ص6)

محی الدین قادری زور کے علاوہ جگن ناتھ آزاد اور اعجاز صدیقی نے بھی ان کی غزل گوئی سے متعلق اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''جہاں تک نازش کی غزلوں کا تعلق ہے، ان کا لب ولہجہ، انداز بیان اور تخئیل کی ندرتیں مل جل کر ایک ایسی فضا کی تخلیق کرتی ہیں جہاں حقیقی غزل گوئی سانس لیتی ہے'' (لکیریں، ص9)

اور اعجاز صدیقی لکھتے ہیں:

''ان کی غزلیں روایتی غزل گوئی کی نہج سے ہٹ کر اپنے لیے چونکا دینے والی طرز ادا پیدا کر رہی ہیں۔''

(لکیریں، ص10-9)

نازش پرتاپ گڑھی کی غزلوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ محض بندھے ٹکے مضامین کو اپنی غزلوں میں نہیں باندھتے، بلکہ اپنے گراں قدر تخئیل سے کام لیتے ہوئے اس کو ہر ممکن متمول بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہنگامی صورتِ حال کو بھی کبھی شعری جامہ پہناتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن اس قبیل کے اشعار میں وہ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک ادبی اور شعری چاشنی پیدا کر دیتے ہیں جس کے باعث وہ Statement نہیں بنتے بلکہ وہ پختہ شعری اظہار کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو۔

تاریخ کے صفحوں پہ جو انسان بڑے ہیں
ان میں بہت ایسے ہیں جو لاشوں پہ کھڑے ہیں

'روح عصر' یعنی عصری حسیت شاعری کی جان رہی ہے۔ نازش نے اس پر بھی خصوصی توجہ دی ہے جس کے باعث ان کے بہت سے اشعار اپنے عہد کے ترجمان بن گئے ہیں۔

سوچ اے نازش نہ ہو یہ بھی فراری ذہنیت
کر رہا ہے عہد حاضر میں جو مستقبل کی بات
قافلے والو اب آؤ اور آگے بڑھ چلیں
کھا چکے رہبر کا دھوکا جان لی منزل کی بات
تنہا تنہا رو لینے سے کچھ نہ بنا ہے کچھ نہ بنا
مل جل کر آواز اٹھاؤ پربت بھی ہل جائے گا

نازش پرتاپ گڑھی زندگی کے مثبت اقدار کے شاعر ہیں اور ان اقدار کی جلوہ سامانی ان کی غزلوں میں نہایت ہی خوبصورت انداز میں موجود ہے، لیکن زندگی سے حاصل شدہ تلخ تجربات بھی ان کی شاعری کا حصہ بنے ہیں جو ان کے کلام میں حزنیہ رنگ سے بھر دیتے ہیں اور جس کے باعث ان کی غزلوں میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کچھ دور ساتھ گردشِ شام و سحر گئی
پھر اس کے بعد زندگی جانے کدھر گئی
نغمہ زن ہوں یوں کہ یاروں کا بھرم قائم رہے
ورنہ محفل کی فضا ناساز گار نغمہ ہے
فرصت کہاں نصیب قیام و قرار کی
ہم لوگ وقتِ شام درختوں کے سائے ہیں
ویرانۂ خیال کی وحشت نہ کم ہوئی
حالانکہ بات بات پہ ہم مسکرائے ہیں

نازش کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں محض حسن و عشق اور گل و بلبل کے روایتی ترانے گانے کے بجائے وطن کے گیت گائے ہیں اور ادب برائے سماج کے نظریے کو عملی جامہ پہنا کر اپنی شاعری کو افادی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، لیکن انہوں نے مقصد کی قربان گاہ پر فن کو بھینٹ چڑھنے نہیں دیا

دل خلوص گزیدہ کو کوئی کیا جانے
میں چاہتا ہوں کہ دنیا مجھے نہ پہچانے

نازش پرتاپ گڑھی کی غزلوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ یہ بات غزل میں بڑی ریاضت کے بعد پیدا ہوتی ہے، اسی کے ساتھ طبیعت میں بھی گداختگی ہونی چاہیے۔ ان کی غزلوں میں از دل خیزد بر دل ریزد، والی کیفیت موجود ہے اور یہ خصوصیت ان کی غزلوں کو انفرادی شان عطا کرتی ہے۔ ان کی غزلوں کی ایک بڑی خوبی اس میں پائی جانے والی سلاست اور روانی بھی ہے۔ وہ پیچیدہ اور ثقیل تشبیہوں اور استعاروں سے پرہیز کرتے ہیں جس باعث بھی ان کے اشعار قاری کو براہ راست متاثر کرتے ہیں۔ الغرض ان کی غزل گوئی بھی قابل مطالعہ ہے اور اس کی طرف بھی توجہ دی جانی چاہیے۔

بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''نازش نے جس وقت شاعری شروع کی تھی ترقی پسندوں میں سماجی، اصلاحی، انقلابی، وغیرہ عنوانات لگا کر شاعری کو مصنوعی طور پر تقسیم کرنے کی رسم مستحکم ہو چکی تھی لیکن انھوں نے اس کی پروا کیے بغیر کہ ان کی شاعری پر کیا لیبل فٹ ہو چکا ہے اور کیا ہو سکتا ہے اسی قسم کے شعر کہے جیسے ان کی طبیعت ان سے کہلواتی رہی۔''

کلیات نازش پرتاپ گڑھی (جلد اول) ترتیب و تدوین عبداللہ سلمان، ص4 (غیر مطبوعہ)

المختصر نازش کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں محض حسن و عشق اور گل و بلبل کے روایتی ترانے گانے کے بجائے وطن کے گیت گائے ہیں اور ادب برائے سماج کے نظریے کو عملی جامہ پہنا کر اپنی شاعری کو افادی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، لیکن انھوں نے مقصد کی قربان گاہ پر فن کو بھینٹ چڑھنے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں فکر و فن کا حسین اور معتدل امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے خیالات و نظریات کو بطریق احسن شعری پیکر میں ڈھال دیتے ہیں جس کے باعث ان کی شاعری قابل تحسین بھی بن جاتی ہے اور لائق مطالعہ بھی۔ بلاشبہ نازش ایک اہم شاعر ہیں لیکن ان پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ ان کے فکر و فن پر از سر نو تنقیدی نگاہ ڈالنے کی اشد ضرورت ہے۔

■

Javed Ahsan
Research Scholar
Allahabad University
Prayagraj - 211002
Mob:7388137680
javedahasan7@gmail.com

احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری

شفیع احمد

اردو میں صنف انشائیہ کا وجود نیا نہیں ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے اس صنف میں بڑی وسعت اور تنوع ہے۔ اس میں ذہنی آسودگی بھی ملتی ہے اور زبان کا چٹخارہ بھی۔ کوئی اسے ذہنی ترنگ کا نام دیتا ہے تو کہیں اسے Essay کی دوسری شکل قرار دی جاتی ہے۔ اسی طرح کوئی عہد مولانا محمد حسین آزاد سے اس کے ڈانڈے ملاتا ہے تو کوئی اسے خالص مغربی ادب کا زائیدہ بتاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک نکتہ بہت اہم ہے کہ اردو میں انشائی ادب کا وجود پہلے اور اس کے نام کا تعین بہت بعد میں ہوا جس کی بنا پر بہت سے لوگ مغالطے کا شکار ہوئے۔ بہت سے نقاد انشائیے کی ابتدا لفظ 'انشائیہ' کے رائج ہونے سے جانتے ہیں۔

انشائیہ عربی لفظ انشا سے بنا ہے جس کے معنی عبارت لکھنا، طرز تحریر یا کوئی بات پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ انشائیہ اردو نثر کی ایک غیر افسانوی صنف ہے۔ انگریزی لفظ Light Essay یا Personal Essay کے متبادل کے طور پر اردو میں انشائیہ کا لفظ رائج ہوا۔ مختصر یہ کہ انشائیہ میں کسی منصوبہ بند طریقے سے باضابطہ مواد کو یکجا کر کے اظہار خیال نہیں کیا جاتا بلکہ دل و دماغ پر اثر انداز ہونے والے خیالات کو عبارت کے ذریعے پیش کرنا انشائیہ کے ذیل میں آتا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں صنف انشائیہ کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ عہد سرسید میں اس صنف کی بنیاد پڑی لیکن اس عہد کے بعد صنف انشائیہ ایک مکمل صورت میں سامنے آئی۔ رفتہ رفتہ اہل فن نے اس صنف کی طرف رجوع کرنا شروع کیا اور اس کی وسعت پزیری میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ بھی تسلیم شدہ امر ہے کہ اردو ادب کی بعض دوسری اصناف کی طرح انشائیہ بھی درآمد شدہ صنف ادب ہے۔ انشائیہ نگاروں کی ہر لمحہ یہ کوشش رہی کہ سماج کی کج روی کو اس طرح قارئین ادب کے سامنے پیش کیا جائے کہ وہ انہیں مسکراتے ہوئے تسلیم کر لیں اور اس کے لیے ردعمل کی بھی کوشش کریں۔ لہٰذا اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اردو کے انشائیہ نگاروں نے سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، معاشی اور تعلیمی مسائل کو انشائیے کا حصہ بنایا۔ ویسے بھی اہل قلم کے آگے کسی طرح کی جغرافیائی حد بندی نہیں ہوتی۔ سارے جہاں کا غم وہ اپنے دل میں سمیٹے ہوئے رہتا ہے اور اپنی تخلیقی کاوشوں کے ذریعے اپنی افسردگی اور نظریہ حیات کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو انشائیے کا دائرہ عمل شروع سے وسیع رہا ہے۔ اردو انشائیہ ابتدا سے آج تک اپنے عہد کے حقائق کی عکاسی میں کامیاب رہا ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ ہے کہ ادب میں ہمیشہ آفاقی تصور کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس لیے انشائیہ نگاروں نے تمام دنیا کے مسائل کو پیش نظر رکھا۔ انہی انشائیہ نگاروں میں ایک اہم نام احمد جمال پاشا کا ہے۔

احمد جمال پاشا کا اصل نام آغا محمد نزہت پاشا تھا۔ ان کی پیدائش یکم/ جون 1929 کو الہ آباد کے محلہ خلد آباد میں ہوئی۔ انھوں نے 1950 میں کوئنس ہائی اسکول سے میٹرک 1953 میں لکھنؤ کرسچین کالج سے انٹرمیڈیٹ، 1959 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ 1958 میں احمد جمال پاشا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد واپس لکھنؤ چلے آئے اور صحافت کے پیشے سے منسلک ہو گئے 27 /ستمبر 1987 کو وہ جب ایک ریڈیو پروگرام میں شرکت کے لیے پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ اسی دن انھیں اچانک دل کا دورہ پڑا اور دوسرے روز بروز پیر 28 ستمبر کو وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ انھیں اپنے آبائی ضلع سیوان کے محلہ تاہد والے قبرستان میں 29 /ستمبر 1987 سپرد خاک کیا گیا۔

احمد جمال پاشا نے انسانی اور معاشرتی زندگی کے پیچ و خم کو انشائیے میں پیش کیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں طنز کا نشتر بھی ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی۔ وہ جس مسئلے کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں بغیر کسی تلخی کے مسائل تک ہماری رسائی ہو جاتی ہے۔ ان کی کئی تخلیقات اس سلسلے میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ مثلاً اندیشہ شہر، ستم ایجاد، لذت آزاد، مضامین پاشا، چشم حیراں، آثار قیامت، فن لطیفہ گوئی وغیرہ۔

جب احمد جمال پاشا نے 'لاہور میں تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'، 'ادب میں مارشل لا' اور 'ستم امتحان کے میدان میں' جیسے مضامین لکھے تو ان کی طرف قارئین متوجہ ہونے لگے۔ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں احمد جمال پاشا کی تخلیقی صلاحیت اپنے شباب پر تھی۔ ان کے اہم انشائیوں میں چچنا، کچھ تنقید کے بارے میں، ہجرت، بے ترتیبی، شور، اصولوں کی مخالفت میں، چغلی کھانا، تنہائی کی حمایت میں اور کچھ بلیوں کے سلسلے میں وغیرہ ہیں۔ اس کے ساتھ کچھ مضامین بھی ملتے ہیں جو مضمون کے زمرے میں شامل ہیں لیکن وہ انشائیے سے قریب ہیں، ان میں انشائیہ کی خصوصیات غالب ہیں اور انہیں بھی انشائیہ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان میں مونچھیں، نیا پیسہ، ٹائم ٹیبل، آئی جانی قیامت، ناپسندیدہ لوگ وغیرہ مضمون شامل ہیں۔ احمد جمال پاشا کو انشائیہ کے فن میں مہارت حاصل تھی۔ وہ جب انشائیہ تخلیق کرتے تھے تو وہ کسی عام موضوع کو لے کر موضوع کا زاویہ بدل کر اس کے اندر چھپے ہوئے پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ:

> ''مسخر تفنن پھکڑ پن شخصی ہجو مزاح برائے تفریح کبھی بھی ادب کا جزو نہیں بن سکتے۔ ادبی ظرافت اور مسخرے پن کا کوئی میل نہیں۔''

(بیسویں صدی میں طنز و مزاح: نامی انصاری، ص 262)

اس اقتباس کی روشنی میں کہا جائے گا کہ ان کے یہاں سادگی اور متانت کے حوالے سے سماج کی کج روی پر گہری نگاہ ڈالی گئی ہے۔ یہاں پھکڑ پن اور صرف ہنسنے ہنسانے تک مزاحیہ ادب کو محدود رکھنے کا خیال عنقا ہے۔ لہٰذا احمد جمال پاشا نے انسانی زندگی اور سماجی زندگی کے ان گنت گوشے پر اپنی گہری نگاہ ڈالتے ہوئے طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ ان کی انشائیہ نگاری کا جائزہ 'ادب میں

مارشل لا کے اس اقتباس سے بخوبی لیا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''حالات اب صدر اردو کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ علمی ادبی سرگرمیوں اور تحریکوں نے ادبی مزاج کی صورت اختیار کرلی تھی۔ ملک ادب خوفناک اور گندی سیاست میں مبتلا تھا۔ ادب صحافت اور پمفلٹ میں تمیز کرنا بدتمیزی تصور کی جانے لگی تھی اور ہنگاموں کا باعث ہوا کرتی تھی۔ دائمی قدروں کو وقتی قدروں میں تبدیل کرنے والے اب اسے لمحاتی قدروں میں تبدیل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مجبوراً صدر نے ملک ادب پر مارشل لا نافذ کردیا۔ ادب کا نظم ونسق براہ راست ادبی فوج کے ہاتھ میں آگیا اور جب اہل ادب کی آنکھ کھلی تو وہ حیران رہ گئے کیوں کہ جمہوریت کی چڑیا اڑ چکی تھی اور مارشل لا کی طوطی بول رہی تھی... موجودہ انقلاب اور اصلاحات کا ہر حلقہ ادب میں بے پناہ استقبال کیا جارہا ہے۔ ادب میں انتشار پیدا کرنے والے اب تقریباً منتشر ہوگئے ہیں۔ ادب میں ایک توازن سنجیدگی اور پائیداری کی ہر طرف امید کی جارہی ہے۔ ادبی جمود کا نعرہ لگانے والے مارشل لا کے طفیل میں اب مقالے لکھ لکھ کر ثابت کررہے ہیں کہ ادب میں نہ کبھی جمود تھا اور نہ ہے۔ آگے چل کر ادبی مارشل لا کا دور تاریخ ادب میں ادب کے سنہری دور کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ جس میں زیادہ تر عظیم اور صالح ادب تخلیق ہوا اور تمام بنیادی کام انجام دیے گئے۔'' (ایضاً، ص 275-263)

احمد جمال پاشا کا اختصاص رہا ہے کہ انھوں نے جہاں سماجی، معاشی، اقتصادی، تعلیمی، سیاسی صورت حال پر انشائیے قلم بند کیے وہیں ادبی صورت حال کو بھی ہدف بنایا ہے۔ یہ بالکل آج کی ادبی صورت حال سے افسردگی کا اظہار کراتی ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ انھوں نے ادبی شخصیات کو بھی اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے انجم مانپوری کی ظرافت شناسی کے سلسلے سے طنزیات مانپوری لکھ کر اس بات کو پیش کیا کہ ان کی نظر ادب کے کارکن پر بھی تھی۔ مشتاق احمد یوسفی پر بھی انھوں نے طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھیے:

''ادب کی اس نقشہ کشی اور تعریف کے ساتھ ہی مسکراہٹوں کا انار چھوٹنا شروع ہوجاتے ہیں۔ مقدمہ نگاری کی بدعت کا پوسٹ مارٹم کرنے میں یہ اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتے۔'' (ظرافت اور تنقید: احمد جمال پاشا، ص 160)

ان کی انشائیہ نگاری کا جائزہ 'حاجی لق لق کی عیدیاں' کے حوالے سے بخوبی لیا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

السلام علیکم عید مبارک
آج دنیا میں عید ہے
ہمارے شہر میں عید ہے
ہمارے گھر میں عید ہے
لیکن ہمارے دل میں محرم ہے
اور تمھاری یاد ستیہ گرہ کیے بیٹھی ہے
نہ ٹلتی ہے نہ چین لینے دیتی ہے

اس طرح یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بحیثیت انشائیہ نگار احمد جمال پاشا کافی کامیاب ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی زندگی کو جینے کا شعور سکھاتی ہیں۔ ان کے انشائیوں میں بلا کی سنجیدگی ہے۔ مختصر یہ کہ ان کی تحریر اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ان کے یہاں ایک اچھے مزاح نگار اور خوش فکر طنز نگار کا شعور ملتا ہے۔ اس سلسلے سے مضمون 'شکر کا چکر' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''جب میں شکر کی دکان پر پہنچا تو پہلے مجھے دھوکہ ہوا کہ میں شکر کی دوکان پر نہیں بلکہ کسی ایسے سنیما گھر کے سامنے پہنچ گیا ہوں جس میں کوئی مار دھاڑ والا نیا نیا فلم آج ہی لگا ہو اور پورا شہر اسے آج ہی دیکھ لینا چاہتا ہو۔ حد نظر تک شکر کی لائن میں لوگ چیونٹیوں کی طرح لگے ہوئے تھے اور لائن کو پولس والے ڈنڈے کی مدد سے درست کر رہے تھے۔ شکر کے بہت سارے امیدوار تار تار ہو چکے تھے اور حلیہ بتا رہا تھا کہ انھوں نے یہ جگہ بہ زور بازو حاصل کی ہے۔ اکثر بزرگ اپنی باری کے انتظار میں تسبیح لیے شکر حاصل کرنے والا کوئی جلالی وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب لائن میں ہی کھڑے کھڑے بری طرح چیخ رہے تھے کہ ہائے میں لٹ گیا اور معلوم ہوا کہ کسی نے موقع پاکر ان کی جیب صاف کردی۔''

(بہار میں اردو طنز و ظرافت: سلطان آزاد، ص 105)

احمد جمال پاشا کے تعلق سے یہ کہا جائے گا کہ انھوں نے اپنے انشائیوں کے لیے مواد تہذیب وثقافت علم وادب سیاست ومعاشرت کے میدان سے حاصل کیا۔ زمانے کے ناساعد حالات جن سے انسانی زندگی پریشانی کا سامنا کررہی ہے اس سلسلے سے بھی باتیں کی ہیں۔ اس پر اضافہ یہ کہ ادبی دنیا پر بھی انھوں نے گہری نگاہ ڈالتے ہوئے ادب کے میدان پر طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ ادیب وفنکار کو ہدف ملامت بنایا ہے۔ تماشائے ادب، افلاطون، کافی ہاؤس میں، میرے ادبی نظریے اور عقیدے، نثری شاعری، ادب میں بانس کی اہمیت، اقبال کی تلاش میں، غالب اینڈ کمپنی اور ادب میں مارشل لا، اس موضوع پر ان کی بہترین نگارشات ہیں۔ ادب میں مارشل لا کا یہ اقتباس بطور نمونہ پیش کررہا ہوں ملاحظہ کیجیے:

''ہمارے پاس ادبی تنقید کا کوئی جمہوری طریقہ نہیں فی زمانہ ادب میں خواجہ سرائیاں عام ہیں۔ سرقہ توارد اور آورد سے شعرا نے ادب کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ موجودہ ادیب ادب کے نام پر ٹریش لکھ رہے ہیں۔ ادب اس وقت پیسے کمانے، نعرے بازی، گروپ بندی اور پگڑی اچھالنے کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے۔ ادب کی محترم ہستیاں بے ادبی کرنے سے نہیں چوک رہی ہیں۔''

(ظرافت اور تنقید: احمد جمال پاشا، ص 51)

مختصر یہ کہ احمد جمال پاشا نے قومی زندگی کے بے شمار مسائل کو انشائیوں کا موضوع بنایا ہے۔ رشوت خوری، سماجی ناہمواری اور جبر واستحصال کے خلاف انھوں نے اپنا قلم اٹھایا ہے۔ تعلیمی نظام کے کھوکھلے پن پر اپنے انشائیوں کے ذریعے چوٹ کی ہے۔ ان کے انشائیے کو پڑھ کر قارئین ادب زیر لب مسکراتے ہیں۔ ان کے یہاں شائستگی، شگفتگی اور روانی بھی ہے۔ ان کے انشائیوں میں قوس قزح کے سارے رنگ موجود نظر آتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں جو جدت اور شوخی ہے وہ ان کے وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے احمد جمال پاشا نے انشائیے کو ذریعہ بنایا ہے۔ جس میں کامیاب بھی ہوئے۔ ان کے انشائیے صرف تبسم نہیں بلکہ تفکر کی دعوت بھی دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کے انشائیے فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کا نام اپنے معاصرین میں انفرادیت رکھتا ہے۔

لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ احمد جمال پاشا نے جو بھی لکھا بہت خوب لکھا۔ ان کے انشائیوں نے بڑے بڑے اہل قلم کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب رہے۔ یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے کہ کسی ادیب وفنکار پر اہل قلم اپنے نظریات پیش کریں، اس ضمن میں احمد جمال پاشا کامیاب نظر آتے ہیں۔

احمد جمال پاشانے قومی زندگی کے بے شمار مسائل کو انشائیوں کا موضوع بنایا ہے رشوت خوری سماجی ناہمواری اورجبرواستحصال کے خلاف انہوں نے اپنا قلم اٹھایا ہے تعلیمی نظام کے کھوکھلے پن پر اپنے انشائیوں کے ذریعے چوٹ کی ہے ان کے انشائیے کو پڑھ کر قارئین ادب زیر لب مسکراتے ہیں ان کے یہاں شائستگی شگفتگی اور روانی بھی ہے ان کے انشائیوں میں قوس قزح کے سارے رنگ موجود نظر آتے ہیں ان کے انشائیوں میں جو جدت اور شوخی ہے وہ ان کے وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے

Shafi Ahmad
Assistant Professor, MJK College Bettiah,
West Champaran - 845438 (Bihar)
Mob.: 9560339869

انور اعظمی
ایک مطالعہ

محمد الیاس الاعظمی

جن اہل علم اور ارباب شعر وسخن کی تابانیوں کی بدولت افق اعظم گڑھ مطلع انوار بنا ان میں ایک نام انور اعظمی (1926-1961) کا بھی ہے۔ وہ عالم تھے، ادیب تھے، شاعر تھے، افسانہ نگار تھے، صحافی تھے، مبصر تھے۔ گویا ان کی شخصیت متنوع اوصاف و امتیازات سے عبارت تھی، مگر ان کی کم عمری کی موت نے ان کی جولانیوں کو نکھرنے کا موقع نہیں دیا، تاہم انھوں نے جو سرمایہ شعر و ادب یادگار چھوڑا ہے وہ بے حد قیمتی ہے۔ اور اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

انور اعظمی 19 جولائی 1926 کو اعظم گڑھ کے ایک گاؤں مہوارہ کلاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر مولوی عبدالوحید سے حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخل کیے گئے درمیان میں کچھ دن شبلی نیشنل پی جی کالج میں بھی زیر تعلیم رہے مگر پھر مدرسۃ الاصلاح واپس آگئے اور 1947 میں سند فراغت حاصل کی۔ ان کا شمار ذہین، سنجیدہ اور باصلاحیت طلبہ میں ہوتا تھا۔ تکمیل کے بعد مادر علمی مدرسۃ الاصلاح میں استاذ مقرر ہوئے اور درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ مولانا انیس اعظمی کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''مرحوم انور اعظمی ہمارے اساتذہ میں تھے۔ 1948-49 کی بات ہے۔ مختصر مدت کے لیے بحیثیت طالب علم ان سے استفادہ کا موقع ملا تھا۔ وہ ایک ہمدرد اور شفیق استاذ تھے۔ نصف صدی سے زائد مدت گزر جانے کے باوجود ان کی دلآویز شخصیت کا اثر ذہن پر ہے۔ اقبال کا مصرعہ

آزادی و دل سوزی سرمستی و رعنائی

ان کی ہستی پر پوری طرح منطبق ہوتا تھا۔ انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ

حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی

(نالہ شب ص 17)

ظاہر ہے محض انیس اعظمی صاحب ہی نے استفادہ نہیں کیا ہوگا بلکہ ان کی پوری جماعت ان کے فیضان نظر سے بہرہ ور ہوئی ہوگی، مگر کسی اور طالب علم کا اعتراف ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

انور اعظمی مدرسۃ الاصلاح میں جماعت اسلامی، اس کے افکار و نظریات اور اغراض و مقاصد سے واقف ہوئے۔ پھر یہ واقفیت وابستگی میں بدل گئی۔ چونکہ ان میں دور طالب علمی ہی میں لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوگیا تھا بلکہ یہ صلاحیت ان میں پورے طور پر پروان چڑھ چکی تھی۔ دراصل اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں تصنیف و تالیف کا ذوق اس کے فضلا پر حاوی تھا اور وہ ملک کے مختلف حصوں میں داد تحقیق و تصنیف دے رہے تھے۔ چنانچہ انور اعظمی کی اس صلاحیت نے انھیں 1949 میں رام پور پہنچا دیا اور وہ مولانا حامد علی کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ 'زندگی' سے وابستہ ہوگئے۔ اور 1952 تک وابستہ رہے۔ ان کا تعلق غالباً ادارتی امور سے تھا، اس لیے کہ ماہنامہ زندگی میں انھوں نے مضامین کے علاوہ اس کے مستقل کالم اخبار و افکار اور کتابوں پر نقد و تبصرے بھی سپرد قلم کیے ہیں۔ ان کی نثری تحریروں کا ایک مجموعہ 'مقالات' کے عنوان سے ان کی وفات کے 55 سال بعد 2016 میں منظر عام پر آیا ہے۔ اسے مولانا احمد محمود کوثر اعظمی (1929-2018) نے مرتب کیا ہے اور مکتبہ الحسنات دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس کا پیش لفظ ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی نے لکھا ہے اور اچھا لکھا ہے، مگر انھوں نے یہ واضح نہیں کیا ہے کہ اس میں شامل تحریریں ماہنامہ زندگی رام پور سے نقل کی گئی ہیں یا دیگر رسائل و جرائد سے بھی اخذ کی گئی ہیں۔ ناچیز نے ماہنامہ زندگی کے اشاریہ 'زندگی کا خزانہ' جسے میرے فاضل دوست ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے مرتب کیا ہے اور جو دہلی سے 2016 میں شائع ہوا ہے، اس سے تصدیق کی تو یہ بات سامنے آئی کہ 'مقالات' میں تقریباً تمام تحریریں 'زندگی' ہی سے لی گئی ہیں۔ اس کی فہرست یہ ہے:

1 شرک کا نقطہ آغاز 2 توحید کے مختلف مراحل 3 دین میں تحریف 4 تحریک اسلامی کا انقلابی طریقہ کار 5 فرد اور جماعت 6 تحریک اور تعمیر افراد (تین قسطیں) 7 سماجی انقلاب 8 سماج کی بنیادیں 9 دو زاویے 10 اخبار و افکار

البتہ اس میں ماہنامہ زندگی کی چند تحریریں نقل ہونے سے رہ گئی ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:

1 قلندر کی صدا۔ اکتوبر 1949، ص 29
2 بے مائگی۔ دسمبر 1949، ص 33
3 (اخبار و افکار) موجودہ دور میں عالمی صورت حال، اکتوبر 1950 ص 41-45
4 (اخبار و افکار) انتخابات اور ملک کی سیاسی پارٹیوں کے بارے میں اظہار خیال۔ مارچ 1951 ص 33-40

تبصرے

1 قانون مکافات (مصنف: ضیاء الہدیٰ) اگست ستمبر 1950، ص 94-95
2 اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں (مصنف: سید اصغر علی عابدی) اپریل مئی 1951۔ ص 94-95
3 جمہوریت کی مغربی تحریکیں (مصنف: عبدالوہاب ظہوری) اپریل مئی 1951۔ ص 96

ممکن ہے ان کے علاوہ اور بھی تحریریں اوراق زندگی کی زینت بنی ہوں اور جن تک ہماری رسائی نہ ہو سکی ہو۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ ابتدائی دور کے بعض شماروں میں ان کی غزلیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ مگر وہ شمارے دستیاب نہ ہو سکے اور نہ میں یہ تصدیق کر سکا کہ انور اعظمی کی غزلوں کے مجموعہ 'نالہ شب' میں وہ غزلیں شامل ہیں یا نہیں۔

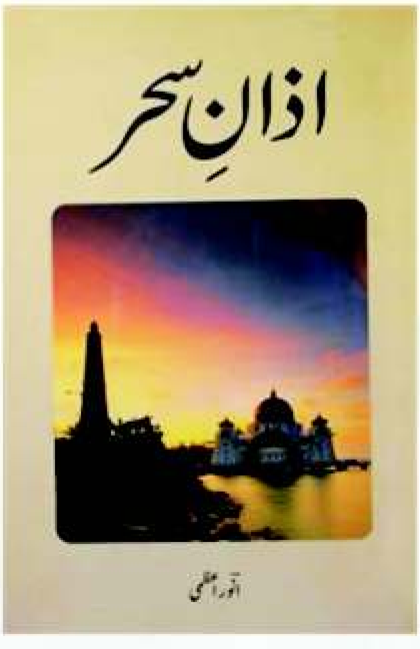

بہرحال گذشتہ سطور میں جن تحریروں کا ذکر آیا ہے وہ انور اعظمی کی زندگی کے زمانہ قیام رام پور کی یادگاریں ہیں۔ اس کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انور اعظمی کو نثر نگاری میں مہارت حاصل تھی۔ اور ان کا علم گہرا اور مطالعہ وسیع تھا اور ان کا اسلوب نگارش نہایت سشتہ و شگفتہ اور دلکش ہے۔

ان کے مقالات سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (1703-1762) اور ان کے افکار کا بڑی دلجمعی سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کے کئی مقالات ایسے ہیں جو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے افکار کی روشنی میں لکھے گئے ہیں یا ان کے افکار کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اسی زمانہ میں ان کے بڑے والد شیخ عبدالحمید جو برما میں مقیم تھے اور وہاں ان کا بڑا کاروبار تھا، انھوں نے اپنی معاونت کے لیے انور اعظمی کو برما بلالیا۔ وہ برما گئے تو ضرور مگر ان کی اب تک کی زندگی علم، اہل علم اور کاغذ و کتاب کے درمیان گذری تھی اور اسلام اور اسلامی علوم و ادبیات کا مطالعہ ان کا مشغلہ تھا۔ چنانچہ انھیں کاروبار راس نہیں آیا اور وہ اس غیر علمی شغل کو اختیار نہ کر سکے۔

برما رنگون میں انور اعظمی ہفت روزہ البلاغ سے وابستہ ہوئے اور کئی برس تک وابستہ رہے۔ پھر ان کی کوششوں سے رنگون سے روزنامہ پرواز اور ہفت روزہ انقلاب جاری ہوئے۔ چنانچہ انھیں ترقی دینے کے لیے انھوں نے اپنی سب صلاحیتیں لگا دیں اور انھیں ترقیات سے ہم کنار کیا۔ اس کی تفصیلات انقلاب رنگون کے انور اعظمی نمبر اور اذان سحر کے مقدمہ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

انور اعظمی کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اختراعی ذہن کے شخص تھے۔ خاموش بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے۔ مہوارہ سے برما تک ادبی اور اصلاحی تنظیموں کا قیام اور ان کی سرپرستی کے کاموں سے ان کی ملی فکرمندی کی ایک جھلک سامنے آتی ہے۔

اسی طرح رنگون سے ایک ادبی رسالے کے اجرا کا خیال ان کی ادبی دلچسپیوں کا مظہر ہے۔ ان کے ایک دوست احمر رنگونی نے لکھا ہے کہ:

''ایک دن انور بڑی حسرت سے کہنے لگے احمر صاحب! کیا اچھا ہو اگر یہاں سے ایک ادبی ماہنامہ نکلے۔ جو عہد حاضر کے ادبی تقاضوں کے مطابق اور بلند معیار ہو۔''

(ہفت روزہ انقلاب رنگون۔ انور نمبر)

اردو اخبارات کے ساتھ وہ برمی زبان میں بھی صحافت کا چراغ روشن کرنا چاہتے تھے۔ سیف الدین شاہد نے لکھا ہے کہ:

''مرحوم نے حد سے زیادہ اس بات کی کوشش کی کہ یہاں سے برمی زبان میں ایک اخبار نکالا جائے۔ تاکہ اس کے ذریعے وقت کی پکار ان کے کانوں تک پہنچائی جا سکے۔ اگرچہ ان کی یہ کوشش رایگاں گئی تاہم وہ اس حد تک اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہوئے کہ لوگوں کی ذہنی سطح کسی قدر بدل گئی۔ ایک نیا ولولہ اور تازہ جوش ان کے دلوں میں پیدا ہو گیا۔'' (انقلاب رنگون 24/اپریل 1961)

ان عزائم، منصوبہ بندی اور فکرمندی کے پس پشت دراصل ایک لازوال فکر تھی۔ ان کے ایک برمی دوست ابوبکر آزاد نے لکھا ہے کہ:

''آپ کی زندگی کا اصل مقصد اسلام ہی پر جینا اور اسلام ہی پر مرنا تھا۔ آپ کی کائنات صرف اسلام تھی اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

(پرواز رنگون، 4/اپریل 1961 بحوالہ اذان سحر ص 36)

مولانا عبدالاول امام جامع مسجد اوچوکوں رنگون نے ایک تعزیتی جلسے میں کہا کہ:

''مرحوم نے پرواز و انقلاب کے ذریعے مسلمانان برمی میں صحیح اسلامی اسپرٹ پیدا کی۔ یہ آپ کی تحریروں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے حق کی حمایت کو اولین فریضہ سمجھا۔ آپ صرف شاعر، جرنلسٹ اور مصنف ہی نہیں بلکہ خادم اسلام بھی تھے۔ آپ کی تحریریں اس کا زندہ ثبوت ہیں۔'' (روزنامہ پرواز۔ 31/مارچ 1961)

انور اعظمی کی برما میں ادبی و صحافتی سرگرمیوں کا ایک مقصد مسلمانان برما میں اتحاد و اتفاق اور مذہبی و سیاسی شعور کی بیداری تھا، جس میں انھیں بڑی حد تک کامیابی بھی ملی۔ روزنامہ پرواز کے مینیجنگ ایڈیٹر آئی. ایم. ڈی باگبہ نے لکھا ہے کہ:

''مرحوم رنگون آئے تو اپنے ساتھ خدمت اسلام و ہمدردی قوم کا قابل قدر جذبہ بھی لائے۔ انھوں نے اس جذبے کے زیر اثر خود بھی کام کیا اور یہاں کام کرنے والوں کا ایک گروہ بھی پیدا کر دیا۔'' (انقلاب، انور اعظمی نمبر)

برما میں انور اعظمی کی مصروفیات اور خدمت کا ایک اور میدان شعر و سخن سے ان کی گہری وابستگی بھی تھی۔ وہ نہ صرف بلند رتبہ شاعر و سخن فہم تھے بلکہ ان کے وجود سے متعدد لوگوں نے شعر و ادب کی خدمت انجام دی۔ وہ مشاعروں میں شریک ہوتے، کلام سناتے۔ بہادر شاہ ظفر کے مزار پر منعقد ہونے والے مشاعرے میں وہ اکثر شریک ہوتے اور انھیں خراج پیش کرتے۔ ان کے مجموعہ اذان سحر کی کئی نظمیں ایسی ہیں جو بہادر شاہ ظفر کی برسی پر منعقد ہونے والے مشاعروں میں پیش کی گئی ہیں۔

نوآموز شعرا کی حوصلہ افزائی، ان کے کلام کی اصلاح اور برما میں ادبی تنظیم کا قیام ان کی اس سلسلے کی اہم کاوشیں ہیں۔

8/برس کی مسلسل جدوجہد کے بعد 1960 میں برما سے وطن واپس آئے اور اپنے دوست مولوی قمرالدین اصلاحی (1925-2019) کی خواہش پر روزنامہ پیغام کان پور سے منسلک ہو گئے، مگر کان پور بھی انھیں راس نہیں آیا اور ایک سال کے اندر ہی اوائل 1961 میں سخت بیمار ہو کر اعظم گڑھ واپس آ گئے اور بیماری کا یہ حال ہوا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ غشی کے مسلسل دورے پڑنے لگے، دوا علاج بہت ہوا مگر زندگی کی شام ہو چکی تھی۔ 6 مارچ 1961 کو یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے حبیب خاص مولوی احمد محمود کوثر اعظمی نے نماز جنازہ پڑھائی اور مہوارہ کلاں کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ان کی بے وقت کی موت سے ہر شخص رنجیدہ ہوا۔ اور وطن سے برما تک ماتم برپا ہوا۔ برمی ادبا و شعرا نے وفیاتی مضامین اور مراثی کہے۔ ان کے دوست شاہد پرتاپ گڑھی کا 'غم دوست' ملاحظہ ہو:

اے ناؤ والو! دور کنارا چلا گیا
دریائے فن شعر کا دھارا چلا گیا
بزم ادب نے کھو دیا ایک در بے بہا
اہل ادب کی آنکھ کا تارا چلا گیا
افسردہ ہو گئی ہے محبت کی کائنات
ارباب ذوق و شوق کا تارا چلا گیا
صد حیف بادہ خواروں میں ساقی نہیں رہا
وہ جس نے میکدے کو سنوارا چلا گیا
اب دیکھتے ہیں اہل نظر یاس کا سماں
جان نظارا تھا جو نظارا چلا گیا
گم کردگان راہ کو جس سے ملی تھی ضو
دکھلا کے اک جھلک وہ ستارا چلا گیا
وہ پیکر خلوص کہ نقش حیات تھا
کر کے عدم کی سمت اشارا چلا گیا
بیباک بن کے خدمت ملی کی راہ میں
صدمے جو کر رہا تھا گوارا چلا گیا
انور کہ جس کی فکر سخن روح شعر تھی
لے کر سخن کا لطف وہ سارا چلا گیا
شاید اسیر غم ہیں فدایان فن تمام
دیتا رہا جو سب کو سہارا چلا گیا

انور اعظمی نے کل 35 سال کی مختصر سی زندگی پائی۔ اس میں ایک برس تدریس اور بقیہ 13 برس ہندوستان اور برما میں

اخبارات و رسائل سے وابستگی میں گزارے۔ اس طرح زندگی کا زیادہ حصہ صحافت کی نذر ہوا اور جیسا کہ اوپر گذرا اس کا آغاز ماہنامہ زندگی رام پور سے ہوا تھا۔ پھر برما اور آخر میں پیغام کان پور سے منسلک ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے مجموعہ مقالات میں جو تحریریں یکجا کی گئی ہیں وہ سب ماہنامہ زندگی سے یکجا کی گئی ہیں۔ ان میں برما کے اخبارات و رسائل کی کوئی تحریر شامل نہیں ہے۔ گویا ان کے ہندی احباب نے انھیں فراموش کر دیا مگر برما کے اہل قلم اور احباب نے انھیں یاد رکھا۔ ان کی موت پر آنسو بہائے۔ روزنامہ پرواز کے مدیر نے ان پر ایک مستقل اداریہ لکھا اور ان کی صحافیانہ خدمات کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ انھیں زبردست خراج پیش کیا۔ اس کے بعد ہفت روزہ انقلاب کے مدیر نے انقلاب کا 'انور اعظمی نمبر' شائع کیا اور متعدد ادبا و شعرا کی تحریریں اور ان کے بیانات شامل کیے۔ یہ نمبر راقم کی نظر سے گذرا ہے۔ مگر اس قدر بوسیدہ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے کہ مزید استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے متعدد اقتباسات مولانا احمد محمود کوثر اعظمی نے 'اذان سحر' کے مقدمہ میں نقل کیے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انور اعظمی برما میں خاصے مقبول تھے اور ان کی سیرت و شخصیت مختلف اوصاف کا مجموعہ تھی۔ ان کے جن برمی احباب نے نظم و نثر میں تعزیت کی ہے اور جن کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

(1) احمر رنگونی (2) شمیم مولیمنی (3) وکیل جون پوری (4) محمد سلطان لطفی۔ مدیر پرواز و انقلاب، برما (5) قلندر شاہ (6) محمد صلاح الدین برق (7) ابوبکر آزاد (8) آئی. ایم. ڈی. باگیہ۔ مینیجنگ ایڈیٹر پرواز و انقلاب رنگون برما (9) محمد سلطان حقیقی (10) مولانا عبدالاول۔ امام جامع مسجد اوچوکوں (11) نظر دریابادی (12) سیف الدین شاہد (13) محمد اسماعیل: جوائنٹ سکریٹری حلقہ ادب رنگوں (14) قاسم سلیمان (15) محمد عمر (16) محمد صلاح الدین برق (17) خواجہ بشیر احمد

یہ انور اعظمی کے برمی احباب، اہل قلم اور صحافیوں کے نام ہیں۔ ان میں ایک مولانا عبدالاول صاحب اوچوکوں کی جامع مسجد کے امام تھے اور دوسرے محمد اسماعیل حلقہ ادب رنگوں کے جوائنٹ سکریٹری، افسوس یہ یادگار نمبر محفوظ نہیں رہ سکا۔

بنظر غائر دیکھا جائے تو انور اعظمی کو یہ افتخار حاصل ہے کہ وہ اعظم گڑھ کے اردو کے اولین صحافیوں میں ہیں، مگر اس کے باوجود ماہنامہ زندگی رام پور میں جس کی انھوں نے ادارت بھی کی تھی ان کی بے وقت کی موت پر آنسو بہانا تو دور کی بات ہے معمولی تذکرہ بھی نہیں کیا گیا۔ ماہنامہ معارف میں بھی ان کا ذکر نہیں آسکا۔ ان کے علاوہ بھی باوجود تلاش کے کہیں اور ذکر نہیں ملا۔ اس سے ہماری بے حسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شاید ہم ہمیشہ ہی ایسے تھے، جیسے کہ آج ہیں۔؟ آج پھر یہ پرانی چوٹ ابھر آئی کہ اعظم گڑھ کے ادبا و شعرا، اہل قلم اور مصنفین کا ایک ترجمان ہونا چاہیے۔ ورنہ انور اعظمی مرحوم جیسے لائق اہل قلم اور شاعر و ادیب اور ان کی کاوشیں تاریکیوں کی نذر ہوتی رہیں گی۔ میں اعظم گڑھ کے پچاسوں ایسے اہل علم اور ادبا و شعرا کو جانتا ہوں جو ہماری بے حسی کی نذر ہو گئے اور آج کوئی ان کا نام و نشاں بتانے والا بھی نہیں۔ خدا بھلا کرے مولانا کوثر اعظمی مرحوم کا جنھوں نے ایک مفصل اور طویل مقدمہ 'اذان سحر' پر سپرد قلم کر دیا تھا کہ آج انور اعظمی کی مختصر کتاب زندگی کے بعض ابواب محفوظ ہیں۔ اس میں اصلاً ان کے برادر خورد راشد اعظمی (اشتیاق احمد اعظمی) کی کوششوں اور دلچسپیوں کا بڑا دخل ہے۔ ست روی ہی سے سہی ان کی دلچسپی ہی کا نتیجہ ہے کہ انور اعظمی کی تمام نگارشات منظر عام پر آگئیں۔ ان کے بھانجے عزیز گرامی سلطان احمد نے بھی اشاعت سے دلچسپی لی اور اذان سحر کے جدید ایڈیشن میں چند سطور لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے ماموں کے فکر و فن کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ بہر حال انور اعظمی کا جو سرمایہ علم و ادب ہمارے سامنے ہے وہ درج ذیل ہے:

1 اذان سحر، نظموں کا مجموعہ، طبع اول 1967، انور اکیڈمی سرائے میر، طبع دوم اپریل 2017، منشورات پبلشرز دہلی

2 افسانے، مکتبہ الحسنات دہلی 2015

3 مقالات، مکتبہ الحسنات دہلی 2016

4 نالہ شب، مجموعہ غزلیات، مکتبہ الحسنات دہلی 2016

5 سدھارتی سبیل، یہ خطبہ ناچیز کی نظر سے نہیں گزرا ہے۔

غالباً کسی نے ان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند لی ہے۔ مگر اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

انور اعظمی کے برادر خورد راشد اعظمی خود بہت اچھے شاعر تھے۔ بالخصوص غزلوں کے وہ ایک منفرد شاعر تھے۔ ان کا مجموعہ کلام 'نشاط غم' اس دور میں جگر و اصغر کی یاد دلاتا ہے۔ اسی ادبی مذاق کی بدولت وہ انور اعظمی کی شعری و نثری نگارشات کے تحفظ میں نہ صرف کامیاب رہے بلکہ ان کی بدولت ان کے مجموعہ ہائے نظم و نثر پر چند عمدہ تحریریں بھی وجود میں آگئیں۔ طوالت کے باوجود جس کا شکوہ رشید احمد صدیقی (1892-1977) نے اپنی تعارفی تحریر میں کیا ہے آج انور اعظمی کے فکر و فن کے سمجھنے کے لیے مولانا کوثر اعظمی کا مقدمہ سب سے اہم تحریر ہے۔ ڈاکٹر سید

> ”بنظر غائر دیکھا جائے تو انور اعظمی کو یہ افتخار حاصل ہے کہ وہ اعظم گڑھ کے اردو کے اولین صحافیوں میں ہیں, مگر اس کے باوجود ماہنامہ زندگی رام پور میں جس کی انھوں نے ادارت بھی کی تھی ان کی بے وقت کی موت پر آنسو بہانا تو دور کی بات ہے معمولی تذکرہ بھی نہیں کیا گیا. ماہنامہ معارف میں بھی ان کا ذکر نہیں آسکا. ان کے علاوہ بھی باوجود تلاش کے کہیں اور ذکر نہیں ملا. اس سے ہماری بے حسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے.“

عبدالباری شبنم سبحانی اور انیس اعظمی کی تحریریں بھی قابل ذکر ہیں۔ البتہ زندگی کے مدیر مولانا سید احمد عروج قادری نے اذان سحر پر جو مفصل تبصرہ قلم بند کیا ہے اسے بھی کہیں محفوظ کیا جانا چاہیے۔ (ملاحظہ ماہنامہ زندگی، فروری 1970]

گذشتہ صفحات میں ذکر آ چکا ہے کہ انور اعظمی برما میں نہ صرف کئی اخبارات سے وابستہ رہے اور انھیں ترقی کی منزلوں سے ہم کنار کیا بلکہ برما کے مسلمانوں میں سیاسی اور مذہبی شعور بھی بیدار کیا۔ اس کے لیے انھوں نے بعض اخبارات کا اجرا بھی کیا اور ترقی دینے کی کوشش بھی۔ گو اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی، تاہم میں یہ سوچ کر حیران اور سخت متعجب ہوں کہ ایک شخص جو مدرسے کا فاضل ہے اور جو جرنلزم کے الف اور با سے واقف نہیں اس کی صلاحیت اور حوصلہ مندی کی داد دیجیے کہ وہ اپنے وطن میں نہیں دور دیس جا کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتا ہے۔ اور اس میدان صحافت کے منجھے ہوئے صحافیوں سے داد تحسین وصول کرتا ہے۔

عہد حاضر میں صحافت چاہے وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الکٹرانک میڈیا، ایک خاص مقصد کے تحت صحافت اور صحافیانہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ انھیں انسانی اقدار و روایات کے تحفظ کا ذرا بھی خیال نہیں رہ گیا ہے۔ معروضیت یا غیر جانب داری اب ان کے نزدیک کوئی اصول نہیں رہا۔ ایسے حالات میں انور اعظمی مرحوم کی 70-60 برس پہلے کی صحافت اور اس میں ان کے معاصرین کا اعتراف کمال اس بات کا اعلان ہے کہ انور اعظمی فطری اور وہبی صلاحیتیں لے کر دنیا میں آئے تھے اور جو لمحہ زندگی انھیں ملا اس کا پورا حق ادا کیا۔ کئی برمی اہل قلم نے اس کا ذکر و اعتراف انقلاب کے انور اعظمی نمبر میں کیا ہے۔ انھیں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

انور اعظمی مرحوم کے اوصاف وکمالات میں صحافت کے ساتھ ان کی شاعری کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ وہ ان کی کتاب زندگی کا سب سے خوب صورت باب ہے۔ اصلاً وہ شاعر تھے، بلکہ فطری اور وہبی شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز کب ہوا اور اس کی نشو ونما کن حالات میں ہوئی اس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ البتہ وہ ماہنامہ زندگی کی ادارت کے زمانے میں نظمیں اور غزلیں بھی کہتے تھے جو معاصر رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ برما کے مشاعروں میں بھی وہ شریک ہوتے تھے۔ اور معاصر شعرا سے داد و تحسین حاصل کرتے تھے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام 'اذان سحر' جو ان کی نظموں کا مجموعہ ہے، انور اعظمی کی شاعری کا بڑا دلکش اور دلفریب نمونہ ہے۔ اس میں جہاں افکار ونظریات کی ایک دنیا آباد ہے۔ وہیں انور اعظمی کے فنی شعور اور شاعرانہ کمالات اس سے پورے طور پر اجاگر ہوتے ہیں۔ ان کی متعدد نظمیں معاصر شعرا سے کسی درجہ کم رتبہ نہیں۔ مستقبل، قید تنہائی، انتظار، حسن، عید کا چاند، خودشناسی، بہار تخلیق انسان، بلبل، اشتراکیت، مساوات، لال قلعہ، تاج محل اور یاران حرم وغیرہ انتہائی اہم نظمیں ہیں۔ انہیں اردو شاعری میں ایک اضافہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں بڑی تابانی ہے۔ مذہبیت کے ساتھ حب الوطنی کے جذبات بھی پنہاں ہیں۔ ان کے موضوعات شعر میں ایک اہم موضوع ان کا تاریخی اور تہذیبی شعور ہے۔ ان کا مطالعہ ومشاہدہ عمیق ہے۔ زبان و بیان پر بے پناہ قدرت دکھائی دیتی ہے۔ اذان سحر کے مطالعہ وتجزیہ کا حاصل یہ ہے کہ انور اعظمی اپنے عہد کے ممتاز اور بڑے باکمال نظم نگار تھے۔ ان کی نظم نگاری کی متعدد ادبا و شعرا نے داد دی ہے۔ طوالت کے خوف سے اس کی مثالیں حذف کی جاتی ہیں۔

اذان سحر کی اشاعت 1967 میں ہوئی۔ اس کے 48 سال بعد ان کی غزلوں کا مجموعہ 'نالہ شب' مکتبہ الحسنات دہلی سے شائع ہوا ہے۔ دیباچے میں اس کی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی ہے کہ یہ مجموعہ اب تک کہاں تھا، کس نے مرتب کیا اور کن اصولوں پر کیا۔ نظر ثانی کس نے کی۔ راقم نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نالہ شب خود شاعر کا مرتب کردہ مجموعہ غزلیات ہے جو ان کے کاغذات میں ان کی اہلیہ کے پاس محفوظ تھا۔ راشد اعظمی نے انھیں شائع کرکے صحیح بات تو یہ ہے کہ ادبی دنیا پر احسان کیا ہے۔ اگر وہ توجہ نہ دیتے تو سوز وساز، فکر ونظر اور خواب وخیال کی باتیں خواب وخیال ہوجاتیں۔

نالہ شب کی اشاعت سے پہلے ان کے برادر خورد راشد اعظمی کے مجموعہ کلام پر ناچیز نے ماہنامہ الرشاد میں تبصرہ لکھا تھا۔ اور اب انور اعظمی کے نالہ شب کے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ دونوں بھائیوں کے زمانے جدا جدا ہیں لیکن دونوں کی پرواز ایک ہی فضا میں ہے۔ البتہ ایک کے یہاں ذات وکائنات کا مطالعہ زیادہ گہرا ہے تو دوسرے نے شعری روایتوں کے مطالعے کے ساتھ جدت وانفرادیت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ بلاشبہ نالہ شب اور نشاط غم دونوں بہت خوب صورت غزلوں کے مجموعے ہیں۔ ماضی قریب میں اعظم گڑھ کے شعری آسمان پر یہ دونوں مجموعہ غزلیات روشن آفتاب و ماہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں محض چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

جان دے دی نقش پائے یار پہ انور مگر
عشق پھر بھی ایک شوق رائگاں سمجھا گیا
مرے خدا تری دنیا میں یہ پسند آیا
جنوں تو عام ہے لذت جنوں عام نہیں
اس کا نغمہ محفل ہستی پہ چھا سکتا نہیں
جو شکست دل کی دھن پر گنگنا سکتا نہیں

انور اعظمی

شعور عشق نے بخشی وہ زندگی مجھ کو
ہجوم غم میں بھی ہوتی ہے اب خوشی مجھ کو
یقیں کی وادی پر نور تک بھی پہنچیں گے
حصار وہم وگماں سے نکل رہے ہیں ابھی
عالم آب و گل میں اے راشد
اک حسیں خواب زندگانی ہے

راشد اعظمی

ناچیز پر بے جا تحسین کا الزام عائد کیا جاسکتا ہے مگر وہ لوگ میرے خیالات سے اتفاق کریں گے جو نالہ شب سے بیدار ہوکر آفتاب تازہ کے جلو میں صبح امید کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ بھی گواہی دیں گے کہ انور اعظمی اپنی نظموں کے ساتھ غزلوں میں بھی تغزل اور تفکر کی آمیزش سے ذوق ووجدان پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ان اشعار سے جذبہ عمل کو مہمیز کرتے ہیں۔ افسوس کہ انور اور راشد دونوں سے ہماری ادبی دنیا نے انصاف نہیں کیا۔

انور اعظمی کی ادبی زندگی کا ایک گوشہ ان کی افسانہ نگاری ہے۔ وہ افسانہ کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ پاگل، دوپٹے کا پھندہ، گرہن، مرشد، فیصلہ کن، آزادی کے بعد اور کالا ہاتھ جیسے افسانے دل ودماغ میں اضطراب پیدا کرتے ہیں۔

شبنم سبحانی نے ان کے افسانوں کے مجموعہ 'افسانے' پر پیش لفظ لکھتے ہوئے پریم چند (1880-1936) کا نام لیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید بے شعوری میں ان کے لب پر پریم چند کا نام آگیا ہوگا۔ بلاشبہ پریم چند ایک بڑے فن کار کا نام ہے اور جدید روشن خیالی سے بھی ان کا ادبی شعور عبارت ہے۔ مگر انور اعظمی کے افسانے فکری و فنی ہر دو لحاظ سے ان سے منفرد اور یکسر مختلف ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ انور اعظمی کے شعور کی آفاقیت اور رچے ہوئے فنی شعور، ہیئت وکردار اور ان کے کرداروں کی انسانیت نوازی، رحم دلی، معاشرے کی تعمیر وترقی میں پریم چند سے کہیں بہتر کردار ادا کرسکتے ہیں۔ البتہ کمی ہے تو یہ کہ ہم نے اور ہمارے نقادوں نے اس افسانہ نگار کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی اور نہ صرف ان کے افکار وخیالات بلکہ ان کے افسانے بھی گوشہ گمنامی میں ہماری نظروں سے اوجھل ہوکر رہ گئے۔ ہم نے اب تک ان کا فنی تجزیہ بھی نہیں کیا۔ البتہ ڈاکٹر فیاض صاحب نے انور اعظمی کے افسانوں پر بڑا اچھا مضمون لکھا ہے۔

شبنم سبحانی مرحوم نے ان چند رسائل کے نام لیے ہیں جن میں وہ شائع ہوئے مثلاً معیار، انوار، فردوس، سلسبیل اور حیات نو وغیرہ۔ ان رسائل کی محدود دنیا نے انور اعظمی کے فکر وفن کی شہرت کو فصیل شہر سے باہر جانے نہیں دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انور اعظمی اپنے عہد کے ایک معیاری افسانہ نگار ہیں۔ ان کی عظمت کہانیوں کی اس سیریز سے اور بڑھ جاتی ہے جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ جن کے نام یہ ہے: ایک بات۔ لہرو۔ مسلمان لڑکے۔ کچھ دن گھر سے دور۔ شاہین۔ مغرب بعد۔ اس سیریز کو البدر بک سینٹر سرائے میر نے شائع کیا ہے۔ یہ کہانیاں ادب اطفال کا بنیادی حصہ ہیں۔ افسانوں کی دنیا میں بالخصوص ادب اطفال کے میدان میں کون ہے جو بچوں کی ان کہانیوں سے واقف ہے؟ حالانکہ بچوں کی یہ کہانیاں آج بھی بے حد مفید اور کارآمد ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے ایک ڈرامہ 'براہیم' بھی لکھا ہے۔ جو شائع ہوا ہے۔ اور بچوں میں خاصا مقبول ہے۔

اعظم گڑھ کے ادبی سرمایے کا اگر جائزہ لیا جائے تو انور اعظمی کا ادبی سرمایہ اور ادبی سفر مختصر ہونے کے باوجود فکری وفنی عظمت میں معاصر ادبا وشعرا سے کسی طرح کم رتبہ نہیں۔ ذہنی اور فکری آسودگی کے لیے ان کے افسانے ممکن ہے کم کارآمد ہوں لیکن ان کی شاعری اذان سحر اور نالہ شب دیر وکلیسا کا مزاج برہم کرنے کے لیے کافی ہیں۔

انور مری اذان سحر کچھ نہ ہو مگر
برہم مزاج دیر وکلیسا ہوا تو ہے

■

Dr. Mohd Ilyas Al-Azmi
Darul Musannefin, Shibli Academy
Azamgarh (UP)
Mob.:9838573645

اختر شاہجہاں پوری

الطاف شاہ آبادی کا شعری مزاج

شاہ آباد ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں بڑے بڑے آل انڈیا مشاعرے ہوا کرتے تھے اور سامعین کے ذوق کا یہ عالم کہ صبح تک مشاعرے میں حاضر رہتے اور شعرا کو داد و تحسین سے خوب خوب نوازتے۔ یہی نہیں کئی انجمنیں ہر ماہ طرحی مشاعرے کرتی تھیں۔ شائقین ادب کا ذوق شاعری کبھی کم ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ شاہ آباد میں شاعروں کی اچھی خاصی تعداد تھی آج بھی کسی شہر کے مقابلے تعداد کم نہیں۔ سید الطاف علی الطاف شاہ آبادی، قیوم شاہ آبادی، ڈاکٹر نعیم اختر، معصوم شاہ آبادی، سلطان شاہ آبادی، انیس شاہ آبادی، حنیف شاہ آبادی، حکمت شاہ آبادی، ذیشان شاہ آبادی اور ان کے علاوہ بہت سے شاعر ہیں جنھوں نے ادبی محفلوں میں شرکت فرما کر رونق بخشی۔

الطاف شاہ آبادی (شاہ آباد کے شاعروں میں اہم مقام کے حامل تھے۔ ان کی شعری کاوشوں پر کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ الطاف شاہ آبادی کی شاعری نصف صدی سے پہلے کی شاعری کے ہم پلہ ہے تو بیجا نہ ہوگا لیکن الطاف شاہ آبادی نے اس کو نیا رنگ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری پر جدیدیت کا لیبل لگا کر نظر انداز بھی نہیں کر سکتے نہ بوسیدہ خیالات کہہ کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں جو لفظیات اور تراکیب اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں ان سے صرف نظر ممکن ہی نہیں۔ چند شعر

احترام جنوں بھی لازم ہے
چاک دامن سیا نہیں کرتے

اشعار میں ہو جان تو مہکیں کے فضا میں
کہتے ہیں کہ چھپتی نہیں فنکار کی خوشبو

جب کسی جام شکستہ کی کھنک سنتا ہوں
یاد آجاتا ہے اپنا دل ناکام مجھے

وہ زمانے سے آشنا نہ ہوئے
جو زمانے سے ہیں زمانے میں

یہ بھی اک فن ہے جو ہر اک کو میسر نہ ہوا
نئے انداز میں ہر بات پرانی لکھے

اب میں الطاف شاہ آبادی کا تقابلی جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں تا کہ ان کی سمت سفر کا اندازہ لگایا جا سکے۔

فیض احمد فیض فرماتے ہیں کہ خیال کے انجم جگر کے داغ یہ جتنے بھی چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں۔ تری محفل سے میں تنہا نہیں آیا ہوں بلکہ میرے ساتھ تیری یاد دلانے کے لیے یہ سب کچھ میرے ساتھ ہیں۔ شعری بھوپالی فرما رہے ہیں کہ ظلمتوں کی راہوں میں ہم نے ہی لوگوں کی رہنمائی کی اس لیے کہ ہم چراغ تھے اور چراغ کا کام دوسروں کو راستہ دکھانا ہے۔ محسن احسان نے فرمایا کہ ہوا نے بہت کوششیں کیں کہ ہمیں بجھا دے لیکن ہم وہ چراغ ہیں کہ اس میں جو روشنی ہے وہ عام روشنی نہیں بلکہ یہ روشنی انا کی ہے اس کو بجھایا نہیں جا سکتا۔ عبیداللہ علیم کہہ رہے ہیں کہ ہم وہ چراغ ہیں جو ہوا کے دوش پر رکھا ہوا ہے اور اگر وہ چراغ بجھ جائے تو کسی سے شکایت بھی نہیں کی جا سکتی۔ الطاف شاہ آبادی فرما رہے ہیں کہ ہم اردو ادب کے دیپ جلا رہے ہیں تم انھیں کبھی نہ بجھا سکو گے۔ اردو ہمیشہ زندہ رہے گی۔

شام نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

فیض احمد فیض

ظلمتوں کی راہوں میں ہم نے رہنمائی کی
ہم چراغ تھے لیکن دوسروں کے کام آئے

شعری بھوپالی

بجھا کے رکھ دے یہ کوشش بہت ہوا کی تھی
مگر چراغ میں کچھ روشنی انا کی تھی

محسن احسان

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی

عبیداللہ علیم

تم کیا بجھا سکو گے چراغ سخن کبھی
اردو ادب کے دیپ جلاتے رہیں گے ہم

الطاف شاہ آبادی

علامہ اقبال نے خود کو پرندوں کی دنیا کا درویش کہہ کر اشارۃً شاہین کہا اور یہ واضح کر دیا کہ شاہیں آشیانہ نہیں بناتا۔ اگر غور کیا جائے تو علامہ کی شاعری میں شاہین کا استعمال اکثر ہوا ہے اور اس سے اشعار کی معنویت میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ پروین شاکر کہہ رہی ہیں کہ پرندے سہمے ہوئے اور درخت خوف زدہ ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ طوفان آنے والا ہے۔ یہ اشارہ فساد کی آمد آمد کا اشارہ بھی ہو سکتا ہے۔ ظفر اقبال ظفر نے کہا کہ پرندوں کی بستی کسی نے جلا دی، فضا میں جو راکھ اڑتی ہوئی نظر آرہی ہے، وہ

اس بات کا ثبوت ہے۔ اسے بھی فساد کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مہدی پرتاپ گڑھی کہہ رہے ہیں کہ جب موسم کا مزاج بدلتا ہے تو پرندے بھی اپنا ٹھکانا بدلنے لگتے ہیں۔ محفوظ جگہ کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ الطاف شاہ آبادی صیاد کی مہربانی کو بہ نظر غائر دیکھ رہے ہیں کہ وہ پرندوں کو رہائی دے رہا ہے۔ حالانکہ صیاد پرندوں کو قید کرتا ہے۔ ضرور اس میں کوئی مصلحت ہے۔

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ
علامہ اقبال

پرندے سہمے ہوئے ہیں درخت خوف زدہ
یہ کس ارادے سے گھر سے نکل رہی ہے ہوا
پروین شاکر

پرندوں کی جلا دی کس نے بستی
فضا میں راکھ اڑتی ہے پروں کی
ظفر اقبال ظفر

جب بھی بدلا مزاج موسم کا
کچھ پرندے بھی گھر بدلنے لگے
مہدی پرتاپ گڑھی

مہرباں آج کل صیاد کیوں ہے
پرندوں کو رہائی دے رہا ہے
الطاف شاہ آبادی

جلیل مانک پوری نے فرمایا کہ ہمارا دردِ دل ایسا لگتا ہے کہ لوگ داستان سمجھ کر سنتے ہیں۔ انھیں ہمارے غم واندوہ کا ادراک نہیں ہوسکتا اور یہ عام بات ہے۔

شکیل بدایونی فرمارہے ہیں کہ حالِ دل، احوالِ غم، شرحِ تمنا، عرضِ شوق بیخودی میں کہہ گئے افسانہ در افسانہ ہم۔ بیخودی میں اتنا ہوش کہاں رہتا ہے کہ جو بات بتانے کو ہو وہی بتائی جائے۔ بیخودی تو بیخودی ہی ہوتی ہے۔ شمس بلگرامی فرمارہے ہیں کہ جو بھی ترا جلوہ دیکھنا چاہے وہ تیرا جلوہ ہر شے میں دیکھ سکتا ہے، آئینۂ قدرت میں ترا جلوہ عکس ریز ہے دیکھنے والی نظر چاہیے۔ انور کانپوری فرمارہے ہیں کہ تیری بیتابیِ دل کا ہی یہ کمال ہے کہ وہ تیرا افسانہ بڑے غور اور انہماک سے سنتے ہیں۔ جذبۂ محبت رائیگاں نہیں گیا۔ حنا لکھنوی نے فرمایا کہ ہماری بیگانگیِ دل کے افسانے کو کیا کیا جائے اس کو سن کر جب اپنے ہی اپنے نہیں ہوئے تو غیروں سے کیا شکوہ۔ الطاف شاہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے کہ وہ چمن کا ذکر ہو یا صحرا کا قصہ کوئی مکمل نہیں ہے۔ سب آدھے ادھورے ہوتے ہیں۔

دل بہلنے کو لوگ ملتے ہیں
دردِ دل داستان ہو گویا
جلیل مانک پوری

حالِ دل، احوالِ غم، شرحِ تمنا، عرضِ شوق
بےخودی میں کہہ گئے افسانہ در افسانہ ہم
شکیل بدایونی

آئینۂ قدرت میں جو چاہے تجھے دیکھے
ہر شے میں ترا جلوہ ہر جا ترا افسانہ
شمس بلگرامی

بیتابیِ دل کام آہی گئی آخر
وہ غور سے سنتے ہیں انور ترا افسانہ
انور کانپوری

بیگانگیٔ دل کے افسانے کو کیا کہیے
اپنا نہ ہوا اتا بیگانے کو کیا کہیے
حنا لکھنوی

چمن کا ذکر یا صحرا کا قصہ
مکمل کوئی افسانہ نہیں ہے
الطاف شاہ آبادی

ڈاکٹر مناظر عاشق فرمارہے ہیں کہ کسی کو دل دینا علت سے خالی نہیں۔ اس نقصان میں بھی فائدہ ہے۔ اس لیے کہ دل اگر پاس رہے تو کچھ نہ کچھ پریشانی کا باعث رہے گا۔ طالب ممتاز نے فرمایا کہ میرا دل محبت کا آئینہ بن کر چمک رہا ہے یعنی میرا دل بھی کائنات کے ساتھ دھڑک رہا ہے۔ احمد جمال صادق کہہ رہے ہیں کہ ہمارا شکستہ دل ہی عشق کا سرمایہ ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ مجھ فقیر کا جام جہاں نما ہی تو ہے۔

اخلاق ساگری کہہ رہے ہیں ان کا محبوب بھی ان کے دل کی دھڑکنوں کے ساز پر نغمہ خواں ہے۔ میرا دل نہ ہوکر ان کی بزم ناز ہوکر رہ گیا ہے۔ الطاف شاہ آبادی نے کتنی سادگی سے کہا ہے کہ ان کا محبوب جب چپکے سے مسکرا دے گا تو خوشی کے مارے ان کے دل میں لاکھوں دیے جل جائیں گے۔ یہ خوشی کی انتہا کہی جاسکتی ہے اور عشق کی معراج بھی۔

دل کا دینا خالی از علت نہیں
فائدہ اپنا ہے اس نقصان میں
ڈاکٹر مناظر عاشق

چمک رہا ہے محبت کا آئینہ بن کر
دھڑک رہا ہے مرا دل بھی کائنات کے ساتھ
طالب ممتاز

دلِ شکستہ ہی سرمایہ عشق کا ٹھہرا
یہی فقیر کا جام جہاں نما ٹھہرا
احمد جمال صادق

نغمہ خواں ہیں خود وہ میری دھڑکنوں کے ساز پر
یہ مرا دل ہے کہ یارب ان کی بزم ناز ہے
اخلاق ساگری

جب وہ چپکے سے مسکرا دے گا
دل میں لاکھوں دیے جلا دے گا
الطاف شاہ آبادی

ڈاکٹر بشیر بدر کہہ رہے ہیں کہ بھگوان ہی بھیجیں گے چاول سے بھری تھالی۔ مظلوم پرندوں کی معصوم سبھاؤں میں۔ یہ بات ان کے ایمان کی پختگی کی مظہر ہے۔ یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا رکھوالا اس کا اللہ ہوتا ہے۔ اپنی مخلوق کی حفاظت کرنا ان کی ضرورتیں پوری کرنا اللہ ہی کے ذمے ہے۔ احمد وصی کہہ رہے ہیں کہ پرندوں نے ایک تمدن تو ہمیں ضرور دیا کہ جب شام ہو تو اپنے گھر واپس آنا چاہیے۔ اس میں جو سچائی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ طارق متین کہہ رہے ہیں کہ پاگل ہوائیں بڑی منھ زور ہیں اس خوف سے پرندہ شاخ پر سہا اور سمٹا ہوا بیٹھا ہے۔ پروین شاکر کہہ رہی ہیں کہ شاخوں پر پرندے اس طرح سمٹے آئے کہ انھیں جگایا نہ جاسکا، یہ کسی انہونی کی طرف اشارہ ہے۔ الطاف شاہ آبادی کہہ رہے ہیں کہ یہ پرندے عام طور پر غم سے آشنا ہوتے ہیں ان کا سامنا مشکلوں اور پریشانیوں سے ہوتا رہتا ہے اس لیے شکوہ نہیں کرتے۔

اک تمدن ہم کو ان پرندوں نے دیا
شام ہوتے ہی گھروں کو لوٹ آنا چاہیے
احمد وصی

بڑی منھ زور ہیں پاگل ہوائیں
پرندہ شاخ پر سہما ہوا ہے
طارق متین

پر سمیٹے ہوئے شاخوں پہ پرندے آکر
ایسے سوئے کہ جگائے نہ گئے
پروین شاکر

جو پرندے ہیں آشنا غم سے
شکوہ بال و پر نہیں کرتے
الطاف

شعری بھوپالی فرمارہے ہیں کہ ظلمتوں کی راہوں میں ہم نے راستہ دکھانے کا کام کیا۔ ہم چراغ تھے اس لیے دوسروں کے کام آئے۔ چراغ کا کام یہی ہے کہ ظلمتوں میں اپنی روشنی بکھیرے اور اندھیرے کو دور کرے۔ انور نظامی کہہ رہے ہیں کہ تیز آندھی بھی ضروری تھی اگر دہلیز پر چراغ جلانا تھا۔ آندھی اور چراغ کی دشمنی تو جگ ظاہر ہے۔

محسن احسان کہہ رہے ہیں کہ ہوا کی تو یہ کوشش تھی کہ چراغ کو بجھا دے لیکن چراغ میں جو روشنی تھی وہ انا کی تھی۔ قیوم طاہر کہہ رہے ہیں کہ ہمارے رشتے ہوا کے ساتھ بہت پرانے ہیں لیکن چراغ تو جلانا ہی ہوں گے۔ اس لیے ہوا سے کشیدگی ہونا ضروری ہے۔ الطاف شاہ آبادی کہہ رہے ہیں کہ شام ہوتے ہی تیری یادوں کے چراغ روشن ہو گئے اس لیے شب تنہائی میں بھی سکون حاصل ہے۔

ظلمتوں کی راہوں میں ہم نے رہنمائی کی — ہم چراغ تھے لیکن دوسروں کے کام آئے
شعری بھوپالی

مصالحت بھی ضروری تھی تیز آندھی سے — اگر چراغ ہی دہلیز پر جلانا تھا
انور نظامی

بجھا کے رکھ دے یہ کوشش بہت ہوا کی تھی — مگر چراغ میں کچھ روشنی انا کی تھی
محسن احسان

ہوا کے ساتھ بھی رشتے بہت پرانے ہیں — مگر چراغ تو ہر حال میں جلانا ہے
قیوم طاہر

ہو گئے شام سے روشن تری یادوں کے چراغ — لطف آنے لگا مجھ کو شب تنہائی میں
الطاف شاہ آبادی

درد فرما رہے ہیں کہ آنکھیں خود پریشان حال تھیں دل کا بھی خانہ خراب کیا۔ یعنی آنکھیں اور دل دونوں نے مضطرب کر دیا ہے۔ اسعد بھوپالی کہہ رہے ہیں کہ میری آنکھوں نے اگر خوشی کا خواب دیکھا تو تیرے غم نے میری نیند اڑا دی۔ مجھے سونے نہیں دیا۔ فراق گورکھپوری فرما رہے ہیں کہ بھری محفل میں تیری آنکھوں نے مجھ سے بات کر لی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔ سبطین اخگر کہہ رہے ہیں کہ مجھے دیکھو مرا چہرہ نیا ہے اس لیے کہ میری آنکھوں میں صدیوں کا پتہ ہے۔ نسیم نکہت فرما رہی ہیں کہ جاگتی آنکھوں کے سفر میں ہم تنہا نہیں ہیں ہمارے ارد گرد بھی بے خواب شبستاں ہیں جہاں لوگ نیند سے محروم ہیں۔ الطاف شاہ آبادی فرما رہے ہیں کہ شام سے صبح ہو گئی لیکن انتظار ختم نہیں ہوا جس کا انتظار تھا وہ نہ آ سکا تھک ہار کر آنکھیں مایوس ہو گئیں۔

آپ تو تھیں، پر اس کا بھی کیا خانہ خراب — درد اپنے ساتھ آنکھیں دل کو بھی لے ڈوبیاں
درد

خوشی کا خواب بھی دیکھا جو میری آنکھوں نے — جگا جگا کے ترے غم نے انتقام لیا
اسعد بھوپالی

بھری محفل میں ہر اک سے بچا کر — تری آنکھوں نے مجھ سے بات کر لی
فراق

مجھے دیکھو مرا چہرہ نیا ہے — مری آنکھوں میں صدیوں کا پتا ہے
سبطین اخگر

تنہا نہیں ہم جاگتی آنکھوں کے سفر میں — بے خواب شبستاں پس دیوار بہت ہیں
نسیم نکہت

شام سے صبح ہو گئی آخر — بجھ گئیں انتظار کی آنکھیں
الطاف شاہ آبادی

شاد عظیم آبادی کہہ رہے ہیں کہ اگر دنیا بنانے والے کو دیکھنا ہے تو دنیا کو بہ نظر غائر دیکھا جائے۔ آئینے میں ہی آئینہ ساز کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مرزا خلیل کہہ رہے ہیں کہ میں آئینہ ہوں اور آئینہ جھوٹ نہیں بولتا تو مجھ سے ناراض ہو کر مجھے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر۔ شمیم عثمانی کہہ رہے ہیں کہ میرے چہرے پہ اتنی خراشیں نہیں تھیں کہ تم نے ٹوٹا ہوا آئینہ دکھا دیا ہوگا۔ امۃ الرؤف نسرین کہہ رہی ہیں آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر خیال آیا کہ تم مجھے بے مثال کہتے تھے تو غلط نہیں کہتے تھے۔ میں واقعی خوبصورت ہوں۔ شاکر جلیل کہہ رہے ہیں کہ میں گھر کے آئینوں میں بڑا بدحواس تھا ہر آئینے میں میں اپنے آپ کو بے لباس دکھائی دے رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گھر کے آئینوں نے مجھے ویسا ہی دکھایا جیسا وہ مجھے دکھانا چاہتے تھے۔ الطاف شاہ آبادی کہہ رہے ہیں کہ اب تو آئینے بھی سچ نہیں بولتے اس لیے آئینے کا اعتبار گیا۔

غزل کو ہمیشہ لبوں پہ سجاتے رہنے کا عزم. آئینہ گر، کورا کاغذ، ظرف سمندر، دیے کا ہوا میں بھی روشن رہنا۔ اچھی اچھی تراکیب سے معنویت میں اضافہ تو ہوا ہی ہے. مجھے یقین ہے کہ الطاف شاہ آبادی کی شاعری زندہ رہے گی اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا.

صانع کو دیکھنا ہے تو عالم پہ کر نظر — آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا
شاد عظیم آبادی

آئینہ ہوں میں کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا — اتنا ناراض نہ ہو مجھ سے مجھے چور نہ کر
مرزا خلیل

میرے چہرے پہ نہ تھیں اتنی خراشیں یارو — تم نے ٹوٹا ہوا آئینہ دکھایا ہے مجھے
شمیم عثمانی

آئینہ دیکھ کر خیال آیا — تم مجھے بے مثال کہتے تھے
امۃ الرؤف نسرین

میں گھر کے آئینوں میں بڑا بدحواس تھا — ہر عکس میرے چاروں طرف بے لباس تھا
شاکر جلیل

سچ کی صورت نظر نہیں آتی — آئینے کا اعتبار گیا
الطاف شاہ آبادی

الطاف شاہ آبادی کے شعروں کا تقابلی جائزہ پیش کر دیا تاکہ اہل ذوق ان کی سمت سفر کا اندازہ لگا سکیں۔ جائزے میں لغوی معنی سے سروکار رکھا گیا ہے۔ مرادی نہیں اس لیے کہ مضمون طویل ہو جاتا۔ کچھ اور پسندیدہ اشعار پیش کر کے اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا۔

فیاض و میر و غالب و مومن نہیں تو کیا — پھر بھی غزل لبوں پہ سجاتے رہیں گے ہم
ہوا ہے غم اسے آئینہ ٹوٹنے کا مگر — یہ دیکھنا ہے کہ آئینہ گر پہ کیا گزری
کورا کاغذ ہے شاید مری زندگی — اس میں اچھا برا کچھ لکھا بھی تو ہو
دیکھنا مجھ کو اگر ہے ذرا نزدیک سے دیکھ — دور سے ظرف سمندر نہیں دیکھا جاتا
جو ہواؤں میں بھی رہے روشن — کوئی ایسا دیا جلانا ہے

غزل کو ہمیشہ لبوں پہ سجاتے رہنے کا عزم۔ آئینہ گر، کورا کاغذ، ظرف سمندر، دیے کا ہوا میں بھی روشن رہنا۔ اچھی اچھی تراکیب سے معنویت میں اضافہ تو ہوا ہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ الطاف شاہ آبادی کی شاعری زندہ رہے گی اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

■

Akhtar Shahjahanpuri
Rangeen Chaupal
Shahjahanpur - 242001 (UP)
Mob.:0354748953

نوشاد منظر

حکیم آغا جان عیش دہلوی کی غزل گوئی

حکیم آغا جان عیش کا تعلق اس مغل خاندان سے تھا جو عہد شاہی میں نواح بخارہ سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا۔ پہلے اس کا قیام کشمیر میں ہوا پھر روزگار کی تلاش وجستجو انھیں دہلی کی جانب کھینچ لائی۔ عیش دہلوی کے دادا حکیم خواجہ عبدالشکور اپنے زمانے کے مشہور طبیب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی آمد پر ان کا پرتپاک خیر مقدم ہوا اور بہت جلد ان کا شمار اہل ثروت میں ہونے لگا۔

عیش کی پیدائش 1192ھ بمطابق 1779 میں دہلی کے قریب ہوئی۔ چونکہ ان کی ابتدائی زندگی کے تعلق سے کوئی ٹھوس شواہد موجود نہیں ہیں مگر ان کے ایک معاصر محمد ارتضیٰ خان شیدا دہلوی نے اپنی تالیف 'مراۃ الاشباہ' میں کچھ اشارے کیے ہیں اور یہی اشارے ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ چونکہ عیش کے دادا اور والد نے مال و دولت اور بڑی جائیداد حاصل کی تھی، اس لیے اس بنیاد پر یہ قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ عیش کی پرورش اس زمانے کے مسلم معاشرے کی رسم کے مطابق گھر پر ہوئی ہوگی۔ ''آب حیات'' میں مولانا محمد حسین آزاد نے عیش کو ''زیور علم اور لباس کمال سے آراستہ'' بتایا ہے۔ وہ فن طب میں بھی ماہر تھے۔ اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیش دہلوی نے نہ صرف مروجہ رواج کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی ہوگی بلکہ دیگر علوم بھی حاصل کیا ہوگا۔

عیش کی شاعری

عیش دہلوی نے یوں تو قصائد بھی لکھے ہیں مگر میں ان کی غزلیہ شاعری پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا کب کی اس سلسلے میں مکمل خاموشی ہے۔ 'کلیات عیش' کی مرتبہ ڈاکٹر حبیبہ بانو نے بھی اس حوالے سے کوئی ٹھوس بات نہیں کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''عیش نے شاعری کب شروع کی اور اس کے کیا محرکات تھے، اس کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات حاصل نہیں لیکن اس کی ابتدا جب بھی ہوئی ہو، انھوں نے زمانے کے دستور کے مطابق رحمت اللہ مجرم اکبرآبادی کا تلمذ اختیار کیا۔''

(کلیات عیش دہلوی، مرتبہ حبیبہ بانو، ص 63)

عیش دہلوی نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں مشاعروں میں شرکت کی۔ محمد حسین آزاد نے دو مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ایک مشاعرے میں وہ اور عیش دونوں شریک تھے۔ مولوی باقر بھی وہیں موجود تھے، عیش دہلوی نے اپنا ایک شعر سنایا۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لیے　　　تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

اب اسے اتفاق ہی سمجھا جائے گا کہ اسی مضمون پر ایک شعر محمد حسین آزاد کا بھی تھا۔ وہ ادب اور پاس و لحاظ کی وجہ سے اپنے اس شعر کو سنانا نہیں چاہتے تھے مگر ان کے والد مولوی محمد باقر نے کہا کہ چونکہ یہ مضمون نہ پہلے عیش نے باندھا تھا اور نہ ہی آزاد نے اس لیے طبیعت اور فکر کے میلان کے اندازے کی خاطر وہ شعر ضرور سنائیں۔ محمد حسین آزاد کا شعر تھا۔

اے شمع! تیری عمر طبیعی ہے ایک رات　　　رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

محمد حسین آزاد نے ایک اور مشاعرے کا ذکر کیا ہے، جس میں عیش دہلوی اور غالب موجود تھے۔ اس مشاعرے کی روداد محمد حسین آزاد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اہل ظرافت بھی اپنی نوک جھونک سے چوکتے نہ تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مرزا (غالب) بھی مشاعرہ میں تشریف لے گئے۔ حکیم آغا جان عیش ایک خوش طبع، شگفتہ مزاج شخص تھے۔ انھوں نے غزل طرحی میں یہ قطعہ پڑھا۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　　مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے　　　مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

(بحوالہ کلیات عیش، ص 71)

عہد غالب اور ذوق میں کسی شاعر کا یہ انداز اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ عیش اپنے عہد کے اہم شعرا میں سے ایک تھے۔ ورنہ کسی معمولی شاعر کی غالب کے کلام پر اعتراض کرنے کی کیا مجال۔

عیش دہلوی نے اپنی پوری زندگی دہلی میں گزاری مگر ان کی شاعری پر لکھنوی

اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت کے نمونے بھی موجود ہیں مگر ان کی شاعری کا بڑا حصہ خارجیت پر مبنی ہے۔ یہی نہیں محاورہ بندی، رعایت لفظی، جدت قافیہ اور دہلی کی ٹھیٹ زبان کو بھی ان کی شاعری میں نشان زد کیا جاسکتا ہے۔

کہے ہے عشق میں ناصح کہ ہے ضرر دل کا　　جو واقعی ہے ضرر یہ ہے تو ضرر کیا ہے
تو راہِ عشق کے صدموں سے مت ڈرا واعظ!　　جو سر فروش ہیں اس رہ میں ان کو ڈر کیا ہے

ڈاکٹر حبیبہ بانو نے عیش دہلوی کی زبان اور شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

"عیش کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کے کلام میں 'طرز سخن میر کی بو' ہے، ٹھیک نہیں۔ نہ اسلوب بیان کے لحاظ سے، نہ کیفیت کے پہلو سے، وہ کسی طرح میر کے تتبع نہیں کہے جاسکتے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ ان کی زبان بہت صاف ہے۔ اس میں بالعموم وہ ثقالت بھی نہیں جو اس عہد کے بیشتر شعرا کا طرۂ امتیاز ہے اور تو اور زبان کے معاملے میں انھوں نے شاہ نصیر کی بھی پیروی نہیں کی، حالانکہ وہ نصیر کو سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے تھے۔ بیشتر عیش کی زبان ٹھیٹ اردو زبان ہے۔ فارسی، عربی کی بوجھل ترکیبوں سے پاک جیسی وہ بولی جاتی ہے۔" (کلیات عیش دہلوی، حبیبہ بانو، ص 76)

چند اشعار دیکھیے۔

میں نے پوچھا اور کہا اس نے سنا اور سے اور　　تھا سوال اور جواب اس نے دیا اور سے اور
کس منہ سے ہم کریں گے بھلا یار کا گلہ　　ہم کو تو عیش! شکوۂ اغیار بھی نہیں
بدلتا ہے یہ ہر دم رنگ کیا کیا　　دکھاتا ہے فلک نیرنگ کیا کیا

اس قسم کے بہت سے اشعار ہیں جن میں عیش دہلوی کی زبان دانی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ان کی زبان سلیس اور سادہ ہے اور بقول حبیبہ بانو یہی رنگ ان کی پہچان بھی ہے اور ان کے معاصرین کے یہاں یہ سادگی نظر نہیں آتی ہے۔ گرچہ عیش دہلوی کے یہاں لکھنوی رنگ حاوی ہے مگر ان کے بعض اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دہلی کے مقابلے لکھنؤ کی زبان کو دوئم درجے کی زبان تسلیم کرتے تھے۔ بلکہ وہ تو ناسخ اور آتش کو بھی ذوق، ظفر اور اپنی زبان دانی کے آگے ہیچ تصور کرتے تھے۔

ناسخ و آتش سے کہہ دو کوئی تم نے بھلا　　طرز عیش و حضرت ذوق و ظفر پائی کہاں!

عیش دہلوی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محاورے پر قدرت رکھتے تھے۔ بلکہ کئی اشعار ایسے ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے محاوروں کو جوں کا توں استعمال کرلیا ہے۔ چند اشعار دیکھیے۔

مثل ہے جو کہ چھوٹا منہ بڑی بات اس جگہ سچ ہے　　یہ منہ پایا ہے کس نے نام لے جو تیری عظمت کا
عیش! زلف اس رخ پہ چھٹتی ہے تو ہو جاتی ہے شام　　اور اٹھتی ہے تو ہو جاتا ہے تڑکا نور کا
کہا جو رحم مرے حال پر ذرا کھاؤ　　تو ہنس کے بولے کہ چلتے بنو ہوا کھاؤ

عیش دہلوی کی شاعری میں خارجیت ضرور ملتی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان کی شاعری کا ایک حصہ ایسے اشعار پر مبنی ہے جس میں اخلاقی تعلیمات کو عام کرنے پر توجہ صرف کی گئی ہے۔ چونکہ عیش دہلوی خود بھی مذہبی آدمی تھے لہٰذا ان کی شاعری میں مذہبی تعلیمات کا پایا جانا تعجب کی بات نہیں۔ ان کے کئی اشعار میں بزرگوں سے ان کی محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ عیش کے کلام میں مذہبی اور اخلاقی پہلوؤں کا ذکر جابجا نظر آتا ہے۔

عیش سب اپنی برائی ہے نہیں کوئی برا　　سب بھلے ہیں یہ اگر آپ ہے انساں اچھا
مروت جس کو کہتے ہیں وہ شرط آدمیت ہے　　جہاں میں چاہیے ہے پاس ہو انساں کو انساں کا

عیش دہلوی نے اپنے معاصر عہد پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ دہلی کی تباہی کو انھوں

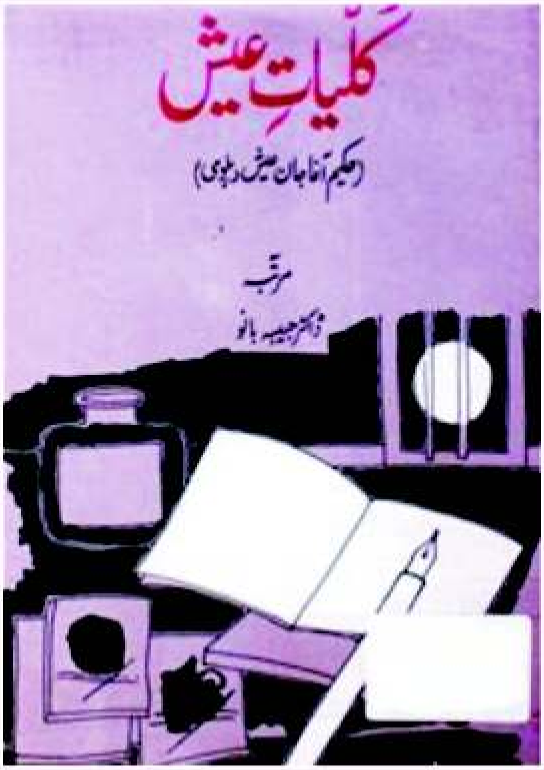

نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ 1857 کی ناکام بغاوت پر اس عہد کے کئی شعرا و ادبا نے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ خطوط غالب میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے۔ فتح کی امید اور شکست خوردہ معاشرے کا ذکر عیش دہلوی کی شاعری میں بھی موجود ہے۔

کیا جانے اہل دہلی سے کیا بات ہوگئی　　جو دہلی ایسی مورد آفات ہوگئی
ہر شب شب برأت تھی ہر روز روز عید　　یا اب وہ جا محل مخافات ہوگئی

عیش دہلوی کا خیال ہے کہ 1857 کے بعد دہلی کی شان نہ صرف خاک میں مل گئی بلکہ اب اس کا نام و نشان بھی مٹ گیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر مکان زمین دوز ہوگیا ہے۔ وہ دہلی جہاں کی ہر شب اپنی رونق کی وجہ سے شب برأت اور عید معلوم ہوتی تھی آج نہ صرف ویران ہے بلکہ یہاں ڈر اور خوف کا بسیرا ہے۔

عیش کی شاعری کے کئی پہلو ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ اسکول کی پیروی کرتے ہوئے رعایت لفظی کا استعمال کیا حالانکہ اہل دہلی اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ محاوروں کے استعمال کو تو پسند کرتے تھے مگر رعایت لفظی کی بدنما شکل کو انھوں نے پسند نہیں کیا۔ عیش دہلوی کے یہاں رعایت لفظی کی مثال دیکھیے۔

اس نے زخموں پہ کی نمک پاشی　　ہم سے حق نمک ادا نہ ہوا
ہاتھ کو پہلے تو اپنے کھینچ لے　　پھر جدھر چاہے تو لمبے پیر کر

عیش دہلوی کے کلام کو پڑھتے ہوئے دو تین باتیں بالخصوص متوجہ کرتی ہیں۔ اول ان کے اشعار میں جمع الجمع کے ایسے الفاظ ہیں جو شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے استعمال کیے ہوں۔ عیش دہلوی جیسا شاعر جسے اپنی زبان دانی پر نہ صرف فخر ہو بلکہ وہ خود کو آتش اور ناسخ سے اہم بتاتا ہو وہ اس طرح جمع الجمع کا استعمال کرے گا۔ چند اشعار دیکھیے جن میں یہ الفاظ نہ صرف کھٹکتے ہیں بلکہ مناسب بھی معلوم نہیں ہوتے۔

ساتھ اغیاروں کو لے کر پھرا کون بھلا　　یہ سرا پہلے کدھر سے کہو شر کا نکلا
وہ نگاہیں کہ جو دل چھنتے تھے زہادوں کے　　اور پابند وہ دل کرتے تھے آزادوں کے
اور وہ کرلیتے تھے قابو میں دل عبادوں کے　　بید کی طرح سے دل کانپے تھے جلادوں کے

مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ بہت سے اہل علم بھی عیش دہلوی کی شاعری تو دور نام اور عہد سے بھی واقف نہیں ہوں گے۔ بعض لوگ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری اس کمال کو نہیں پہنچتی کہ زمانہ انہیں یاد رکھے مگر ہمیں دو باتیں یاد رکھنی چاہیے اول عیش دہلوی کی شاعری کا دائرہ وسیع تر نہ سہی پھیلا ہوا ضرور ہے۔ دوسری بات غالب کے معاصر کے طور پر بھی ان کا ذکر نہ کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔

ان اشعار میں اغیاروں، زہادوں اور عبادوں کی ترکیب غلط ہے اور جمع الجمع کا یہ طریقہ نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کے ایسے اشعار بھی ہیں جن میں تذکیر وتانیث کو مروجہ اصول کے برخلاف استعمال کیا گیا ہے۔

دیکھنا چاہیے لیلیٰ کو بچشم مجنوں   پوچھنا چاہیے بلبل سے چبھن غنچے کا

میں تو کہتا تھا وہ آویں گے وہ کہتا تھا نہیں   مجھ میں اور دل میں یہی رات کو تکرار رہا

ظاہر ہے چبھن اور تکرار مونث استعمال ہوتے ہیں مگر عیش دہلوی نے انھیں مذکر استعمال کیا ہے جو کہ مناسب نہیں۔

عیش دہلوی کے یہاں تعلی کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ وہ ایک طرف جہاں خود کو ذوق اور ظفر کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں وہیں اپنی زبان دانی پر فخر کرتے ہوئے آتش وناسخ کو کمتر بھی ثابت کرتے ہیں۔ وہ یہیں نہیں رکتے بلکہ اپنی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

عیش! سن یہ شعر روح میر بولی قبر میں   اے جزاک اللہ زباں سحر آفریں اتنی تو ہے

عیش دہلوی کے یہاں عشق کی مختلف کیفیات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کے یہاں عشق کا روایتی تصور ضرور ہے مگر اس میں بھی ان کی انفرادیت نظر آتی ہے:

نہیں عاشق ہوئے گر تم تو رنگت زرد پھر کیوں ہے   نہیں گر دل لگی صاحب تو دل درد پھر کیوں ہے

نہ ہوش جان نہ پروائے تن نہ نیند نہ بھوک   جہاں میں عشق بتاں کا غرض مآل یہ ہے

جلتے جل جاویں مگر شمع کی مانند کبھی!   اف بھی کرتے نہیں دم عشق کا بھرنے والے

عیش دہلوی اور ان کے معاصر شعرا نے عشقیہ موضوعات کو پیش کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی باوجود اس کے محبوب کے سراپے کو بیان کرنے میں ایک طرح کی دوری ہی بنائی اور شاید اس کی بڑی وجہ عشق میں وصال اور وصال کی کیفیت سے ناآشنائی تھی۔ مگر عیش دہلوی کی شاعری کو پڑھتے ہوئے ہمیں ایسے اشعار بآسانی مل جاتے ہیں جن میں محبوب کے حسن کے ساتھ ساتھ اس کے سراپے کو بیان کیا گیا ہے۔

دیکھ کر اس بہار خوبی کو   ہوگیا گل کا رنگ و بو کم ہے

مزہ ملے ہے جنھیں قتل بے گناہوں سے   خدا بچائے ان آفت بھری نگاہوں سے

محبوب کے ناز وادا کو عیش نے یوں بیان کیا ہے۔

وعدہ آنے کا کیا تھا کل تو کچھ تسکین تھی   وہ نہ آئے آج درد دل میں پھر شدت سی ہے

عیش دہلوی کے یہاں ایسے اشعار بھی ہیں جن میں دنیا کی بے ثباتی کو پیش کیا گیا ہے، جو لوگ مال و دولت پر غرور کرتے ہیں ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے عیش دہلوی کہتے ہیں کہ یہ مال ودولت فنا ہونے والی چیز ہے۔

سمجھ لے دولت دنیا کوئی دم ہی فنا ہوگی   نہ ہونا اس پر نازاں یہاں اللہ ہی اللہ ہے

حقیقت کچھ نہیں دنیا کی دنیا چند روزہ ہے   نہ ہو اس کے لیے حیراں یہاں اللہ ہی اللہ ہے

اردو کے بیشتر شعرا نے تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ غالب کی تلمیحات پر مبنی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ عیش دہلوی کے یہاں بھی تلمیحات کا ذکر ملتا ہے۔

کیوں زلیخا یوسف کنعاں کو زنداں چاہیے   چاہیے اس کے لیے یہ جس کو ناداں چاہیے

عیش دہلوی نے انسانیت، امن اور یکجہتی کو اپنی شاعری کے ذریعے فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے بعض اشعار میں اس کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔ میر درد کا ایک شعر سنیے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو   ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اب عیش دہلوی کا شعر دیکھیے۔

چاہنے کے واسطے بھی کوئی انساں چاہیے   تم بھی ایسے ہو کہ جو تم کو مری جاں چاہیے

اتحاد کی اہمیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

دیکھتے ہیں عیش جو کثرت میں وحدت کا ظہور
ان کے یکساں جلوۂ دیر وحرم آنکھوں میں ہے

عیش دہلوی کے یہاں ناسازگار حالات میں بھی جینے کا حوصلہ ملتا ہے۔

اس کجروی چرخ سے تو ہو کے تنگ دل   گھبرا نہ عیش دیکھ خدا کار ساز ہے

بہرحال عیش دہلوی کے دو دیوان منظر عام پر آئے۔ حبیبہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پہلے دیوان کے دو قلمی نسخے بھی موجود ہیں جو انڈیا آفس لائبریری لندن اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہیں، اس کے علاوہ انتخاب بھی ہے۔ دوسرے دیوان کا ایک نسخہ ہے جو لاہور میوزیم میں موجود ہے۔ حالانکہ حبیبہ بانو نے یہ لکھا ہے کہ لاہور کے نسخے پر یہ جملہ درج ہے کہ ''اس دیوان کا اصلی نسخہ حکیم آغا جان عیش کے خاندان میں موجود ہے۔ اس کی یہ نقل ہے'' مگر باوجود تلاش وجستجو کے عیش دہلوی کے خاندان والوں کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ حبیبہ بانو نے نہایت تفصیل کے ساتھ ان دونوں دیوان کی تفصیلات درج کی ہیں۔ عیش دہلوی کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر حبیبہ بانو نے نہایت اہم بات کہی ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

''بے شک ہم انھیں تغزل اور معاملات حسن وعشق کے پہلو سے کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں دے سکتے لیکن زبان کے ارتقائی سفر میں اسے بیانیہ صلاحیت اور وسعت عطا کرنے میں ان کی خدمات بھولنے کی چیز نہیں۔ افسوس کہ ان کے متعدد دوسرے معاشروں کی طرح ان کا دیوان بھی آج تک شائع نہیں ہوا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ غدر کے باعث ملک کی سیاسی حالت میں عظیم انقلاب آگیا اور اس کے فوراً بعد یہاں غیر ملکی تسلط مستقل طور پر قائم ہو گیا۔ انگریزی تعلیم کے زیر اثر رنگ سخن بھی بدل گیا اور ہم پرانے سخنوروں کی طرف سے کچھ غافل اور بیگانہ سے ہو گئے۔ شکر ہے کہ حالات نے پھر پلٹا کھایا ہے اور ہم اپنے مدفون خزانوں کو کھود نکالنے اور انھیں دنیا کے سامنے رکھنے کی قدر وقیمت سے واقف ہی نہیں ہوئے بلکہ ان پر فخر بھی کرنے لگے ہیں۔''

اب اسے اتفاق کہیے یا وقت کی ستم ظریفی کہ اپنے عہد کا ممتاز شاعر اور صاحب دیوان آغا جان عیش دہلوی کو نئی نسل نے بالکل بھلا دیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ بہت سے اہل علم بھی عیش دہلوی کی شاعری تو دور نام اور عہد سے بھی واقف نہیں ہوں گے۔ بعض لوگ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری اس کمال کو نہیں پہنچتی کہ زمانہ انھیں یاد رکھے مگر ہمیں دو باتیں یاد رکھنی چاہیے اول عیش دہلوی کی شاعری کا دائرہ وسیع تر نہ سہی پھیلا ہوا ضرور ہے۔ دوسری بات غالب کے معاصر کے طور پر بھی ان کا ذکر نہ کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔

■

Dr. Naushad Manzar
A-33/2, Johri Farm, Gali No.: 6, Jamia Nagar
New Delhi - 110025, Mob.: 9718951750

ارشاد شفق

آمنہ ابوالحسن

اردو افسانے کا ایک معتبر نام

خواتین افسانہ نگاروں میں آمنہ ابوالحسن ایک بڑا نام ہے۔ موصوفہ کی پیدائش 10 مئی 1941 کو حیدر آباد میں ہوئی۔ ان کا اصل نام سیدہ آمنہ اور قلمی نام آمنہ ابوالحسن تھا۔ ابتدائی کہانیاں انھوں نے بچوں کے ایک رسالے 'تارے' کے لیے لکھیں، لیکن باقاعدہ طور پر ادبی زندگی کا آغاز 1951 میں کیا۔ اگرچہ انھوں نے بہت کم عمری میں لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن شعور کی پختگی کے بعد ان کی پہلی کہانی 'ساقی' میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد آمنہ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ان کے متعدد افسانے برصغیر کے معیاری رسائل میں شائع ہوئے جن میں 'بیسویں صدی'، 'شاعر' اور 'آجکل' اہم ہیں۔ افسانے کے علاوہ انھوں نے کئی ناول بھی لکھے جن میں 'سیاہ سرخ سفید'، 'تم کون ہو' اور 'واپسی' کافی مشہور ہوئے۔ 'واپسی' پر انھیں یوپی اور بہار اردو کادمی کی جانب سے انعام بھی ملا۔ افسانوی دنیا میں ان کے دو افسانوی مجموعے 'کہانی' اور 'بائی فوکل' ان کی شناخت قائم کیے ہوئے ہیں۔

آمنہ ابوالحسن کا فکری شعور جس زمانے میں پروان چڑھا وہ ترقی پسند تحریک کا عہد تھا۔ اگرچہ انھوں نے آزادی کے بعد لکھنا شروع کیا تاہم جس دور میں ان کی ذہنی آبیاری ہوئی اس دور میں ترقی پسند تحریک کی لہر چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، لیکن آمنہ اس تحریک سے متاثر نہیں ہوئیں۔ انھوں نے اپنے افسانوی موضوعات عام انسانی زندگی سے اخذ کیے اور جو کچھ بھی لکھا اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر لکھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس ان کی انفرادیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آمنہ ابوالحسن کے افسانے حقیقت نگاری کی توانا روایت کے آئینہ دار ہیں۔ ان کا تعلق مصنفین کی درمیانی پیڑھی سے ہے۔ آمنہ اپنے افسانوں میں لطیف اور نازک جذبات کی کامیاب ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی سبھی کہانیاں شاعرانہ حسن سے معمور ہوتی ہیں۔ خوف ودہشت اور عدم تحفظ کی آگ میں جلتا ہوا انسان، آمنہ کی تخلیقی فکر کا مرکزی نقطہ ہے۔''

(آزادی کے بعد اردو افسانہ دہلی میں، قمر رئیس، مشمولہ 'شاعر' ہم عصر اردو ادب نمبر، مئی تا دسمبر 98-1997، ممبئی، ص 342)

آمنہ نے اپنے افسانوں میں دور جدید کی بڑھتی اور سسکتی زندگی کی پیچیدگی، انسان کی کرداری گراوٹ، فرد کی نفسیاتی اور داخلی کربناکی، متوسط طبقے کا سماجی اور معاشی اُتار چڑھاؤ، اقدار کی پامالی، نئے معاشرے کی کجروی، مغربی تعلیم کی بے راہ روی، فرقہ وارانہ فساد، انسانی خود غرضی، تہذیبی پیچیدگی، شکست خوردگی، معاشرتی کربناکی، سماجی ہیجان انگیزی، معاشرے کی مثبت ومنفی صورتحال کی جستجو، نئی تہذیب وکلچر کی عکاسی، نسلوں کی کشاکش، تہذیبی تضادات، انسانی ہوس پرستی اور بے انصافی، کے علاوہ رشتوں کے الجھاؤ وغیرہ جیسے جیتے جاگتے موضوعات کو افسانوی صفحات میں جگہ دے کر ایسے مستحسن انداز میں پیش کیا ہے، جس کے مطالعے کے بعد

قاری کو ان کی ذہانت، علمیت اور تخلیقیت کے نئے نئے باب روشن ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ موصوفہ کا طبقاتی شعور بہت پختہ اور نکھرا ہوا ہے۔ انھیں اپنے اردگرد کے ماحول اور معاشرے کی تبدیلی کا بھرپور احساس تھا۔ انھوں نے سماج سے کٹ کر ایک آزاد فرد کی طرح زندگی گزارنے پر کبھی اکتفا نہیں کیا۔ مختصر یہ کہ موضوعاتی طور پر آمنہ کے افسانے اپنے عہد کے متنوع مسائل سے ترتیب پاتے ہیں جس پر کسی تحریک یا رجحان کا لیبل چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔

آمنہ ابوالحسن ہمیشہ زندگی کے مثبت پہلو کی قائل رہیں۔ ان کے افسانوں میں اقدار زندگی کو سمجھنے، اسے بہتر بنانے، قسمت اور خدا پر یقین رکھنے کا درس ملتا ہے، جس کی تہہ میں فکری بلوغت کی صدا صاف سنائی دیتی ہے۔ ان کے اس نہج کے افسانے جہاں انھیں اپنے عہد کے مفکر و مدبّر کا درجہ دلاتے ہیں وہیں موصوفہ کی بصیرت اور مشاہدات کا آگہی نامہ بھی بن جاتے ہیں جو قاری کو اپنی گرفت میں لے کر افہام و تفہیم کے نئے نئے در وا کرتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کے دو افسانے 'برجو' اور 'طواف' ہیں جس میں زندگی کو مثبت سمت کی طرف لے جانے کا اشاریہ موجود ہے۔ افسانہ 'طواف' کی ہیروئین (ناظرہ) ساری زندگی دھوکہ کھانے اور اپنا بچہ کھودینے کے بعد بھی صبر کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ وہ ماں باپ کو ٹھکرا کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرتی ہے جس کی سزا بھی اسے ملتی ہے لیکن مایوسی کو بالائے طاق رکھ کر اپنے سارے غم بھول جاتی ہے۔ اسی طرح افسانہ 'برجو' کا مرکزی کردار جو پیشے سے جنگل میں لکڑیاں کاٹنے والا ایک مزدور ہے، اسے جنگل کی ہر شے سے محبت ہوتی ہے لیکن اس کا دوست اسے شہر جا کر نوکری کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ اس کی بات مان کر شہر بھی جاتا ہے لیکن اچانک ایک دن کھیت میں سانڈ گھسنے سے وہ چوکیداری کی نوکری چھوڑ کر اپنی بیوی کے ساتھ کسی اور جنگل میں پہنچ جاتا ہے اور باقی کی زندگی وہیں گزارتا ہے۔ اس افسانے میں آمنہ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رزق دینے والا اللہ ہے اور بندہ اگر اپنی محنت میں ثابت قدم رہے تو اسے اور اس کی آنے والی نسل کو رزق ہمیشہ ملتا رہتا ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس دیکھیے جس سے موصوفہ کے نظریات کا بھرپور اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''دلوں کا طواف کرو یہی کعبہ کا طواف ہے۔ جو بھی انسان سے محبت نہیں کرتا وہ کبھی خدا سے محبت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ تڑپنا ایک تجریاتی عمل ٹھہرا اور جو انسان تڑپنا نہ جانے وہ بھلے ہی اپنی پیدائش کا منطقی مصرف پورا کرے مسکین بن کر جیے اور عمر تمام کرے لیکن جو دھوپ بن کر زمانہ پر نہ پھیلے اور عود عنبر کی طرح اپنے آپ میں نہ سلگے وہ درحقیقت زندگی کا مفہوم کیا سمجھے۔''

(برجو، آمنہ ابوالحسن، مشمولہ ماہنامہ شاعر، مدیر افتخار امام صدیقی، جلد 70، شمارہ 1، ممبئی، ص 12)

آمنہ بدلتی دنیا اور گزرتے وقت کی نباض ہیں، وہ اپنی باریک بین نظر سے نئی تہذیب میں ڈھلے معاشرے اور اس سے پیدا شدہ برائیوں کا بغور مطالعہ کرتی ہیں اور اسے اپنی فکری آنچ میں تپا کر افسانے کے قالب میں ڈھالتی ہیں۔ وہ موڈرن معاشرے کی برائیوں اور بے اعتدالیوں کو بڑی فنکاری سے پیش کرتی ہیں۔ ان کے افسانے اپنے عہد کی معاشرتی زندگی اور اخلاقی اقدار کے مثبت و منفی رجحان کے ترجمان ہیں۔ ان کے یہاں نئی اور پرانی تہذیب کو سمجھنے کا شعور بہت پختہ اور متاثر کن ہے، جو ان کے ذاتی غم کا سانحہ بننے کے بجائے معاشرتی حقائق کی صحیح اور سچی تصویر واضح کرتا ہے۔ 'اندھیرے کا خوف'، 'پرتو' اور 'گہن' جیسے افسانے موڈرن معاشرے کی برائیوں اور بے اعتدالیوں پر مبنی ان کے بہترین افسانے ہیں۔ 'اندھیرے کا خوف' میں موصوفہ نے مغربی ممالک میں رہنے والے مسلم طبقے کی عکاسی کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح یہ طبقہ اپنے تمام مشرقی عقائد اور مذہبی اصولوں کو بھول کر مغربی تہذیب میں ڈھل جاتا ہے۔ 'پرتو' میں انھوں نے موڈرن معاشرے میں بچوں کی پرورش صحیح ڈھنگ سے نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہونے والی منفی تبدیلیوں اور سوچ کو موضوع بنایا ہے۔ موڈرن معاشرے کے والدین اپنے بچوں کی تمام تر ذمے داریاں ملازمہ کے سر ڈال دیتے ہیں اور ملازمہ کم عقل اور پڑھی لکھی نہ ہونے کے سبب جو باتیں بچوں کے ذہن میں پیوست کرتی ہیں، وہ ساری زندگی محفوظ رہتی ہیں۔ افسانہ 'گہن' میں انھوں نے ایک شخص کی محض ایک غلطی سے اس کی پوری زندگی کو تباہ ہونے کی تصویر دکھائی ہے، جس سے پورا معاشرہ اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ وہ پوری زندگی اپنی ماں کا کہنا نہ ماننے پر پچھتاتا رہتا ہے:

''اپنی ماں کی درد بھری سسکیاں اس کے کانوں میں گونج کر اسے مزید بے حال کر گئیں۔ ماں نے کتنا سمجھایا تھا۔ کتابوں کو اپنا سب سے اچھا دوست سمجھ۔ مگر اس نے سب پر بھروسہ کیا۔''

(گہن، آمنہ ابوالحسن، مشمولہ 'بائی فوکل'، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی، 1990، ص 63)

آمنہ فرد کے نہاں خانوں میں ڈوب کر اس کی ذات و کردار کا محاسبہ کرتی ہیں۔ انھیں فرد کے داخل میں جھانکنے اور اس کے جذبات و احساسات کو ٹٹولنے پر عبور حاصل ہے۔ وہ معاشرے کے جیتے جاگتے کرداروں کو ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے اس کی اندرونی کیفیت کو اہمیت دیتی ہیں۔ افسانہ 'بائی فوکل' میں موجود مرکزی کردار آفاق کی اندرونی کیفیت کو انھوں نے جس فنکاری سے پیش کیا ہے وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آفاق پوری زندگی اپنے طرز پر جیتا ہے لیکن نوادرات جمع کر کے مطالعہ کرنے کے بعد اسے احساس ہوتا ہے کہ اب تک اس نے جو زندگی بسر کی ہے اس کا ماحصل کچھ بھی نہیں، چنانچہ وہ سخت ذہنی کرب میں مبتلا ہو کر ساری زندگی سکون کا متلاشی رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے خاندان، اپنے لوگ اور اپنی ذات کو اہمیت دیتا ہے اور دوسرے طبقے یا معاشرے کے دیگر افراد کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ہمدردی، ایثار اور قربانی جیسے جذبات سے وہ

آمنہ بدلتی دنیا اور گزرتے وقت کی نباض ہیں.وہ اپنی باریک بین نظرسے نئی تہذیب میں ڈھلے معاشرے اور اس سے پیدا شدہ برائیوں کابغور مطالعہ کرتی ہیں اور اسے اپنی فکری آنچ میں تپا کر افسانے کے قالب میں ڈھالتی ہیں.وہ موڈرن معاشرے کی برائیوں اور بے اعتدالیوں کو بڑی فنکاری سے پیش کرتی ہیں.ان کے افسانے اپنے عہد کی معاشرتی زندگی اور اخلاقی اقدار کے مثبت ومنفی رجحان کے ترجمان ہیں.ان کے یہاں نئی اور پرانی تہذیب کو سمجھنے کا شعور بہت پختہ اور متاثر کن ہے.جو ان کے ذاتی غم کا سانحہ بننے کے بجائے معاشرتی حقائق کی صحیح اور سچی تصویر واضح کرتا ہے.

محروم رہ جاتا ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''کاش وہ کسی غریب کے ذہن و دل میں اتر کر وہاں سے ایک نظر اس کی ٹوٹی پھوٹی تاراج دنیا کو دیکھ لیتا تو شاید پھر اسے کسی 'بائی فوکل' کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ تب وہ یقیناً مکمل مطمئن اور ناقابل تسخیر ہو جاتا۔ مگر ساری دنیا کو دیکھ کر ہر ہر چیز پا کر بھی آفاق نے کسی غریب کے

ذہن ودل کو کہاں دیکھا۔اس کی محرومیوں کو کہاں جانا، اس کی دردمندی کی توفیق خود میں کہاں پیدا کی تھی۔''

(بائی فوکل، آمنہ ابوالحسن، مشمولہ 'بائی فوکل'، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی، 1990، ص 142)

آمنہ کے افسانوں میں اصلاح کا پہلو بھی ابھرتا ہے۔وہ سماج اور فرد کی برائیوں کو قاری کے سامنے لاکر اس کی اصلاح کی کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔افسانہ 'دریچہ' میں وہ ایک نوجوان لڑکی کی ذہنی تربیت کرتی ہیں۔افسانہ 'چاپ' میں وہ والدین کے ذریعے بچوں کی اصلاح کرتی دکھائی دیتی ہیں۔افسانہ 'عفریت' میں موصوفہ جہاں فساد کی ہولناکیاں دکھا کر مذہب، ملک اور قوم کے نام پر لڑانے والے افراد پر طنز کرتی ہیں وہیں معاشرے کو امن پسندی کا درس بھی دیتی ہیں۔افسانہ 'مولی' میں وہ معاشرے کی اس ذہنیت کی اصلاح کرتی ہیں جو معذور بچوں کو کبھی برابری کا درجہ نہیں دیتا۔'شیشے کی دیوار' میں وہ ایسے افراد کی اصلاح کرتی نظر آتی ہیں جو ظاہری دکھاوے کی وجہ سے ساری زندگی مسائل کے شکار رہتے ہیں۔اس نہج کے افسانوں میں موصوفہ زمان ومکان کے لوازمات ڈھونڈ کر انھیں حل کرنے کی کوشش کرتی دکھائی دیتی ہیں، لیکن ان کی یہ کوشش اپنے ہم عصروں میں انھیں تقلیدی روش اختیار کرنے سے جہاں محفوظ رکھتی ہے، وہیں افسانوں کے مختلف موضوعات کی بھیڑ میں انھیں انفرادیت بھی عطا کرتی ہے۔

آمنہ نے اپنے افسانوں کے پلاٹ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے ترتیب دیے ہیں۔ان کے افسانے سیدھے سادے انداز میں چل کر قاری کو اپنا گرویدہ بنالیتے ہیں۔پلاٹ کے برعکس زبان وبیان اور اسلوب کے لحاظ سے وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز رہی ہیں۔ان کے افسانوں میں بیانیہ کا عنصر بہت مضبوط ہے۔ان کے اسلوب میں تجسس کا عنصر بھی برقرار ہے جو قاری کو کہانی کے اختتام تک باندھے رکھتا ہے۔موصوفہ کے بعض افسانوں میں حقیقت نگاری کے روایتی اسلوب کا تاثر اُبھرتا دکھائی دیتا ہے لیکن اس تاثر میں کہیں تکرار یا یکسانیت کی فضا نظر نہیں آتی۔افسانوی مجموعہ 'بائی فوکل' کے برعکس 'کہانی' کے افسانوں میں حقیقت اور تخیل کا تضاد ہے۔ان افسانوں میں فلسفیانہ بحث اور شاعرانہ انداز کے علاوہ طنز کا عنصر بھی اُبھرتا ہے لیکن ان کا طنز بے مقصد ہونے کے بجائے معاشرتی مسائل کو اُبھارتا ہے۔ دراصل آمنہ کے اسلوب کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں معاشرتی اقدار اور فرسودہ روایات سے بغاوت تو کرتی ہیں لیکن اسلوب اور کہانی کے روایتی سانچے کو توڑنے کو تیار نہیں ہوتیں۔لفظوں کے استعمال میں انھوں نے بہت مصلحت سے کام لیا ہے۔ان کے اسلوب میں لفاظی، سطحیت اور جانب داری کا عمل دخل نہیں ہے۔انھوں نے تخلیق کی بنیادی ذہنی کیفیات کو جس منفرد انداز میں پیش کیا ہے وہ ان کے ہم عصروں کے یہاں ناپید ہے۔ ان کے فکر وشعور ان کے افسانے کے تخلیقی اشارات اور ارشادات کو فعالیت عطا کرتے ہیں۔فکر وزبان کی سطح پر موصوفہ کے افسانے جذباتی عقیدت، محسوسات اور مفکرانہ خصوصیات کا مظہر بن کر قاری کو اپنے حصار میں لینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔پروفیسر قمر رئیس ان کی زبان پر گرفت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''آمنہ ابوالحسن کا طرز بیان انتہائی دلکش اور جاندار ہے جو ان کے معجز بیان اور قادرالکلام ہونے کی دلالت کرتا ہے۔آمنہ ابوالحسن جگہ جگہ ایسے پتے کی باتیں اپنے دل نشین انداز میں کہہ گزرتی ہیں کہ جن سے ان کے پختہ شعور، بالغ نظری، باریک بینی اور نفسیات پر حاوی ہونے کے ثبوت ملتے ہیں۔آمنہ صاحبہ نے کبھی اپنی ادبی حیثیت منوانے کے لیے سہارے اختیار نہیں کیے بلکہ اپنے منفرد طرز نگارش، لطافت بیان اور جاندار کردار نگاری کے ذریعے ادبی دنیا میں اپنا بلند مقام بنایا اور برابر بلندی کی طرف مائل ہیں۔''

(بحوالہ شاعر، ہم عصر اردو ادب نمبر، مئی تا دسمبر 1997-98، ممبئی، ص 341)

کردار نگاری کے سلسلے میں آمنہ نے معاشرے کے مختلف طبقوں کے کردار پیش کیے ہیں۔آمنہ کے کردار معاشرے کے چلتے پھرتے افراد ہیں اس لیے انسان ہونے کی وجہ سے ان میں بشری خوبیاں اور خامیاں دونوں موجود ہیں۔وہ اپنے کردار کو فرشتہ بنا کر پیش کرنے کے بجائے ان کے منفی اور مثبت دونوں پہلو کو اہمیت دیتی ہیں۔اس کی وضاحت انھوں نے اپنے افسانوی مجموعے 'کہانی' کے دیباچے میں کی ہے۔وہ لکھتی ہیں:

''زندگی کی عمدہ اقدار اور توانا رجحانات کی دل سے موئید رہی ہوں اور ادیبوں، فنکاروں، دانشوروں کی ذمے داری بھی یہی سمجھتی ہوں کہ وہ اپنے ساتھ یا پیچھے آنے والے انسانی کارواں کی اسی سمت رہنمائی کریں جہاں حیات کے صالح اور صحت مند حقائق ان کے منتظر ہوں۔انسان اپنے ماحول اور اپنی ساری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سچا انسان نظر آئے۔دنیا سے ماورئی کوئی فرضی کردار نہیں۔''

(حقیقت، مشمولہ 'کہانی'، آمنہ ابوالحسن، پبلشر مصطفی علی اکبر، مارچ 1965، ص 10)

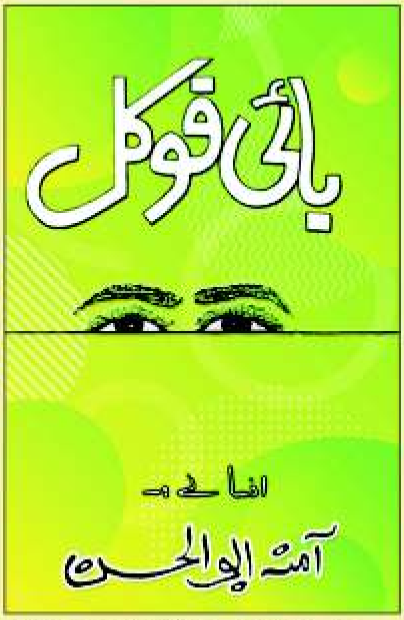

آمنہ کے افسانوں کے بیشتر کردار پلاٹ میں آنے والی تبدیلیوں سے اپنا رُخ بدلتے نظر آتے ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں متحرک (Active) کرداروں کا عمل دخل زیادہ نظر آتا ہے جو کہانی کو عروج تک پہنچانے میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ ان کرداروں کی انفرادیت بیان کرتے ہوئے سیدہ جعفر نے لکھا ہے:

''آمنہ ابوالحسن کی کہانیاں اس لیے جاندار اور متحرک ہوتی ہیں کہ انھوں نے دنیا کے نگار خانے میں واقع تصویروں پر محض سرسری نظر نہیں ڈالی بلکہ ان تصویروں میں مختلف رنگوں کے امتزاج اور ان کی معنویت کو سمجھنے کی پر خلوص کوشش کی ہے۔آمنہ ادب کو مختلف خانوں میں بند کردینے کا رجحان نہیں رکھتیں بلکہ اپنے کرداروں کو ان کی بشری صفات وخصوصیات پیش کرنے کا قابل غور سلیقہ رکھتی ہیں۔''

(بحوالہ شاعر، ہم عصر اردو ادب نمبر، مئی تا دسمبر 1997-98، ممبئی، ص، 341-42)

اس طرح دیکھیں تو آمنہ کے افسانوں میں زندگی اور فن دونوں کا امتزاج بھرپور موجود ہے۔ان کے افسانوں میں زبان وبیان اور اسلوب کے نئے نئے پہلو اُبھرتے ہیں جس کو پڑھنے کے بعد عمل اور ردعمل کی نئی نئی راہیں وا ہوتی ہیں۔میرے خیال سے ان کے افسانے اردو کے اہم اور اچھے افسانوں میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

■

Dr.Irshad Shafaque
H.No: 1/A, BL No: 23, Kelabagan,
Po: Jagatdal, Dist: 24 Pgs(N),
Pin: 743125, (West Bengal)
Ph:8100035441
Email: Irshadnsr5@gmail.com

ابوبکر عباد

اردو افسانوں میں ہندو اساطیر

اساطیر کی دنیا، فکشن کی دنیا کی طرح ہی بے حد وسیع، حیرت ناک، سحر انگیز، دلکش، پیچیدہ اور متنوع ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں بوالعجبی بھی ہے، بوقلمونی بھی کہ اس دنیا میں علم سے زیادہ عقیدے کی کارفرمائی ہوتی ہے، یقین پر گمان کو فوقیت حاصل ہوتی ہے، عقل پر عشق کو ترجیح دی جاتی ہے اور منطق کے مقابلے میں ممکنات کا سکہ چلتا ہے۔ اساطیری واقعات اور کردار ابتدائی انسانی زندگی کی طرز، ضرورت، اس کے تخیل، تصور، عقیدت، نفسیات اور جغرافیائی حالات کی پیداوار ہیں۔ ہر ملک، مذہب اور قوموں کی اپنی اساطیری حکایات و روایات ہیں، جن میں ان کے فن، عقیدے اور فلسفے نے اولین

تمام اساطیری کرداروں کی کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے، یا کہانیوں میں یہ مخصوص کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اساطیر، یا دیومالائیں اپنے علاقے، مذاہب اور تہذیب و تمدن کے لوگوں کے علم، عقیدے، فکر اور رجحان کی غماز ہوتی ہیں۔

شکلوں میں اپنا اظہار کیا۔ اساطیری کردار بالعموم دیوی، دیوتا، فوق الفطرت ہستی، مذہبی، تاریخی، نیم تاریخی، تخیلی، یا روایتی ہیرو (بشمول ہر نوع کے جاندار) ہیں جو بہر طور عام انسانوں یا جانداروں سے مختلف اور عظیم تر ہوتے ہیں۔ تمام اساطیری کرداروں کی کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے، یا کہانیوں میں یہ مخصوص کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اساطیر، یا دیومالائیں اپنے علاقے، مذاہب اور تہذیب وتمدن کے لوگوں کے علم، عقیدے، فکر اور رجحان کی غماز ہوتی ہیں۔ ان کے قصوں میں تحیر، تجسس، رزم، بزم اور عیاری کی دلکشی کے علاوہ علم وفضل اور شجاعت وسخاوت کی بھی داد دی جاتی ہے۔ اس کے بیانیے میں غلو کا غلبہ، ناقابل یقین صداقت اور پر اسرار اور غیر منطقی واقعات کی بھرمار ہوتی ہے۔ ساتھ ہی حیرت انگیز مہمات اور فنی جمالیات کا فشار رنگ ہمارے مختلف جذبات واحساسات کو بیدار، مہمیز، گداز اور آسودہ کرتا ہے، ان کے تزکیے اور تطہیر کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

اساطیری کرداروں، داستانوں اور کارناموں کا سب سے بڑا، اہم اور قابل ذکر ذخیرہ یونان کی سرزمین کو کہنا چاہیے۔ روم، مصر، چین اور جاپان وغیرہ کی بھی اپنی حیثیت مسلم ہے لیکن ہمارے ہندوستانی دیو مالائی (اساطیری) کرداروں اور کہانیوں کے عجائب خانے بھی ان تہذیبوں سے دل کشی، تجسس، تحیر اور ثروت مندی میں کسی طور کم نہیں ہیں۔

ہم ہندوستانیوں کے پاس عالمی پیمانے کی کہانیاں بھلے ہی بہت زیادہ نہ ہوں، لیکن محض ان اساطیری کرداروں کی تعداد، جنھیں بھگوان یا دیوی، دیوتاؤں کی حیثیت حاصل ہے، بہت زیادہ ہے۔ ظاہر ہے ان میں سے ہم نے بہتوں کو فراموش کر دیا ہے، بہت سے ہمارے مقدس صحیفوں مثلاً گیتا، رامائن، وید اور جاتک کتھاؤں کے اتھاہ سمندر میں بند ہیں اور متعدد کرداروں اور قصوں سے ہم 'رامائن' اور 'مہابھارت' جیسے ٹی۔ وی سیریلز اور دیو مالائی فلموں کے ذریعے واقف ہو چکے ہیں۔ عالمی اور علاقائی شعروادب نے بھی ان کرداروں کو بڑی فراخدلی سے اپنے صفحۂ قرطاس میں جگہ دی ہے۔ سو، دوسری زبانوں کے ادبیات کی طرح اردو شاعری، اردو فکشن بالخصوص افسانوں میں انھیں کثرت سے مرکزی حوالہ بنایا گیا، انھیں فن کے قالب میں ڈھالا گیا، علامت، استعارے اور تمثیل کے بطور پیش کیا گیا، ان کی تشکیل جدید کی گئی اور ان سب کی اپنے عہد سے مطابقتیں پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ اس عمل سے جہاں ایک

طرف اردو افسانے کا فنی کینوس وسیع ہوا، موضوع میں تنوع، فکر میں گہرائی اور پیچیدگی آئی اور بیانیے میں رمز، کشش اور تہہ داری پیدا ہوئی تو دوسری طرف اساطیری کردار تخلیقی ذہنوں میں ازسرنو دریافت ہوئے اور عقیدے سے الگ ہوکر ان کی ادبی جہتیں تلاش کی گئیں۔ اس طرح یہ کردار قدیم زمانے اور عقیدے سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے افسانے کے توسط سے جدید ذہن اور حال کی زندگی کا حصہ بنتے گئے۔

شاعری کے مقابلے اردو فکشن کی دنیا میں اساطیر، یا اساطیری کرداروں کی آمد ذرا بعد میں ہوئی۔ گوکہ داستانوں میں یہ کردار علامتی، تمثیلی یا بدلے ہوئے ناموں کے ساتھ پہلے سے موجود تھے۔ اردو ناولوں میں بھی ان کا استعمال سلیقے سے ہوتا آیا ہے، لیکن فی الوقت گفتگو محض افسانوں کے حوالے سے ہے۔ سو مختصر افسانوں میں ہندو اساطیر کو جن افسانہ نگاروں نے حاوی رجحان کے طور پر یا زندگی کی مخصوص صورت حال کی نمائندگی کے طور پر برتا ہے ان میں راجندر سنگھ بیدی، ممتاز شیریں، انتظار حسین، سلام بن رزاق اور جوگندر پال وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یوں بیشتر افسانہ نگاروں نے اسطورہ کو کسی نہ کسی حوالے سے اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں نے اساطیری کرداروں کو اپنے عہد سے ہم آہنگ کرکے افسانے میں پیش کیا ہے، بعض نے واقعات کو نئے پس منظر میں رکھ کر اور کرداروں کو معاصر صورت حال میں ڈھال کر انھیں نئے اوتار کا روپ دیا ہے تو کچھ نے علامت اور استعارے کی صورت استعمال کیا ہے۔ اساطیری ناموں کو کرداری صفات، کنایے اور تلازمے کے طور پر افسانوں میں لانے کی مثالیں کثرت سے اور کافی پہلے سے موجود ہیں، مثلاً اعظم کریوی کے افسانے 'مایا' میں پاروتی اور رادھا وغیرہ کے صفاتی کردار موجود ہیں۔

یہ درست ہے کہ مختصر افسانوں کی حد تک اسطور کو اسما یا صفات کی منزل سے آگے بڑھ کر پہلے پہل راجندر سنگھ بیدی نے اپنے افسانے 'گرہن' میں بنیادی ساخت کے طور پر استعمال کیا۔ لیکن یہ بات قطعاً درست نہیں ہے کہ بیدی کے افسانوں میں اسطور کی دریافت سب سے پہلے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں ہمارے بعض ناقدین بیدی سے بے اعتنائی برت رہے تھے، ان کی زبان پر اعتراض کر رہے تھے، غیر ملکی افسانوں کے چربے کا الزام عائد کر رہے تھے اور ان کے نقائص، گوا کرا فسانے کی خامیوں میں شمار کر رہے تھے، اس زمانے میں سرور صاحب پہلے شخص تھے جنھوں نے معترضین کو افسانے اور شاعری کی زبان کے فرق سے نا بلد بتاتے ہوئے بیدی کی زبان کا دفاع کیا تھا، انھیں اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے باضابطہ متعارف کرایا تھا۔ اور یہ بھی کہ آل احمد سرور نے ہی سب سے پہلے بیدی کے یہاں دیو مالا اور اساطیر کو مرکزی حوالے کی حیثیت سے دریافت کیا تھا۔ سرور صاحب کے مضمون ''بیدی کی افسانہ نگاری: صرف ایک سگریٹ کی روشنی میں'' سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''ان (بیدی) کے یہاں شروع سے جذبات کی تیزی و تندی کے بجائے خیالات اور واقعات و تجربات کی ایک دھیمی لہر ملتی ہے جس کے پیچھے ایک گہرا فلسفیانہ احساس ہے مگر بیدی فلسفہ یا سیاست نہیں بگھارتے۔ ..... پریم چند کی آدرشی حقیقت نگاری جو کرشن چندر کے یہاں ایک رومانی حقیقت نگاری نظر آتی ہے، بیدی کے یہاں ایک ایسی حقیقت نگاری بن جاتی ہے جو اسطور اور دیو مالا کے سایوں کی وجہ سے حقیقت سے کچھ بڑی اور پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔''

(مشمولہ فکر روشن، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1995 ص 191)

شاید یہاں اس حقیقت کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے کہ بیدی کے افسانوں کا قرار واقعی اور سنجیدگی کے ساتھ جائزہ سب سے پہلے سرور صاحب نے ہی لیا تھا۔ بعد میں ناقدوں نے بیدی کے دوسرے افسانوں مثلاً 'اپنے دکھ مجھے دے دو'، 'ببل'، 'بھولا' اور ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' میں ہندوستانی اساطیر کے تعلق سے بوجھل مضامین لکھے۔ گوکہ اہم ڈرامہ نگار اور ناقد ریوتی سرن شرما کا خیال تھا کہ بیدی ہندو دیو مالا کو صحیح طریقے سے سمجھ نہیں سکے تھے۔

اسما، صفات، علامت، استعارے اور حوالے سے قطع نظر ہندوستانی اسطور کو اردو افسانے میں باضابطہ اور

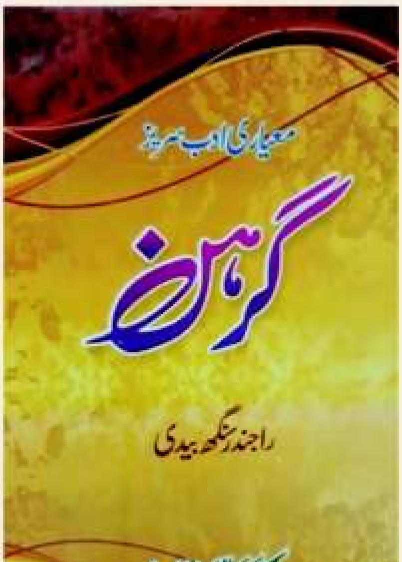

مکمل طور پر سب سے پہلے ممتاز شیریں نے پیش کیا ہے۔ اور غالباً ممتاز شیریں اردو کی پہلی افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں تقریباً پچاس یونانی، ایرانی، عربی اور ہندوستانی اساطیری کرداروں کے نام آئے ہیں۔ ان کے سہ ابعادی طویل مختصر افسانے 'میگھ ملہار' کے دو حصے جو بذات خود الگ افسانوں کی حیثیت رکھتے ہیں؛ ایک 'نیل کمل' اور دوسرا 'سرسوتی' خالص ہندو اسطور پر مبنی ہیں۔ دونوں افسانوں میں حسن اور موسیقی کی دیوی سرسوتی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ افسانہ 'نیل کمل' میں سنگیت کی روح کو چھو لینے والا ایک فنکار جب پرسکون چاندنی رات میں اپنے ستار کی مدھر تان چھیڑتا ہے تو اس کی لے پر روپ اور سنگیت کی دیوی سرسوتی ناچ اٹھتی ہے اور فنکار کو فن کی دیوی کا حسین ترین انسانی روپ نظر آتا ہے۔

''پاؤں اتنے پیارے، اتنے سندر، اتنے پاکیزہ اور شفاف جیسے تازہ کھلے ہوئے، جھیل میں نہاتے ہوئے کنول، نیل کنول...... بہت ہی سندر لانبے بال جو گھٹنوں تک لہرا رہے تھے۔ منور چہرہ، گول اور بیضوی کا امتزاج، گول ٹھوڑی میں ننھا سا گڑھا، بھرے بھرے رخسار، گہری نشیلی آنکھیں، چاندی پیشانی پر دمکتا ہوا ٹیکہ اور سر کے گرد ایک عجیب سی پراسرار روشنی کا ہالہ، نیلی ساری میں لپٹا ہوا متناسب جسم۔ نازک کلائیوں پر موتیا کے گجرے، موتیا کی لڑیوں میں لپٹی ہوئی بانہیں۔ موتیا کی لڑیوں میں لپٹی ہوئی بانہوں کا لہراؤ، بدن کے ہر ہر عضو میں بلا کی لچک........

(میگھ ملہار۔ مشمولہ سویرا، لاہور، شمارہ 91 تا 12، ص 56)

'نیل کنول' کا موضوع موسیقار کا داخلی کرب ہے جو اس کے جذبۂ عقیدت، پرستش اور تخلیقی عمل سے متعلق ہے۔ پورا افسانہ حسن اور موسیقی کی دیوی سرسوتی کی ہندو دیو مالا پر مرکوز ہے۔ یہاں ممتاز شیریں نے پلاٹ اور کردار نگاری کے روایتی طریقے سے انحراف کرتے ہوئے شاعرانہ حسن بیان کے ساتھ فنکار کے سوز و گداز کی اس کیفیت اور دیوی سرسوتی کے حسن کو بیان کیا ہے جس میں فنکار اپنی ذات سے نکل کر ابدیت کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔

اسی طرح افسانہ 'سرسوتی' کا مرکزی کردار اپنے گاؤں کی ایک لڑکی رادھا کا عاشق شیام نام کا ایک نوعمر فنکار ہے جو نام نہاد سنیاسی سورداس کے دھوکے میں آکر حسن اور کلا کی دیوی سرسوتی کو انسانی روپ میں لاکر قید کروانے میں نادانستہ طور پر اس سنیاسی سورداس کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ لیکن شیام کو جب اپنی غلطی اور گناہ کا احساس ہوتا ہے تو وہ ہوس پرست جادوگر سورداس کے چنگل سے مقدس دیوی کو آزاد کرانے کا عزم کرکے اس کی تلاش میں

نگری نگری مارا پھرتا ہے۔ کافی عرصے بعد شیام کی ملاقات گھنے جنگلوں میں ایک خوبصورت دوشیزہ سے ہوتی ہے جو اسے مہمان کی حیثیت سے اپنی کٹیا میں ٹھہراتی ہے۔شیام کے پوچھنے پر وہ اپنے بارے میں بتاتی ہے:

''تم باور نہیں کروگے پردیسی، میں اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں۔ مجھے صرف یہ بتایا گیا ہے کہ میں بدیسہ میں سرسوتی کے مندر کے کھنڈروں کے پاس بیہوش پائی گئی۔ اور یہ سنیاسی مجھے اٹھا کر یہاں لے آیا۔ تب سے میں یہیں رہتی ہوں۔''

جنگل میں تنہا رہنے والی یہ خوبصورت دوشیزہ دراصل حسن اور موسیقی کی دیوی سرسوتی ہے جو ایک رات شیام کی بانسری کی دھن پر آکاش سے انسانی روپ میں اس کے سامنے آگئی تھی اور تب بہروپیا سنیاسی سورداس دیوی کو اپنے منتروں کے ذریعے قید کر کے یہاں اٹھا لایا تھا۔ بہروپیے نے اپنے منتروں کے زور سے دیوی کو قید تو کر لیا تھا لیکن بعد میں اسے بہت پچھتاوا ہوتا ہے اور وہ اپنے کیے کا توڑ معلوم کرنے کے لیے نگر نگر کی خاک چھانتا ہے اور بالآخر اسے وہ مقدس پانی مل جاتا ہے جس کے چھڑکنے سے دیوی اپنی اصلی حالت میں آسکتی ہے لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں کہ دیوی کو آزاد کرنے کے لیے وہ اپنی جان قربان کردے۔ کیوں کہ جو کوئی اس مقدس پانی کو دیوی کے انسانی روپ یعنی دوشیزہ پر چھڑکے گا وہ پتھر بن جائے گا۔ چنانچہ شیام اپنی جان کی قربانی دے کر دیوی سرسوتی پر مقدس پانی چھڑک کر اسے عیار سنیاسی کے جنگل سے آزاد کراتا اور خود پتھر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

''سرسوتی'' کے پلاٹ کی بنیاد ہندو دیومالا پر ہے۔ اس میں شیام اور رادھے کی معصوم اور پوتر محبت کی داستان کے علاوہ بہروپیے سورداس کی ہوس اور فریب کی بھی کہانی ہے جو اچاریہ پورنا بردھن کی زبانی سنائی گئی ہے۔ پوری کہانی میں رمزیت، رومان اور عقیدت کی فضا چھائی ہوئی ہے، اور فن اور فنکار پر فوکس کے باوجود محبت اور عقیدت کا موضوع غالب ہے، جو اپنے دھیمے پن اور لطافت کی وجہ سے انتہائی اثر انگیز ہے۔

اپنے ایک اور افسانے 'کفارہ' میں بھی ممتاز شیریں نے کئی ایک اساطیری کردار کو شامل کیا ہے۔ اس افسانے میں ممتاز شیریں نے قدیم دیو مالاؤں کو اپنے عصر سے ملانے یا کہیے انھیں موجودہ صورت حال سے تطبیق دینے کی جو کوشش کی ہے اس میں وہ بہت حد تک کامیاب ہیں۔ اس افسانے میں نیم بے ہوشی کی حالت میں مرکزی کردار کا تخیل یا اس کی روح مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے سفر پر نکلی ہوئی ہے۔ اس دوران وہ شیو جی، ناقص الخلقت بونے جسے شیو جی نے انگوٹھی بخش دی تھی، راجہ سوریہ ورمن، راج ہنسوں کی شہزادی اور مہاتما بدھ کی زیارت کرتی ہے۔ ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''نٹ راجہ دیوانہ وار اپنا وحشیانہ موت کا ناچ ناچتا رہا۔ اور پھر اپنی ایک ٹانگ رقص کے انداز میں فضا میں معلق کیے ہوئے دوسری ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا پیر انسان کی گردن پر تھا اور انسانی زندگی اس کے پیروں کے نیچے دم توڑ رہی تھی۔ ہندوستانی نٹ راجہ شیوا کے زیادہ شفیق کمبوڈین پیکر میں ڈھل گیا۔ اس کے موٹے ہونٹوں پر ایک مہربان بلکہ ہوسناک تبسم تھا۔ اس کے سر پر بالوں کی جٹائیں بل کھاتے ہوئے سانپوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں، جن پر نصف چاند کا ہالہ سجا ہوا تھا۔ شیوا تخریب کا دیوتا تھا اس لیے تعمیر کا بھی دیوتا تھا کیونکہ موت ہی کی کوکھ سے زندگی نکلتی ہے۔''

(کفارہ، مشمولہ سوغات، بنگلور، ستمبر 1992، ص 32-431)

'کفارہ' کی تعمیر، خیال کا ارتقا اور اس کی تکمیل بڑے فنکارانہ طریقے سے ہوئی ہے۔ یوں تو افسانے میں بظاہر تین دن کا وقت ہے جسے ایک رات بلکہ چند گھنٹوں میں سمیٹا گیا ہے لیکن افسانہ نگار کی خوبی یہ ہے کہ اس نے حال کو معلق کر کے تلمیحات واساطیر کے ذریعے ماضی کی بازآفرینی کے عمل میں صدیوں کے وقت کو پھلانگنے کا ایسا کامیاب تجربہ کیا ہے، جس کی مثال اردو افسانے کی تکنیک میں بہت کم ملتی ہے۔ شیریں کے تقسیم ملک کے موضوع پر لکھے افسانے 'بھارت ناٹیہ' میں بھی شیو، پاروتی اور گنیش جی کی تمثیل ہے۔

ہمارے عہد کے افسانہ نگار سلام بن رزاق نے بھی اپنے افسانوں میں ہندی اساطیر کا بڑا ہی عمدہ استعمال کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی تین کہانیاں بہت ہی اہم، خوبصورت اور جدید عہد سے مطابقت رکھتی ہیں۔ ایک 'آج کا شرون کمار' دوسری 'یک لویہ' اور تیسری کہانی 'یک لویہ کا انگوٹھا'۔ 'یک لویہ' کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''ہرنیہ دھنش بھیل اپنے اکلوتے لڑکے یک لویہ کو ساتھ لیے جنگل، بیابان، ندی، نالے، پہاڑ، وادیاں طے کرتا، ہفتے مہینوں کی صعوبتیں جھیلتا اندر پرستھ پہنچ گیا۔''

دراصل ہرنیہ دھنش بھیل اپنے بیٹے کی اس ضد سے مجبور ہو کر شہر آیا تھا کہ وہ اسے گرو درونا چاریہ سے ملوادیں تا کہ وہ ان سے تیر اندازی کی شکچھا لے سکے۔ جب یہ لوگ رنگ محل کے دوار پر پہنچنے کے بعد پہرے دار کے پوچھے جانے پر آنے کی وجہ بتاتے ہیں تو ان سے دوار پال کہتا ہے:

''چپ کر دشٹ! ایک نیچ جاتی ہو کر مہا گرو درونا چاریہ کے درشن کرنا چاہتا ہے۔ جانتا ہے تو نے اپنی اپوتر زبان سے مہا گرو کا نام لے کر ایک گھور پاپ کیا ہے۔ اس پاپ کے بدلے تیرے منہ میں دس انگل لوہے کی سلاخ گرم کر کے گھسیڑی جاسکتی ہے۔''

بہر حال حقارت اور ذلت سہتے دونوں باپ بیٹوں کی ملاقات گرو جی سے ہو جاتی ہے۔ گرو جی اسے بتاتے ہیں کہ دھنر ودیا کیول کشتری کماروں کو سکھائی جاتی ہے۔ بھیل کو اس ودیا کے سیکھنے کے جرم میں پران دنڈ دیا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ یہ کہہ کر انھیں واپس بھیج دیتے ہیں کہ ''یہ ہمارے نی یموں کے وردھ ہے۔ پرنتو تمھیں آشیرواد دیتے ہیں۔'' افسانے کے دوسرے حصے کا آغاز یوں ہوتا ہے: ''پھر یہ ہوا کہ ساڑھے تین ہزار برس کے بعد یک لویہ نے ایک غریب مزدور کے گھر میں جنم لیا۔ اس مزدور کا نام بھی ہرنیہ دھنش تھا۔ یک لویہ جب پانچ برس کا ہوا تو ہرنیہ دھنش نے اسے ایک میونسپل اسکول میں داخل کیا۔'' وہ محنت سے پڑھتا رہا۔ اس کی خواہش تھی کہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے سو، ہائر سکنڈری میں اس نے ٹاپ کیا۔ اب اس کا باپ اسے لے کر ایک میڈیکل کالج میں جاتا ہے۔ اتفاق سے گرو درونا چاریہ ہی کالج کے پرنسپل تھے۔ گرو جی اس سے کہتے ہیں: ''ہرنیہ آج بھی ہم مجبور ہیں۔'' ہرنیہ اسے بتاتا ہے کہ: ''سرکار چھوٹا منھ بڑی بات۔ اُس بکھت ہمارا جنم شدروں میں ہوا تھا۔ مگر آج تو ہم شدر نہیں ہیں۔'' گرو جی کہتے ہیں: ''یہی تو گڑ بڑ ہے ہرنیہ! زمانہ بدل چکا ہے۔ تم آج بھی شدر یا ہریجن ہوتے تو میں آنکھیں بند کر کے یک لویہ کو بی۔ سی کوٹے میں سیٹ دے دیتا۔ مگر اب اڑچن یہی ہے کہ تم شدر نہیں ہو۔''

''یک لویہ کا انگوٹھا'' میں یک لویہ۔ دلت گھرانے میں

نٹ راجہ دیوانہ وار اپنا وحشیانہ موت کا ناچ ناچتا رہا۔اور پھر اپنی ایک ٹانگ رقص کے انداز میں فضا میں معلق کیے ہوئے دوسری ٹانگ پر کھڑا ہوگیا۔اس کا پیر انسان کی گردن پر تھا اور انسانی زندگی اس کے پیروں کے نیچے دم توڑ رہی تھی۔ہندوستانی نٹ راجہ شیوا کے زیادہ شفیق کمبوڈین پیکر میں ڈھل گیا ۔اس کے موٹے ہونٹوں پر ایک مہربان بلکہ ہوسناک تبسم تھا۔اس کے سر پر بالوں کی جٹائیں بل کھاتے ہوئے سانپوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔جن پر نصف چاند کا ہالہ سجا ہوا تھا۔شیوا تخریب کا دیوتا تھا اس لیے تعمیر کا بھی دیوتا تھا کیونکہ موت ہی کی کوکھ سے زندگی نکلتی ہے۔

جنم لیتا ہے۔ شہر میں رہ کر پڑھتا ہے۔ اور بالآخر سناتن میڈیکل کالج کے ٹیسٹ اگزام میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس بار بھی کالج کے پرنسپل گرو درونا چاریہ ہیں۔ لیکن وہ یک لویہ کو بی۔سی (Backward Class) کوٹے میں ایڈمیشن لینے سے روک نہیں پاتے۔ کورس پورا ہونے کے بعد گرو درونا چاریہ یک لویہ کو اپنے آفس میں بلا کر کہتے ہیں:

''یہ ایک وِڈمبنا ہے کہ اتہاس نے ہمیں پھر اسی استھان پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ہم ہزاروں ورش پہلے کھڑے تھے۔ اس سناتن پرمپرا کے انوسار جس نے ہمیں گرو شِشیہ کے رشتے میں باندھ دیا ہے۔ ہم تم سے وہی گرو دکشنا طلب کرتے ہیں جو تم نے پچھلے جنم میں ہمیں بھینٹ کی تھی۔''

دراصل درونا چاریہ نے گرو دکشنا کا پانسہ اس لیے پھینکا تھا کہ یک لویہ دیا کی بھیک مانگے اور گرو جی ترس کھا کر اسے بخشش دیں۔ اس طرح یک لویہ عمر بھر خجالت اور احسان مندی کے دکھ میں مبتلا رہے اور گرو جی کی پُرغرور انا آسودہ ہوتی رہے۔ درونا چاریہ یک لویہ کے فن کو نہیں اس کی خود اعتمادی، خودداری اور عزم و حوصلے کو ناکارہ بنانا چاہتے تھے۔ لیکن پانسہ الٹا پڑا۔ یک لویہ نے اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا کاٹ کر گرو جی کو بھینٹ کر دیا۔ اس واقعے کے بعد یک لویہ غائب ہوجاتا ہے۔ گرو جی کو ہمہ وقت یہ بات پریشان کرتی ہے کہ آخر یک لویہ چلا کہاں گیا۔ پھر مطمئن ہوجاتے ہیں کہ یک لویہ اب کوئی آپریشن، یا کسی طرح کی سرجری کرنے کے لائق نہیں رہ گیا، سو خودکشی کر لی ہوگی یا کوئی اور کام کرتا ہوگا۔ لیکن دس برس بعد ایک صبح درونا چاریہ ہکا بکا رہ جاتے ہیں جب ان کا ملازم ایک وزیٹنگ کارڈ انھیں دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کارڈ پر لکھا تھا: ڈاکٹر یک لویہ ہرنیہ دھنش، فزیشین اینڈ سرجن۔ پتہ لندن کا تھا اور اس پر کئی ایک ڈگریاں لکھی ہوئی تھیں۔ یک لویہ بتاتا ہے کہ کل ہونے والی کانفرنس میں اسے ایک اوپن ہارٹ سرجری ڈیمانسٹریشن کے لیے بلایا گیا ہے، جسے تمام چینلز لائیو کاسٹ کریں گے۔ درونا چاریہ حیرت سے پوچھتے ہیں ''بٹ ہاؤ اٹ از پاسبل؟'' یک لویہ جواب دیتا ہے:

''سر! آپ نے سناتن پرمپرا کے انوسار گرو دکشنا میں مجھ سے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا مانگا تھا۔ سو میں نے دے دیا۔ مگر آپ کو معلوم نہیں کہ میں یساری (لیفٹسٹ) ہوں۔ میں اپنے سارے کام بائیں ہاتھ سے کرتا ہوں۔ حتیٰ کہ سرجری بھی۔''

سلام بن رزاق کے افسانے 'ایک اور شرون کمار' میں بھی یک لویہ کی طرح ہی ایک محنتی، جوان اور فرمانبردار ہندو دیومالائی کردار شرون کی زندگی کا نیا اوتار ہے۔ اس افسانے میں بھی اس قدیم کردار کو جدید عہد کی صورت حال سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ نبرد آزما دکھایا گیا ہے۔ افسانے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''راجہ دشرتھ کے ہاتھوں شرون کمار کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح دیش بھر میں پھیل گئی۔ لوگ شرون کمار کی سعادت مندی، خدمت گزاری اور فرمانبرداری پر عش عش کر اٹھے۔ اور اس کی جواں مرگی کو یاد کر کر کے افسوس کرنے لگے...... اتفاق سے انھی دنوں پاس کی ایک بستی میں ایک اور شرون کمار رہتا تھا۔ اس کے ماتا پتا بھی ضعیف اور اندھے تھے۔ البتہ اس کے ماتا پتا نے بہت پہلے اس کی شادی کر دی تھی اور اب وہ ایک عدد بیوی کا شوہر اور چار عدد بچوں کا باپ تھا۔ اس کی ایک بیوہ بہن بھی تھی۔ جو اپنے شوہر کے ناوقت انتقال کے بعد سسرال والوں کے ظلم سے تنگ آ کر بچوں کے ساتھ اس کے گھر آ گئی تھی۔ وہ ایک ذمے دار فرد کی طرح سب کی کفالت کر رہا تھا۔''

شرون کمار گھر والوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے، انھیں آرام پہنچانے کی خاطر جان توڑ محنت کرتا ہے، لوگوں کی گھڑکیا سہتا ہے، گالیاں سنتا ہے، ذلتیں اٹھاتا ہے اور اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی ماں، باپ، بہن، بیوی اور بچوں کی طنز میں ڈوبی باتیں سنتا ہے۔ اس کے ماں باپ اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ انھیں بھی کاشی دھام لے جا کر گنگا اشنان کروائے۔ اس ضد میں اس کی بیوی، بہن اور بچے بھی ساتھ ہوجاتے ہیں۔ وہ ایک گاڑی بنا کر سب کو اس میں بٹھاتا ہے اور بیل کی جگہ خود اس میں جت کر سفر پر روانہ ہوجاتا ہے اور پھر ندی، نالے، جنگل، بیابان پار کرتا، آندھی، طوفان سے جوجھتا، موسموں کے تیور سہتا، رات، دن سفر کرتا کاشی کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ آخر وہ سریوندی کے جنگل میں اس برگد تک کے نیچے سب کو بٹھاتا ہے جہاں سورگیہ شرون نے اپنے ماتا پتا کو بٹھایا تھا۔ اور پھر وہ گھڑا لے ندی سے پانی لینے جاتا ہے۔ جاتے ہوئے وہ سوچتا ہے: ''کتنا اچھا ہو اگر آج کی رات بھی راجہ دشرتھ شکار کے لیے آئے ہوں

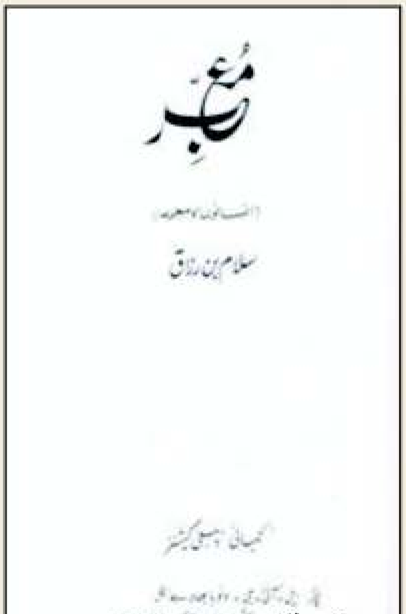

اور آج بھی وہ غلطی سے تیر چلادیں اور تیر سیدھا میرے سینے میں پیوست ہوجائے۔ اور میں اس بوجھل، شکستہ اور اس ناقابل برداشت زندگی کے بوجھ سے نجات پا جاؤں۔'' لیکن نہ راجہ دشرتھ آتے ہیں، نہ ان کا تیر آتا ہے۔

تسلیم کرنا چاہیے کہ اردو میں سب سے زیادہ اساطیری کہانیاں لکھنے والے فکشن نگار کا نام انتظار حسین ہے۔ انتظار حسین نے اسلامی اساطیر کے ساتھ بودھ جاتک اور ہندو دیومالا کرداروں سے بھی اردو افسانے کو ثروت مند بنایا ہے۔ اسے دلکشی، وسعت اور فکر انگیزی بخشی ہے۔ کچھوے، پتے، واپس، رات، دیوار، آخری آدمی، کشتی اور نرناری جیسے افسانے اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ہندو دیومالائی کرداروں میں انھوں نے سیتا، رام، وشنو، منو، اور مہابھارت کے کئی اور کرداروں کو اپنے افسانوں میں سمویا ہے۔ جوگندر پال کے بعض افسانوں میں بھی اساطیری واقعے خمیر کی صورت موجود ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانے 'عفریت' میں رام لیلا کے پس منظر میں راون کے کردار کو دہشت گردی کا خوبصورت استعارہ بنایا ہے۔ اسی طرح اردو کے دوسرے افسانہ نگاروں نے سیتا، رام، درگا، گنیش، راجہ کنس، رادھا، یشودھا، شری کرشن جی، ارجن، لکشمی اور متعدد ہندو اساطیر کو اپنے افسانوی کرافٹ میں ڈھالا ہے۔ یہی اردو زبان و ادب کی وسیع المشربی ہے، گنگا جمنی تہذیب کی علمبرداری ہے اور یہاں کے مذاہب و عقائد اور یہاں کی روایات سے محبت کی علامت ہے، ان سب کا زندہ ثبوت اور واضح دلیل ہے۔

■

Abu Bakar Abbad
Dept of Urdu
Delhi University
Delhi - 110007
Mob.:9810532735
Email.: bakarabbad@yahoo.co.in

اردو شاعری میں ہندو دیومالائی عناصر اور رام کا کردار

مہر فاطمہ

دیو مالائی عناصر اور اسطوری فکر نے اردو ادب کو بہت مالا مال کیا ہے۔ ہمارے یہاں دیو مالا کے ساتھ ساتھ اساطیر کی اصطلاح بھی رائج ہے۔ دیو مالا، اساطیر، متھ قدیم افسانوی قصوں اور دیوی دیوتاؤں سے متعلق داستانوں کو کہا جاتا ہے۔ اساطیر کی تعریف ماہرین نے مختلف انداز میں کی ہے:

'ہارن بی' ایسی کہانیوں کو اساطیر کہتا ہے جو قدیم زمانے سے سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں، جن میں نسلی عقائد قدیمہ سموئے ہوئے ہیں۔ 'کارل یونگ' تو اساطیر کو ایسی آرکی ٹائپس قرار دیتا ہے جو افراد کے اجتماعی حافظے یا اجتماعی لاشعور میں زمانے سے محفوظ چلے آتے ہیں۔ ان سے تشکیل پائے ہوئے تخیلی واقعات محض تخیل کی کارفرمائی نہ ہو کر انسانی زندگی یعنی اس کے افکار، زبان و ادب، مذہب، تہذیب، تاریخ و جغرافیہ غرض تمام شعبوں کی اثر آفرینی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ فریزر کے نزدیک 'اساطیر سے مراد وہ دیو مالا ہیں جن میں قدیم رسومات کی یاد محفوظ رہتی ہے۔ فریزر تاریخ میں بیان ان واقعات کو بھی اسطور میں ہی شمار کرتا ہے۔ جو کچھ لوگوں کے ساتھ ایک بار رونما ہو چکے ہیں۔

دیو مالا اور اساطیر کے علاوہ عربی زبان و ادب میں 'خرافات' بھی اس قبیل کی ایک اصطلاح ہے۔ 'خرافہ' تاریخی شخصیت تسلیم کی جاتی ہے، جس کے بے سر و پا اور عقل سے پرے باتوں کو 'خرافات' کہا جاتا ہے۔ جبکہ اردو میں آج بھی 'خرافات' کا لفظ لایعنی باتوں کے لیے مستعمل ہے۔ غرض یہ کہ متھ، دیو مالا، اساطیر اور خرافات معنی اور مفہوم کے اعتبار سے مشترک ہیں اور ان کا ربط بالعموم مذہب سے ہی ہے۔ اس لیے جہاں اساطیر کا ذکر ہوگا وہاں مذہب کا دخل لازماً ہوگا۔ مذہب سے علیحدہ رکھ کر اساطیر کی تفہیم ممکن نہیں ہے۔

اسطوری فکر و فلسفے نے اردو ادب کو بے شمار تلمیحات و استعارات، علامات و تمثیلات اور ان گنت موضوعات فراہم کیے ہیں۔ اساطیری فکر پر استوار ادب نے کلاسیکی مرتبہ حاصل کیا ہے۔ اس میں جہاں رستم و اسفند یار کی داستانیں ہیں وہاں کرشن و ارجن کے واقعات بھی موجود ہیں۔ شیریں و لیلیٰ کی محبوبانہ دلنوازیوں کے ساتھ ساتھ شکنتلا و رادھا کے والہانہ عشق بھی نفسی طمانیت کا سامان بنتے ہیں۔ یوسف و زلیخا اور بلقیس و سلیمان کے ساتھ رام و سیتا اور کرشن و رادھا بھی اردو شاعری اور قصہ گوئی میں اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہیں۔

اردو کی دکنی اور گجراتی صوفیانہ شاعری میں دیو مالائی اصطلاحات و تمثیلات کا ایک جہاں آباد ہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اردو کی پہلی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' میں نظامی نے شیش ناگ کے علاوہ کئی دیوتاؤں کا ذکر کیا ہے۔ میراں جی کی شمش العشاق کی 'چہار شہادت' میں بھی خالص ہندو فلسفے کی اصطلاحیں ملتی ہیں۔ برہان الدین جانم کے کلام میں ہندو اساطیر و روایات سے بہت کچھ اخذ کیا گیا ہے۔ اس دور کا ادب بالخصوص شاعری ہندو مسلم عقائد کا سنگم بن چکی تھی۔ برہان الدین جانم کا کلام بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ہندو مذہب سے ماخوذ اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ بھگتی تحریک کی یہ اصطلاحیں اردو شاعری کے صوفیانہ موضوعات میں کچھ اس طرح گھل مل گئیں کہ ان کا اپنا علاحدہ وجود ہی نہ رہا۔ قلی قطب شاہ، وجہی، نصرتی، غواصی اور ابن نشاطی وغیرہ کی شاعری میں کم و بیش یہی فضا ملتی ہے۔ قلی قطب شاہ کی عشقیہ شاعری میں ان تلمیحات کا استعمال کثرت سے ہوا ہے مثلاً مدن دیوتا (کادیو) اور پری پدمنی وغیرہ۔

شمالی ہند میں افضل پانی پتی کی تصنیف 'بکٹ کہانی' میں کرشن کے دوست 'اودھو' کا تذکرہ ملتا ہے۔ اودھو بھگوت گیتا کے کرداروں میں سے ایک ہے۔ ابراہیم علی عادل شاہ ثانی کی تصنیف 'نورس' میں دیوتاؤں کا تذکرہ ملتا ہے اگرچہ نورس خالص موسیقی کے متعلق نظم ہے لیکن انھیں اصطلاحات کے ذریعے انھوں نے اپنے خیالات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ علی عادل شاہ ثانی کے کلیات میں کئی جگہ بھاگیرتی، آرتی اور چودہ رتنوں، سرپال یا پاتال کا ذکر ہوا ہے۔ اسی طرح کی تلمیحات نصرتی، ہاشمی اور دیگر دکنی شعرا کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ البتہ دکن کے مقابلے شمالی ہند کی شاعری میں بہت کم یہ عوامل دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ولی تک پہنچتے پہنچتے دکنی شاعری میں بھی ان کا استعمال کم ہو جاتا ہے جب کہ ہندی طرز فکر برقرار رہتا ہے مثلاً ولی اور سراج کے یہاں سجن، سکھی، نین، رت، بسنت اور پیا وغیرہ ہندی کے کثیر الاستعمال الفاظ ہیں۔

متقدمین شعرا میں قائم، بیدار، اثر، سوز، میر، جرات، انشا، راسخ، مصحفی اور نظیر کے یہاں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ نظیر کے یہاں تو ہولی، دیوالی اور کرشن کی بانسری وغیرہ پر بے شمار طویل نظمیں ہیں۔ غالب کی مثنوی 'چراغ دیر' میں یہ تلمیحات و استعارات مل جاتی ہیں۔ یہ مثنوی انھوں نے بنارس کی تعریف میں لکھی تھی اس کے بعد منیر شکوہ آبادی کی نظم بھی بنارس کی تعریف میں ملتی ہے جبکہ محسن کاکوری کے مشہور قصیدہ کی ابتدا ہی اس طرح ہوتی ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پر لاتی ہے صبا گنگا جل

جدید شاعری میں میرا جی، ساغر نظامی، اختر الایمان، فیض، راشد، قتیل شفائی، شہاب جعفری اور منیر نیازی وغیرہ کے یہاں بھی ہندوئی تلمیحات و علامات کا استعمال ملتا ہے۔ شہاب جعفری نے 'سورج کا شہر' میں سورج کو اپنی محبوبہ کی تلاش میں سرگرم سفر دکھایا ہے۔ یہ تصور 'رگ وید' سے ماخوذ بتایا گیا ہے۔ ظفر اقبال نے مجموعہ کلام 'ہنومان' میں ہنومان کی ذات کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ عبد العزیز خالد کی نعتیہ شاعری میں دیو مالائی اور اساطیری اور مذہبی اصطلاحات و علامات جا بہ جا ملتی ہیں۔

اردو شاعری میں ہندوؤں کی مذہبی کتب کے منظوم تراجم کی روایات بھی بڑی قدیم ہے۔ 'ڈاکٹر محمد عزیز' کی کتاب 'اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ' منظر عام پر آئی۔ جس میں سولہ کتب خانوں کا جائزہ لے

کر ایک سو نوے منثور و منظوم کتابوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یحییٰ نشیط نے اپنے مضمون 'اردو میں منظوم گیتا' میں تیرہ منظوم تراجم کا تعارف پیش کیا ہے۔ مظفر حنفی نے اپنے مضمون میں پندرہ منظوم رامائنوں کا جائزہ لیا ہے۔ رامائنوں اور گیتا کے علاوہ ہندو مذہب کی اور بہت سی کتابوں کے منظوم ترجمے ہوئے ہیں۔ رامائن مہارشی بالمیکی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے رام کی زندگی کی کہانی پیش کی ہے۔ قدیم ہندو روایات کے مطابق بھگوان رام ایشور کے اوتار تھے۔ ہندو مذہب میں انھیں وشنو کے دس اوتاروں میں سے ساتواں مانا گیا ہے۔ اساطیری روایات کے مطابق رام اجودھیا کے راجہ دشرتھ اور رانی کوشلیا کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ رام کی بیوی کا نام سیتا تھا جو لکشمی کا اوتار مانی جاتی ہیں۔ ہنومان بھگوان رام کے سب سے بڑے پرستار مانے جاتے ہیں۔ ہندو مذہب کے کئی تہوار جیسے رام نومی، دسہرا اور دیوالی رام کی داستان سے جڑے ہوئے ہیں۔ رام کو ہندوستانی تہذیب کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور ان کی داستانیں اس قدر مشہور ہیں کہ دوسرے ممالک میں بھی صدیوں سے لوگ جانتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ان کی یاد میں دسہرا تو منایا ہی جاتا ہے اس کے علاوہ ان واقعات کی یاد کو تازہ کرنے کے لے رام لیلا ہوتی ہے جس میں رامائن کے واقعات کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ رام کے کردار اور ان واقعات کو اس قدر شہرت ملی ہے کہ یہ تمام دل و دماغ پر ثبت ہو چکے ہیں۔ اردو شاعروں نے جن مذہبی شخصیات پر نظمیں لکھیں ہیں رام بھی ان میں سے ایک ہیں۔ علامہ اقبال کو بھی اس کردار نے بھی بہت متاثر کیا ہے۔

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطہء مغرب کے رام ہند
یہ ہندوؤں کی فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی سماج میں رام نے زندگی کی جو مثال قائم کی ہے اس کی اہمیت آج بھی پورے ہندوستان میں برقرار ہے۔ وہ زندگی، ہندوستانی فلسفہ اور ثقافت کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ رامائن کے واقعات چونکہ بہت طویل ہیں یعنی ایک داستان میں کئی چھوٹی چھوٹی داستانیں ہیں جس میں ایک بن باس کی داستان بھی ہے اسی پہلو کو چکبست نے رامائن کے ایک سین میں نظم کیا ہے۔ نظم کی ابتدا کچھ یوں ہے۔

رخصت ہوا وہ باغ سے لے کر خدا کا نام
راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی
دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نو نہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے
کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
نور نظر پہ دیدہ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالت دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا
آخر اسیر یاس کا قفل دہن کھلا
افسانہ شدائد رنج و محن کھلا
اک دفتر مظالم چرخ کہن کھلا
وا تھا دہان زخم کہ باب سخن کھلا

اس کے بعد ماں اور بیٹے کا مکالمہ ہے۔ ماں کہتی ہے۔

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کہ مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت وتاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگا دوں گی راج کو
ایسے بھی بہت نامراد آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر
یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کہ مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کہ باغ تمنا اجڑ گیا

بیٹے کا جواب دیکھیے۔

دیکھیں ہیں اس سے بڑھ کہ زمانے نے انقلاب
جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوز دروں سے قلب و جگر ہوگئے کباب
پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اجڑ گئے
پڑتا ہے جس غریب پر رنج و محن کا بار
کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کرد گار
مایوس ہو کہ ہوتے ہیں انساں گنہ گار
یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امر رضا میں جو خم رہے
اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام

یہ نظم جہاں رشتوں کی پاسداری، رام کی وفاداری، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری اور تصویر کشی کا مرقع ہے وہیں تہذیب و ثقافت سے بھی اپنا رشتہ جوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہی لاشعوری طور پر ذہن میر انیس کے مرثیہ ''جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج'' کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس مرثیہ میں انیس نے عون اور محمد کے حضرت زینب سے وداع لینے کو نظم کیا ہے۔ جب کہ یہاں رام کے رخصت ہونے سے قبل اپنی ماں سے ملاقات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ دونوں جگہوں پر صورت حال یکساں ہے۔ بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے چکبست نے رامائن کے اس حصے کا انتخاب کر کے اپنی شاعرانہ مہارت، قادر الکلامی اور فنی چابکدستی سے یادگار بنادیا ہے۔ اردو شاعری میں رام کو امر کردیا ہے۔ یہ نظم رام کے کردار کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ اس سے ان کی شخصیت کے تمام پہلو بخوبی اجاگر ہو جاتے ہیں۔

غرض یہ کہ اساطیر سے اردو شاعری میں ترسیل و تکنیک کا کام اس ہنر مندی سے لیا گیا ہے کہ اسلوب میں جدت و تاثر دونوں پیدا ہو گئے ہیں۔ اس تکنیک نے موضوع اور اسلوب، ہیئت اور مواد، غرض ہر سطح پر اردو ادب کے سرمائے میں معتبر اضافہ کیا ہے۔ دیولائی علامت اور تشبیہ کے معانی اور اس کی اہمیت کو جاننے کا بہترین ذریعہ ہیں اور مفاہیم کے نئے نئے در وا کرتی نظر آتی ہیں۔

■

Mehar Fatima
R-314, Sara Apts, First Floor, F3 Near Qadri Masjid, Jogabai Extrn, Batla House, Okhla
New Delhi110025
Mob.:9891170486/9555949032
E-mail.: meharekta004@gmail.com

قیوم بدر

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا

مدرسے سے نکل کر جگندل چشمۂ رحمت پرائمری اسکول کے درجہ چہارم میں داخل ہوا، یہ 1965 کا زمانہ تھا، اس وقت تک اردو لکھنے پڑھنے کی کما حقہ شد بد ہوگئی تھی۔ ہمارے نصاب میں 'غنچۂ اردو' کتاب شامل تھی جس کی کہانیاں آج بھی میرے ذہن و دل پر نقش ہیں۔ مثلاً ایک اندھے فقیر کی کہانی، اودھ کا فتو چور اور بشرے کی شہزادی وغیرہ جو یقیناً ذہنی بالیدگی میں معاون ثابت ہوئیں۔ ساتویں آٹھویں جماعت تک جاتے جاتے جو کتابیں نظر سے گزریں ان کے عنوانات تو یاد نہیں لیکن انہی نصابی کتابوں میں مجاز لکھنوی کی مشہور زمانہ نظم 'آوارہ' اور انجم مانپوری کا مزاحیہ ڈرامہ 'میر کلو کی گواہی' شامل تھا خصوصاً مجاز کی نظم آوارہ سے بہت متاثر ہوا۔ جس کے مصرعے ہنوز ذہن میں محفوظ ہیں۔

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بہ در مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

نظم آوارہ کے حوالے سے لفظ 'ناشاد' پہلی بار سنا تھا۔ چنانچہ اسے تخلص کے طور پر اپنا لیا اور قیوم ناشاد لکھنے لگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ لفظ میری دلی کیفیات و جذبات کا صحیح ترجمان بھی تھا باوجود ایں ہمہ میرا مزاج لڑکپن سے طنزیانہ تھا ایسے میں اپنے نصاب میں انجم مانپوری کا مزاحیہ ڈرامہ 'میر کلو کی گواہی' پڑھ کر متاثر ہونا یقینی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مزاح نگار کی حیثیت سے پہلا نام جو میرے ذہن میں آیا وہ انجم مانپوری کا تھا۔ خوشی ہوئی 40 سال بعد میرے دو طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'ہم قبرستان سے بول رہے ہیں' اور 'ناریل کے پیڑ سے لٹکا ہوا سیب' پر بہار اردو اکادمی نے 'انجم مانپوری ایوارڈ' سے سرفراز کیا۔

ابھی میں ساتویں جماعت ہی کا طالب علم تھا، محض تین روپئے ماہانہ مشاہرے پر محلے کی لائبریری 'انجمن اصلاح المسلمین' میں لائبریرین ہوگیا اور کتابوں سے میرا انسلاک ہوا۔ ان دنوں کرشن گوپال عابد، صادق حسین سردھنوی اور نسیم حجازی کی دو تین کتابیں پڑھیں لیکن عادل رشید کا ناول 'لرزتے آنسو' اور دت بھارتی کا 'چوٹ' پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ عادل رشید کا 'لرزتے آنسو' کی قرات کے دوران سچ مچ پلکوں پر آنسو لرزتے رہے۔ مذکورہ ناول متعدد بار پڑھا۔ کرشن چندر تک آتے آتے کرشن چندر کا گرویدہ ہوگیا۔ ایک وائلن سمندر کے کنارے، میری یادوں کے چنار، ایک گدھے کی سرگذشت کے علاوہ متعدد افسانوں کے مجموعے پڑھنے کا اتفاق ہوا، کرشن چندر کی زبان خصوصاً اسلوب پسند آیا لیکن سعادت حسین منٹو کا 'ٹھنڈا گوشت' پڑھا تو سعادت حسین منٹو کی بیباکی سے اس قدر متاثر ہوا کہ منٹو کا فین ہوگیا۔ اس دوران صفیہ اختر کا اپنے شوہر جاں نثار اختر کو لکھے گئے خطوط کا مجموعہ 'زیر لب' پڑھنے کا اتفاق ہوا اور پہلی بار اس کا احساس ہوا کہ اپنوں کی جدائی کا کرب کیا ہوتا ہے... صفیہ اختر کے خطوط کے ہر لفظ سے ان کی دلی کیفیات اور درد کا اظہار ہوتا ہے جس کی چبھن محسوس کیے بنا نہ رہ سکا گو یہ میری نوجوانی اور جوانی کا درمیانی زمانہ تھا لہٰذا اس سے میرا متاثر ہونا یقینی تھا، چھ سات برس بعد میں خود اس کرب سے دوچار ہوا، جب شادی کے محض تین دن بعد میری بیوی چھ سات ماہ مجھ سے دور رہی اور یہ دوری قیامت سے کم نہ تھی۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ اپنوں کی جدائی کا کرب کیا ہوتا ہے۔ ان دنوں سجاد ظہیر کے مرتب افسانے 'باغیانہ افسانے' اور ساحر لدھیانوی کا شعری مجموعہ 'تلخیاں' پڑھ کر ذہنی طور پر بالغ ہوگیا اور الٹے سیدھے افسانے لکھنے لگا۔

1969 میں بزرگوں کا وطن آرہ (بہار) جانے کا اتفاق ہوا، وہیں خوشتر گرامی کا مشہور زمانہ رسالہ 'بیسویں صدی' سے آنکھیں چار ہوئیں۔ اب بیسویں صدی میری کمزوری بن گیا۔ ڈیڑھ دو ماہ بعد بہار سے لوٹنے کے بعد بیسویں صدی کی تلاش میں نکلا لیکن حیرت ہے۔

جنھیں ہم ڈھونڈتے تھے گلی گلی
وہ مکان کے پچھواڑے ملی

یعنی پاس ہی میرے قریب کے رشتے کے نانا حسن مرحوم تھے جو 'بیسویں صدی' کے پرانے خریدار نکلے۔ ان کے حوالے سے 'بیسویں صدی' کے نئے و پرانے شمارے میرے مطالعے میں آئے۔ جس کے تحت فکر تونسوی کے مضامین اور خوشتر گرامی کے 'تیر و نشتر' پڑھ کر میرا رجحان طنز و مزاح کی جانب ہوگیا۔ اس میں روزانہ 'آزاد ہند' کا مشہور کالم 'نمک دان' کا نمک بھی شامل ہے۔ بیسویں صدی کے حوالے سے اپنے دور کے جینوئین شعرا و ادبا کو پہچاننے لگا تھا۔ شاعر اس زمانے میں معیاری رسالہ تھا جبکہ 'شمع' کی اپنی ایک الگ انفرادیت تھی۔ گاہے گاہے دونوں رسالے نظر سے گزرنے لگے، ان سب سے الگ ابن صفی کے ناولوں کی اس زمانے میں دھوم تھی لیکن ابن صفی کی ناولوں کو میں ہاتھ نہیں لگاتا تھا کہ میں نے سن رکھا تھا کہ ابن صفی کے ناول کا ادب سے علاقہ نہیں بس وقت گزاری کے لیے ہے۔ ایک دن لائبریری میں میرے دوست مشہور سائنس فکشن نگار خورشید اقبال نے پوچھا آپ نے ابن صفی کے ناول پڑھے ہیں؟

میں نے کہا نہیں!

خورشید اقبال نے کہا... تب آپ نے کچھ نہیں پڑھا
میں نے کہا کہ میں نے سن رکھا ہے کہ ابن صفی کے

ناول محض تفنن طبع کے لیے ہیں انکا ادب سے علاقہ نہیں۔
خورشید اقبال نے کہا جس نے یہ بات کہی ہے اسے ادب سے علاقہ نہیں۔ ابن صفی کے ناولوں میں وہ سب کچھ ہے مثلاً ادب، تاریخ، جغرافیہ، سائنس حتیٰ کہ مزاح کی چاشنی بھی۔

میں نے دو ایک ناول پڑھا تو دیکھا خورشید اقبال کا کہنا صدفی صد صحیح ہے۔ کم سے کم زبان کے معاملے میں تو ابن صفی مرحوم اپنے زمانے میں بہتوں سے آگے تھے۔ ابن صفی کے ناولوں میں برجستہ مزاح کے علاوہ بلا کا تجسس تھا جس کے سبب نظر کتاب سے ہٹتی نہیں تھی۔

اسی زمانے میں ابراہیم جلیس کی کتابیں 'دو ملک کی ایک کہانی' اور 'اوپر شیروانی اندر پریشانی' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ آخر الذکر کتاب خصوصاً کتاب کا عنوان بہت پسند آیا۔ اس وقت تک پتہ نہیں تھا کہ ابراہیم جلیس مجتبیٰ حسین کے بڑے بھائی ہیں۔ ابراہیم جلیس نے عمر کم پائی علاوہ ازیں ان کی پوری زندگی انتشار کا شکار رہی جس کے سبب کم لکھا تاہم ان کے طنز میں گہرائی تھی وسعت تھی چنانچہ ان کی بقیہ کتابیں بھی پڑھنے کی خواہش تھی افسوس صد افسوس جو نہیں ملی۔

انہی کے زیر اثر ان دنوں ایک مزاحیہ مضمون 'نام کیا رکھیں' لکھا اور محلے کی نشست میں سنایا اس مضمون کی اس قدر پزیرائی ہوئی کہ وحید عرشی مرحوم مجھے کلکتے کے ادبی حلقوں میں سالک لکھنوی، شانتی رنجن بھٹا چاریہ اور مشہور شاعر و صحافی ابراہیم ہوش سے میرا تعارف کرایا کہ یہ ہیں قیوم ناشاد اور طنز و مزاح لکھتے ہیں۔ ابراہیم ہوش نے مسکرا کر کہا کہ واہ صاحب تخلص ناشاد اور لکھتے ہیں طنز و مزاح! بعد میں علاقے کے ایک بزرگ ادب نواز مشہور آرٹسٹ عبدالوہاب محسنی مرحوم نے مجھے مشفقانہ مشورہ دیا کہ قیوم صاحب آپ اپنا تخلص بدل دیجیے نام ہو یا تخلص ہمیشہ اچھا رکھنا چاہیے کہ شخصیات پر نام کا اثر بھی ہوتا ہے۔

ان دنوں بشیر بدر کی شاعری کا چرچا کچھ زیادہ ہی تھا چنانچہ جب میں قیوم ناشاد سے قیوم بدر لکھنے لگا تو کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ میں بشیر بدر کی شہرت سے متاثر ہو کر ناشاد سے بدر ہو گیا لیکن یہ حقیقت نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا تھا۔ مشتاق احمد یوسفی نے اپنے متعلق یہ انکشاف کیا ہے کہ 'بحمد للہ' بھری جوانی میں میرا حال اور حلیہ ایسا نہیں تھا کہ کسی خاتون کے ایمان میں خلل پڑے۔

حال کے معاملے میں تو میں ازل سے بے حال رہا لیکن 'حلیہ' کے معاملے میں مشتاق احمد یوسفی سے الگ نہیں تھا۔ باوجود ایں ہمہ ان دنوں میں ایک خاتون کے ایمان میں خلل کا باعث بنا لیکن باوجود کوشش کے جب انھیں میں اپنی زندگی میں شامل نہ کر سکا تو بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کے مصداق ان کے نام کو اپنے نام کا جز بنا لیا اور... درد دل اب میرے ساتھ ہی جائے گا۔

وحید عرشی مرحوم اور مرحوم عبد الوہاب محسنی سے مراسم ہونے سے تقویت ملی محسنی صاحب نے 'قومی لائبریری' سے ابن انشا کا سفر نامہ 'چلتے ہو تو چین کو چلیے' اور 'آوارہ گرد کی ڈائری' پڑھنے کو دیا اس طرح ابن انشا سے شناسائی ہوئی لیکن 'اردو کی آخری کتاب' پڑھ کر تو ابن انشا کا فین ہو گیا۔ ان دنوں ابن انشا کے سفر نامے اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ پڑھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ ابن انشا سے متعلق ایک مضمون 'ابن انشا... لفظوں کا کھلاڑی' لکھا جو کلکتہ کے 'روزنامہ آزاد ہند' کے سنڈے ایڈیشن میں چھپا جس کی اچھی پذیرائی ہوئی پطرس بخاری کے ایک مجموعے کے علاوہ رشید احمد صدیقی، کنہیا لعل کپور، یوسف ناظم، خصوصاً مجتبیٰ حسین کے مضامین اخبارات و رسائل کے حوالے سے نظر سے گزرتے رہے۔ اس دوران میرا دلی جانے کا اتفاق ہوا ان دنوں مجتبیٰ حسین این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی سے منسلک تھے۔ ان سے ملا، ان کے خلوص سے بہت متاثر ہوا۔ اس ملاقات میں انھوں نے مجھے 'شگوفہ' کا مجتبیٰ حسین نمبر عنایت کیا جس سے نہ صرف میری تحریر میں روانی آئی بلکہ طنز و مزاح کی باریکی کا بھی ادراک ہوا۔ اس وقت تک میں مشتاق احمد یوسفی کو پہچان نہ سکا تھا ممکن ہے دو ایک مضمون نظر سے گزرے ہوں لیکن نام ذہن میں نہیں تھا۔ ان دنوں میں کلکتے کے ایک دفتر سے منسلک تھا میرا پہلا طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'دخل در معقولات' منظر عام پر آچکا تھا۔ اس کی ایک کاپی سالک لکھنوی کو دینے کی خاطر گیا وہیں اتفاق سے جاوید دانش سے ملاقات ہوئی، میں نے دخل در معقولات کی ایک کاپی جاوید دانش کو بھی پیش کی۔ مجھے پتہ تھا کہ جاوید دانش بزنس کے سلسلے میں کنیڈا میں بس گئے ہیں، گاہے گاہے کلکتہ آتے ہیں۔ دو تین برس بعد جمعے کی نماز میں انھیں پارک سرکس مسجد میں دیکھا۔ نکل کر میں اپنا تعارف کرایا۔ نام سن کر خوش ہوئے۔ انہی کی زبانی مشتاق احمد یوسفی کا نام سنا، انھوں نے برجستہ کہا کہ قیوم صاحب! میں آپ کو ایک مشورہ دوں گا کہ دن بھر میں دو ایک کپ چائے کم پیجیے لیکن مشتاق احمد یوسفی کی کتاب 'آب گم' خرید لیجیے یہ آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔ میں نے یہ بات اپنے دوست زماں قاسمی کو بتائی۔ انھوں نے کہا چلو ہم خرید لیتے ہیں۔

'آب گم' پڑھ کر یہ عقدہ کھلا کہ سچ مچ میں اندھیرے میں تھا۔ بعد میں مشتاق احمد یوسفی کی تمام کتابیں 'زرگزشت، خاکم بدہن، چراغ تلے' پڑھ لیں۔ سچ مچ طنز و مزاح کی کتابوں میں یہ کتابیں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ آب گم تو طنز و مزاح کا نکتۂ عروج ہے لیکن طنز و مزاح کے ضمن میں ابن انشا کو بھلانا ممکن نہیں۔ بلاشبہ ابن انشا نے اس صنف کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ تحریف، تخفیف ایک لفظ سے الگ معنی پیدا کرنا محاورات اور ضرب الامثال سے کوئی لفظ نکال کر ہم وزن لفظ فٹ کر دینا یہ سب ابن انشا کا کمال ہے، جس سے تمام طنز و مزاح نگاروں نے استفادہ کیا ہے، جس میں مجتبیٰ حسین اور مشتاق احمد یوسفی کا نام نمایاں ہے اور انھوں نے اس کا برملا اعتراف بھی کیا ہے اس ضمن میں یوسفی کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف ابن انشا کی روایت کو برقرار رکھا ہے بلکہ اپنی ذہانت سے اس میں مزید نکھار پیدا کیا ہے۔ اس تناظر میں یہ کہنا حق بجانب ہے کہ اب مشتاق احمد یوسفی سے اچھا لکھنا معجزہ ہی ہوگا لیکن مشتاق احمد یوسفی کو طنز و مزاح کا 'بے تاج بادشاہ' کہا جائے تو ابن انشا بلاشبہ 'باتاج بادشاہ' قرار پائیں گے۔

■

Qayyum Badr
Bl. No. 3, H/No. 11/3 Near Dulhan Gul
PO+PS: Jagatdal - 743125
North 24 Parganas (W.B)
Mob.: 8100107278

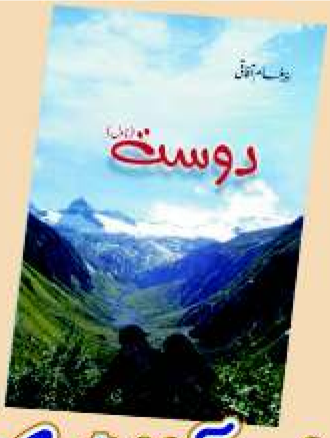

پیغام آفاقی کا 'دوست'

ابرار رحمانی

کبھی کبھی کسی کام میں بے جا تاخیر کے سبب کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور اس کے ذمہ دار ہم خود ہوتے ہیں، جس کا خمیازہ بھی ہمیں بھگتنا پڑتا ہے۔ پیغام آفاقی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ درپیش آیا۔ ان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ان کے کمپیوٹر سے دو ناول برآمد ہوئے۔ اس طویل وقفہ کے سبب اردو کا ایک بڑا حلقہ اسے حیرت و تعجب سے دیکھ رہا ہے اور ایک دوسرا حلقہ مشکوک نگاہوں سے۔ آخر ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟ اس سے پہلے کہ میں پیغام آفاقی کے ناول 'دوست' پر گفتگو کروں اردو فکشن کی تنقید پر ایک نظر ڈال لینا ضروری محسوس ہوتا ہے۔

فی زمانہ اردو میں فکشن کی تنقید مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ بلاشبہ آج ناول کی تنقید میں معشوق کی موہوم کمر بھی موجود ہے اور ریاضی اقلیدس کا خیالی نقطہ بھی۔ لیکن اگر کلیم الدین احمد ہوتے تو شاید اتنی رعایت بھی نہیں دیتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اردو میں فکشن کی تنقید کی وہ روایت نہیں جس کی وہ طلبگار یا متقاضی رہی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ آج اردو میں کہانی / افسانہ بہ الفاظ دیگر فکشن کی تنقید برائے نام ہے۔ چونکہ ہمارے یہاں اعلیٰ فکشن کی تخلیق ہی نہیں ہورہی ہے تو پھر ہم اس فکشن کی تنقید کی بات ہی کیوں کریں جس کا وجود ہی مشتبہ ہو۔ پھر بھی ایک موہوم امید کے سہارے فن پارے پیش کیے جارہے ہیں۔ شاہکار شاید ہمارے مقدر میں نہیں۔ ہم آج جو کچھ بھی پیش کررہے ہیں وہ اصل فن پارہ ہی نہیں۔ پھر بھی اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ سبھی اپنی اپنی جگہ خوش ہیں کہ ہم نے ادب کا لال قلعہ فتح کرلیا۔ اب جب کہ اردو فکشن میں کوئی معرکتہ الآرا فن پارہ تخلیق نہیں ہو پارہا ہے تو پھر اس کی تنقید کا تاج محل کیوں کر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

جب اردو ناول کا یہ حال ہے تو اردو ناول کی تنقید کا فطری طور پر برا حال ہوگا ہی۔ نام تو گنائے جاتے ہیں لیکن وہ صرف نام ہی نام ہیں جو کسی کام کے نہیں۔ ایسے میں پروفیسر علی احمد فاطمی کا ایک مضمون ستمبر 2020 کے آجکل میں 'کچھ نئے ناولوں کے حوالے سے' پر نظر پڑی تو بڑی خوشی ہوئی کہ بہت دنوں بعد اس موضوع پر کچھ تفصیل سے کسی نے روشنی تو ڈالی ہے۔ ابھی اس مضمون کو پڑھنا ہی شروع کیا تھا کہ عبدالصمد صاحب نے مجھے روکا اور بتایا:

''پچھلے بیس برسوں میں اتنے ناول ضرور لکھے گئے کہ پچھلے پچاس برسوں میں ناول لکھے جانے کی جو دھیمی رفتار رہی ہے اس کمی کو پورا کرتے ہیں۔ اب بنیادی سوال یہ ہے کہ ان میں کوئی ناول بھی ایسا کیوں نہیں جو آنگن، خدا کی بستی، اداس نسلیں، ایک چادر میلی سی، آگ کا دریا، گئودان وغیرہ کے ہم پلہ ثابت ہوسکے۔'' (اردو ناول کے ساتھ دو چار قدم)

عبدالصمد کو پچھلے بیس برسوں میں ناولوں کی تعداد پر تو اطمینان ہوا لیکن یہ سارے ناول ماقبل کے ناولوں کے ہم پلہ نہیں۔ علی احمد فاطمی بھی اس پر حامی بھرتے ہیں اور خاکسار کا بھی یہی خیال ہے۔ ایسے میں اگر میں لب کھولوں کچھ بولوں تو مشرف عالم ذوقی اور ان کے ہم خیال حضرات کو فطری طور پر تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن نہیں، ذوقی بھی پچھلے دنوں اردو ناول کی گم ہوتی ہوئی دنیا پر گہری تشویش میں مبتلا نظر آئے۔ ہاں تو بات ہورہی تھی علی احمد فاطمی اور ان کے مضمون کی تو میں ان کی اکثر باتوں سے اتفاق کرتا ہوں کہ اردو میں فی زمانہ بڑا یا عظیم ناول تو کیا اوسط ناول بھی میسر نہیں۔ میں کوئی بہت زیادہ فلسفیانہ گفتگو نہیں کروں گا کہ فی الوقت ہمارا یہ موضوع اس کا متقاضی بھی نہیں البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اکیسویں صدی کے دو دہے بیت گئے اور ہم اب تک کچھ بھی نہیں کرسکے۔ کیا ہم اتنے تنگ دست اور خالی الذہن ہوچکے ہیں؟ اب آئیے اصل موضوع کی طرف۔ ہمارا اصل موضوع ہے پیغام آفاقی کا 'دوست'۔ میری مراد پیغام آفاقی کے تیسرے ناول 'دوست' سے ہے جو 2018 میں ہی منظر عام پر آچکا ہے۔ اب یہ میری کوتاہ نظری ہی ہے کہ ہماری نظر سے پورے دو سال یہ ناول اوجھل رہا۔ حالانکہ ایک سال پہلے ہی پیغام کے بارے میں اختصار کے ساتھ ایک سمینار میں اپنے صدارتی کلمات میں اظہار خیال کرچکا ہوں۔ اس وقت ناول 'دوست' شائع ہوچکا تھا، لیکن میں بے خبر تھا۔

پیغام کا نام آتے ہی مکان کی 'نیرا' نظروں کے سامنے آجاتی ہے جو ایک آہنی کردار بن کر ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے تمام سماجی نظام سے ٹکراتی ہے۔ اسی طرح مکان کا ذکر آتے ہی پیغام آفاقی کی یاد ستانے لگتی ہے۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مکان پیغام کا شناخت نامہ بن چکا ہے۔ 1989 میں مکان شائع ہوکر اردو ادب میں موضوع بحث بنا رہا۔ مکان پر گفتگو کا یہ سلسلہ خاصا دراز رہا۔ مجھے یاد ہے کہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کا جہلم ہاسٹل چھوڑ کر جب میں کرایہ کا مکان ڈھونڈ رہا تھا تو مذاقاً ہی سہی میرے یار دوست چھوٹتے ہی کہتے کہ پیغام آفاقی سے کیوں نہیں مل لیتے۔ مذاق میں کہا گیا یہ جملہ حقیقت پر دال ہے۔ آج بھی پیغام پر یا اردو فکشن پر کوئی گفتگو مکان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

اختر علی فاروقی نے اپنا قلمی نام پیغام آفاقی بہت سوچ سمجھ کر رکھا تھا۔ شاید پیغام کا خیال تھا کہ وہ جو کچھ بھی اپنی تحریر میں پیش کررہے ہیں اس پیغام کی حیثیت آفاقی ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے مکان پیش کرکے اپنے نام کی لاج رکھ لی۔ میرا خیال تھا کہ انھوں نے اردو کے ذخیرے میں دو ناول 'مکان' اور 'پلیتہ' جیسی تخلیقات کا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ افسانوی مجموعہ 'مافیا' اور شعری مجموعہ 'درندے' کے نام سے شائع ہوئے۔ لیکن میری یہ بات پیغام کی حیات تک تو صحیح تھی مگر ان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد یہ بات غلط ثابت ہوئی جب ان کے کمپیوٹر سے دو ناول اور برآمد ہوئے۔

پیغام آفاقی ان خوش نصیب فکشن نگاروں میں سے ہیں جو اپنے پہلے ہی ناول سے مشہور ہوئے اور جو شہرت انھیں مکان سے ملی وہ بعد کے ناولوں سے نہیں مل سکی، جو انھوں نے اپنی زندگی کے اہم کارنامے کے طور پر 'پلیتہ' کے نام سے تخلیق کی ہو یا اب 'دوست' کے نام سے بطور ناول سامنے آیا ہے۔

پیغام آفاقی کے تیسرے ناول 'دوست' کے بارے میں جب مجھے معلوم ہوا کہ عزیزم سلمان عبدالصمد اور محترمہ رضیہ سلطانہ کی کوششوں سے ان کا تیسرا ناول شائع ہوچکا ہے تو مجھے حیرت انگیز خوشی ہوئی بلکہ یہ معلوم کرکے مجھے یک گونہ مزید مسرت ہوئی کہ ان کا ایک اور ناول 'راگنی' کے نام سے منتظر اشاعت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیغام آفاقی صرف دو ناول 'مکان' اور 'پلیتہ' تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کے نام دو اور ناول ہیں جو ان کے کمپیوٹر سے ان کے انتقال کے بعد برآمد ہوئے۔ ہم آج پیغام کے ناول 'دوست' پر ایک نظر ڈالنا مناسب اور ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا چوتھا ناول 'راگنی' بھی نقاب کشائی کو تیار ہے۔

جہاں تک اردو میں ناول نگاری کی سمت و رفتار کا

سوال ہے تو جیسا کہ میں نے تمہیدی سطور میں کہا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نہایت سست اور دھیمی ہے۔ جدید اردو ناول اب بھی انگلیوں پر گنے جانے تک محدود ہیں۔ اس کے باوجود ہم اسے معشوق کی موہوم کمر ہرگز نہیں کہیں گے۔ جسے ڈھونڈنے میں شائقین کو کوئی پریشانی لاحق ہو۔ ان ناولوں میں پیغام کا ناول 'دوست' بھی شامل ہے۔

کسی بھی ناول پر نگاہ ڈالتے ہوئے دو تین باتوں کا خیال رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ماجرا سازی، پلاٹ نگاری اور مکالمے۔ کم از کم جب تک ان باتوں کا خیال نہیں رکھا جائے گا ایک کامیاب ناول نہیں لکھا جاسکتا۔ ان شرائط پر ان کا پہلا ناول 'مکان' بیشک بڑی حد تک کھرا اترتا ہے۔ دوسرا ناول 'پلیتہ' بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے کسی حد تک ٹھیک ٹھاک ہے مگر ان کے تیسرے ناول 'دوست' کو ہرگز ایک کامیاب ناول قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ان کے پہلے ناول 'مکان' میں کہانی کا راوی جو اپنا قلم تو ضرور چلاتا ہے لیکن خود کو یعنی اپنی ذات کو اس کہانی سے دور ہی رکھتا ہے۔ لیکن ناول 'دوست' میں پیغام نے خود کو ہی ناول کا ہیرو بنا کر پیش کیا ہے۔ ہیرو بھی ایسا ویسا نہیں بلکہ یہ ہیرو کسی رومیو، مجنوں اور فرہاد سے کم نہیں۔ قارئین معاف کریں گے کہ شاید میں بھٹک رہا ہوں۔ ٹھیک اس ناول نگار کی طرح جو اپنے ناول میں ہیرو کے طور پر پیش کرنے کی اپنی تمام جدوجہد آخر تک جاری رکھتا ہے۔ لیکن اس کی یہ کوشش رائیگاں جاتی ہے۔ اس کے باوجود اس راقم کو جذبات میں آکر بھٹکنے یا بہکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آیئے ناول پر ایک نظر پھر ڈالتے ہیں۔ اس ناول کی ضخامت 160 صفحات پر مشتمل ہے اور بظاہر اس کا پلاٹ یا کینوس بہت وسیع ہے لیکن کھودا پہاڑ، نکلی چوہیا۔ اس ناول کے شروع کے بیس پچیس صفحات اور اسی طرح آخری حصے کے بیس پچیس صفحات ہی اس ناول کی کہانی مکمل کرسکتے ہیں۔ ہم اس ناول کو پچاس پچپن صفحات میں بہ آسانی سمیٹ سکتے ہیں کیونکہ اس کہانی میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس کا تقاضا یا ڈیمانڈ ہی یہی ہے۔ باقی کے کم وبیش سو صفحات محض بھرتی کے ہیں۔ جو شاید اس ناول کے حجم اور ضخامت کو قابل لحاظ بنائے رکھنے کے لیے ضروری معلوم ہوتے ہیں اور تقریباً سو صفحات کا پیٹ بھرنے کے لیے ناول نگار نے فلسفہ، منطق اور جنسیات وغیرہ پر کچھ اسی قسم کے مواد پیش کیے ہیں، جن کا کوئی بہت زیادہ تعلق اس ناول سے نہیں معلوم ہوتا ہے۔ بعض ناول اپنی بے جا طوالت کے سبب اکثر لوگوں کے ذوق مطالعہ کو راس نہیں آتے اور بسا اوقات تو ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی فلسفیانہ اور سنجیدہ ناول کو پڑھ پانا اور دو قدم بھی آگے بڑھ پانا مشکل ہوجاتا ہے تو یہ خاکسار ابن صفی کے کسی پرانے ناول کو پڑھنا شروع کردیتا ہے تاکہ ذوق مطالعہ کی تشنگی کچھ تو کم ہو۔ عام قاری تو اس مقام پر اس فلسفے، منطق اور جنسیات پر کچھ سمجھنے سمجھانے کے لائق نہیں رہ جاتا، وہ ہاں کان ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس ناول سے ایک طویل اقتباس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

''اس لیے جب وہ اپنے حقوق کی بات کرنا چاہتا ہے تو اسے کہیں سے بھی سند نہیں ملتی حتی کہ وہ اپنے کو گناہ گار محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کا ایسا محسوس کرنا اس کی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اسے سمجھنا چاہئے کہ حقوق کی حفاظت اور طرفداری کرنے والے سارے معاشرتی اور مذہبی قوانین انھیں مقامات پر آئے ہیں جہاں انسان کی فطرت کے مدنظر حق تلفی کا خطرہ تھا، جیسے ماں باپ، شوہر، بیوی، پڑوسی یا یتیموں کے حقوق، لیکن جہاں ایسا خطرہ نہیں تھا، وہاں اس ضمن میں کوئی قانون دکھائی نہیں دے گا جیسے اولاد کے حقوق کے بارے میں خال خال ہی دکھائی دے گا اور جہاں دکھائی بھی دے گا وہ ان کی پرورش سے متعلق نہیں بلکہ ان کی تربیت سے متعلق ہوگا۔ کیونکہ یہ ذی روح کی خصلت ہے کہ وہ اپنی اولاد کا دھیان رکھتا ہے۔ اس سے آگے اپنے اوپر اپنے حقوق کا کہیں کوئی ذکر اس لیے نہیں ہے کہ انسان اپنے حقوق کا خود ہی خیال رکھے گا لیکن جیسا کہ میں نے ذکر کیا کہ معاشرے نے انسان کے ذاتی حقوق تلف کرکے اسے معاشرے کے سپرد کرنے کی کوشش کی۔''

ناول میں اس طویل بیان کی بہت کم ہی گنجائش ہوتی ہے اسے چھوٹے چھوٹے ڈائیلاگ یا مکالمے کے ذریعے دور کرنا چاہیے۔ میں اس پر صرف ایک شعر کا اور اضافہ کرنے کی جسارت کروں گا:

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

اس کے مقابلے جب پیغام چھوٹے چھوٹے مکالمے، جملے یا ڈائیلاگ لکھتے ہیں تو تخلیقیت کا وفور نظر آتا ہے۔ مثال کے لیے چند ایک مکالمے دیکھیں:

''میں آپ کو حاصل کرنا چاہتی ہوں لیکن دنیا اور معاشرہ کے پیدا کردہ ان تمام ثانوی احساسات کو مسمار کرنے کے بعد جن کو عورت اور مرد کے اوپر معاشرہ نے اپنی طرف سے تھوپا ہے۔''

''......لیکن میرا اور آپ کا رشتہ معاشرہ سے باہر ہے اور یہ صرف میرے اور آپ کے بیچ کا رشتہ ہے۔ مرد بحیثیت انسان اور عورت بحیثیت انسان اور اس حیثیت سے مجھے آپ کے کسی حد تک قریب آنے اور اس سے آگے جنسی رشتہ قائم کرنے میں کسی طرح کا احساس گناہ حائل نہیں۔''

''دنیا میں غلامی جبر کی اذیت سے نہیں بلکہ جبر کی قبولیت سے قائم ہوتی ہے۔ غلام روحوں کی غلامی کے نظام سے اور اس کے زخموں سے پھولوں کی مہک آتی محسوس ہوتی ہے اور ان کی روح کی یہی کیفیت انھیں غلام بنائے رکھتی ہے۔ اس زمانے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانے میں کسی کو بھی غلامی پسند نہیں۔''

اس طرح کے چھوٹے چھوٹے اور چست درست جملے کسی آبدار موتی کی طرح اس ناول کے بعض حصوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ خیر! اس ناول کی کہانی کچھ اس طرح ہے۔ لکھنؤ کے کسی گاؤں سے ایک مطلقہ لڑکی اپنے شوہر سے جان بچا کر دلی آجاتی ہے اور جے این یو میں ایم فل اردو میں داخلہ لے لیتی ہے۔ جہاں کا آزاد ماحول اسے خوب راس آتا ہے۔ یہاں اسے ایک ڈھونڈو ہزار تو نہیں لیکن تین چار دل پھینک عاشق مل ہی جاتے ہیں، ان میں سے دو پروہ باضابطہ چھان پھٹک کا کام شروع کردیتی ہے اور جب ان پر اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملتی تو وہ ایک تیسرے شخص سے جو مذہباً ہندو ہے اس سے کورٹ میرج کرکے اس کے ساتھ امریکہ چلی جاتی ہے لیکن وہاں بھی اس کے دماغ میں ایک پھانس سی لگی رہتی ہے جو اسے اکثر وبیشتر چبھتی رہتی ہے، لیکن امریکہ سے جب وہ ایک سال بعد ہندوستان لوٹتی ہے تو وہ چیزے دیگر نظر آتی ہے۔ وہ ایک مہذب مشرقی خاتون نظر آتی ہے۔ حقیقی زندگی میں اصل نینا ایسی ہی تھی اور شاید ایسی ہی رہے۔ لیکن اپنی کہانی کی چمک برقرار رکھنے کے لیے ناول نگار جو اپنے اس ناول کا ہیرو بھی ہے اسے اپنی ہیروئن کی آزاد خیالی میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی ہے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ نینا بہرحال ایک مکمل خاتون مشرق ہوچکی ہے۔

ناول 'دوست' کے کردار میں نینا، ہاشم، کمال رحمانی اور سرین شامل ہیں۔ باقی چھوٹے موٹے کردار محض بھرتی کے ہیں۔ وہ بس 'جھلک دکھلا جا' تک موجود ہیں۔

یہ پیغام کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ خوبی یوں کہ کبھی کبھی کسی کہانی / ناول میں کم کردار ہونے کے سبب قلمکار اپنی بات کہہ پانے میں دقت محسوس کرتا ہے ٹھیک اس کے برعکس کسی فن پارے میں کرداروں کے زیادہ ہونے کے سبب سب کو ایڈجسٹ کرپانا مشکل ہوتا ہے۔ ایک ناول نگار کو ہمیشہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے ورنہ اسے کسی بازار خاص طور پر مچھلی بازار کی بھیڑ اور بدبو سے اپنی نگارشات کو بچانا مشکل ہوتا ہے۔ پیغام آفاقی اس عیب سے پاک صاف نظر آتے ہیں۔

■

Dr. Abrar Rahmani
Tazyeen Apts. 179/22, Zakir Nagar
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025
Mob.:9911455508

کرناٹک کی نسائی شاعری

قمر النسا

دنیا کے مختلف ممالک میں حقوق نسواں اور ان کی بہتری کے لیے ہر عہد، ہر دور، ہر زمانہ میں جدوجہد جاری رہی۔ ہمارا معاشرہ مرد اساس معاشرہ ہے۔ اس کے باوجود آج عالمی سطح پر حقوق نسواں پر زور دیا جارہا ہے۔ صنف نازک کے تشخص اور شناخت کے لیے دردمند دل رکھنے والے اہل علم نے اپنی نگارشات سے لوگوں میں شعور بیدار کررہے ہیں اور پھر خود عورت نے بھی اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائی اور پورے عالم میں نسائی یا تانیثی تحریک کی گونج سنائی دینے لگی مگر مرد حضرات کے مقابلے میں خواتین قلم کاروں کی کمی ہمیشہ سے رہی ہے۔

خواتین فطری صلاحیتوں اور تخلیقی شعور کے باوجود گھریلو ذمہ داریوں اور مجبوریوں کے باعث اس دوڑ میں شامل نہیں ہو پائیں پھر بھی بعض ایسی خواتین ہیں جنھوں نے ادب میں نمایاں مقام اور انفرادی پہچان بنائی۔ بر صغیر کے ادب کا بہ نظر غور مطالعہ کیا جائے تو ان خواتین کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ جن کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔

کرناٹک کی اہم اور نمائندہ شاعرات میں اختر بیگم، پروفیسر محمودہ خانم شبنم، میمونہ تسنیم، زبیدہ نسرین، مہہ جبین نجم، تاج النساء تاج، فاطمہ رداٹمکوری، حسنی سرور، ڈاکٹر صغری عالم، ریحانہ بیگم ریحانہ، ڈاکٹر فاطمہ زہرہ، نیلوفر نایاب، شہنواز بانو شاہین، انیس فرخندہ، زینت کوثر، پروفیسر وحیدہ النسا، رخسانہ جبین لاہوری، فریدہ رحمت اللہ، شائستہ یوسف، ثمینہ تاج، ثناء ارم، شہنواز بانو شاہین، زلیخا روحی، اختر جہاں اختر، شبانہ پروین شبنم، نیلوفر نایاب، نور فاطمہ انصاری اور نسیم خانم صبا وغیرہ شامل ہیں۔

سیدہ اختر بیگم: شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے دو شعری مجموعے 'صحیفۂ درخشاں' اور 'اختر واقبال' زیور طباعت سے آراستہ ہوئے اور یہ مجموعے کلام بنگلور کی مشہور اردو لائبریری مسلم لائبریری میں دستیاب ہیں علامہ اقبال کے کلام سے متاثر تھیں جس کا نمونہ 'اختر واقبال' ہے جس میں اقبال کے اشعار کی تضمین کی ہے۔

پروفیسر محمودہ خانم: پروفیسر محمودہ خانم نے میسور یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ مہارانی کالج میں بحیثیت صدر شعبۂ اردو کے درس وتدریس میں منہمک رہیں اوائل عمری سے ہی شاعری کا ذوق تھا۔ ان کا کلام ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہوتا رہا شاعری سے اسی دلچسپی اور ذوق نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ نمونہ کلام۔

کشمکش دل میں خیالوں میں عجب بے چینی
درد پیہم ہے یہ دنیا مجھے معلوم نہیں
کیوں شب تار گراں بار ہوئی جاتی ہے
کیوں سلگتے ہیں یہ لمحے مجھے معلوم نہیں

میمونہ تسنیم: ریاست کرناٹک کے ضلع ہاسن سے تعلق رکھتی ہیں انھوں نے نثر اور شاعری دونوں میں اپنی پہچان بنائی میمونہ تسنیم کا ادبی سفر پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوا۔ 1938 میں پہلی نظم لکھی۔ ان کی شاعری میں انسانیت کا رنگ جھلکتا ہے نظموں اور غزلوں دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔

قدم قدم پہ جو مجبوریوں کا عالم ہے
وہ اختیار کے سانچے میں ڈھل بھی سکتا ہے
جو آنکھوں سے چھلکے وہ ہے ایک آنسو
جو رک جائے پلکوں پہ وہ اک گہر ہے

غزلوں میں روایتی موضوعات کے بجائے اپنے تجربات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ غم جاناں کو غم دوراں بنا کر پیش کیا ہے۔ غزلوں کے علاوہ نظموں میں عورت، دعوت جہاد، سلطان شہید قابل تعریف ہیں۔ نظم 'عورت' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

خواب الفت کی مسرت آفریں تعبیر تو
قصر ہستی کی سعادت آفریں تعمیر تو
کائنات الفت معصوم کی تو پاسباں
چارہ ساز درد وغم ایثار کی تصویر تو
مکتب انساں تری آغوش عقل ہوش ہے
ہے حدیث زندگی کی دل نشیں تفسیر تو

زبیدہ نسرین: زبیدہ نسرین کو ادبی ذوق گھر کے ماحول اور بڑی بہن میمونہ تسنیم نے سے ملا انھوں نے جہاں نثر وشاعری میں اپنی منفرد شناخت بنائی تو ان کی ہمشیرہ عزیز باذوق شاعرہ کہلائیں۔ شعر وادب کی دلچسپی نے ان کی صلاحیتوں کو مزید پروان چڑھایا اور ان کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مایوسیوں نے ان کے دل کو گھیر رکھا ہے۔ نمونہ کلام۔

ویران دل میں شمع فروزاں کیجیے
پوشیدہ غم کو اور نمایاں کیجیے
پھر چھیڑ کر فسانۂ صد پارہ جگر
تاریکی حیات کو لرزاں نہ کیجیے

مہہ جبین نجم: کرناٹک کے ضلع میسور کی متوطن ہیں پروین شاکر سے از حد متاثر تھیں۔ ان ہی کے طرز پر شاعری کی۔ دھیمے اور مدھم لب ولہجہ میں قاری کو اپنی جانب ملتفت کرتی ہیں۔ ان کے اشعار میں نسائیت کے رنگ کے ساتھ صداقت، نزاکت اور حسن بیان بھی موجود ہے سلاست بھی ہے سادگی بھی، اجتماعی فکر بھی ہے اور انفرادی خیال بھی، یادیں بھی ہیں مستقبل کی خواہشیں بھی، عصری مسائل بھی ہیں اور کلاسیکی انداز بھی۔

مہہ جبین نجم نے ادب اطفال کے لیے بھی لکھا۔ ان کی نظموں کا مجموعہ 'آؤ گائیں خوشی منائیں' کے نام سے شائع

ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام۔

اے نجم ہم نے اسے دل میں کرلیا محفوظ
جو درد اس نے ہمیں مسکرا کے بخشا تھا

تاج النساء تاج: بنگلور کی نامور شاعرہ اور فکشن نگار ہیں۔ نامساعد حالات اور مالی پریشانیوں میں بچپن گزارنے کے بعد ہمت اور حوصلے سے آگے بڑھتی رہیں اور تعلیمی مراحل طے کیے اور پھر بحیثیت معلمہ خدمات انجام دیں۔ ترقی کرتے ہوئے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئیں۔ مالی مشکلات، کسمپرسی اور تکلیفوں کا احساس ان کے دل میں بس گیا تھا جس کا گہرا اثر شاعری اور فکشن میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ 'جذبات ونغمات' ہے۔ انھوں نے غم ذات کو غم حیات اور غم حیات کو غم ذات بنادیا ہے۔ ان کی شاعری میں زمانے کی تلخیاں اپنا جلوہ بکھیرتی ہیں ان کا لہجہ بھی کچھ اسی سے مناسبت رکھتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے۔

اے تاج دل دھڑکتا ہے آنکھیں ہیں اشک بار
کیوں زندگی نے لوٹ لیا سوچتے ہیں
دل ازل ہی سے ستم دیدہ ہے تاج مرا
خلد مل جائے تو مسرور نہ ہونے پائے
زندگی اب ترا انعام کہاں سے لاؤں
ان کے ہونٹوں پہ مرا نام کہاں سے لاؤں

فاطمہ روا شمکوری: فاطمہ روا شمکوری کی سوچ منفرد ہے 1964 میں شاعری کی طرف راغب ہوئیں ابتداء میں والد سے پھر راقم قریشی سے اصلاح لیتی رہیں۔ ان کا پیرایۂ بیان ان کی گہری سوچ کا غماز اور انفرادیت کا ترجمان ہے۔ غزل کی روایت کو حسن وخوبی کے ساتھ برتا ہے ان کی غزلیں تانیثی یا نسائی احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ انھوں نے غزل، مرثیہ، نظم اور قطعات میں طبع آزمائی کی مگر بحیثیت غزل گو اپنی پہچان بنائی۔ انھوں نے زندگی کو قریب سے دیکھا سوچا سمجھا اور برتا ہے۔ رومانی اور حسن وعشق کے موضوعات پر بھی اشعار کہے ہیں۔ ان کے اشعار میں شگفتگی وتازگی اور ندرت کے ساتھ ساتھ سلاست اور روانی بھی ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

بغور دیکھیے پہچانیے ذرا مجھ کو
دیار فکر میں تفسیر کائنات ہوں میں
اب اور کس پر بھروسہ کریں جہاں میں روا
لگادی آگ نگہباں نے آشیانے کو
شام حسرت صبح افسردہ شبستان فراق
تجھ کو کیا کیا اے غم عشق مہیا کرنا

حسنی سرور: حسنی سرور کا اصل نام حسن آرا ہے۔ بہت کم عمری میں اپنی پہلی نظم اپنے دادا کی وفات پر لکھی۔ اس وقت وہ صرف تیسری جماعت میں تھیں اور شاعری کے فنی رموز سے بالکل ناآشنا تھیں اس کے بعد وہ ایسے ہی ڈائری میں لکھتی رہیں۔ نو سال کی عمر میں سب سے پہلی تخلیق نعت لکھی جو رسالہ 'سویرا' میں چھپی۔ نثر وشاعری دونوں میں طبع آزمائی کی۔ زندگی میں درپیش حالات وحوادث اور مشاہدات وتجربات ہی ان کی شاعری ہے۔ سیاسی شعور کے ساتھ ملک کے سیاسی معاشرتی اور مذہبی مسائل کا بھی انھیں درک ہے۔ مشاہدہ تیز ہے نظر میں گہرائی اور کہیں کہیں فکری عنصر کی کارفرمائی بھی ملتی ہے۔ 4 شعری مجموعے خواب زار (1968)، ایک چاند چمکتا ہے (1976)، شبنم شبنم (1986)، غزلوں کی چاندنی (2003) اور ساون برسے (گیت 2000) شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے کلام میں تنوع اور جدت ہے ان کی شاعری مقبول ہیئتوں میں قدیم روایات اور جدید لفظیات سے مزین ہے اپنے جذبات واحساسات کو قلم سے قرطاس پر اس طرح بکھیرتی ہیں کہ وہ دل میں اتر جاتے ہیں ان کی شاعری کے متعلق خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''جب سے اردو ادب میں آزاد غزل اور آزاد نظم و نثر کا رواج ہوا ہے میں نے شاعری کے مجموعے پڑھنا چھوڑ دیے ہیں اور دل عجیب قسم کی مایوسی کا شکار ہے۔ لیکن میسور کے قیام میں حبیب مکرم پروفیسر عبدالقادر کے دولت کدہ پر عزیزہ حسنی سرور کا کلام سنا اور پھر تنہائی میں پڑھا بہت ہی جی خوش ہوا اور وہ مایوسی کی کیفیت جاتی رہی ان کی شاعری میں جمالیاتی وجدان، ادائے حسن کی معصومیت اور میٹھا میٹھا درد ہے۔ عاشقی اور ہنرمندی کے تجوگ نے بعض اشعار کو غالب کا تیر نیم کش بنادیا ہے۔ ان کا صدف جس گوہر کو تیار کر رہا ہے اس کی درخشانی میں شبہ نہیں۔

(یادرفتگاں: حسنی سرور حیات اور فن ص 22)

میرے سینے میں یہ زخموں کے نشاں کیسے ہیں
داغ دل داغ جگر شعلہ فشاں کیسے ہیں
ایک تنہائی ہے ویرانی ہے اور عالم ہو
خاک اڑاتی ہے یہاں اجڑے مکاں کیسے ہیں

ڈاکٹر صغری عالم: کرناٹک کی خواتین شاعرات میں صغری عالم کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ پیشۂ تدریس سے وابستہ تھیں بحیثیت شاعرہ اور نثر نگار خدمات انجام دیں۔ 1975 میں نعت گوئی سے شاعری کی سرزمین میں قدم رکھا۔ غزلوں، نظموں کے ساتھ ساتھ رباعی، قطعہ، حمد اور نعت میں بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا۔ ان کی 11 کتابیں منصۂ شہود پر آکر داد وتحسین حاصل کر چکی ہیں۔

حیطۂ صدف 1990، بیت الحروف 1995، صف ریحاں 1997، محراب دعا (حمدیہ ونعتیہ کلام) 1999، قوس قزح 2004، حنائے غزل 2005، نشاط معنی 2007 اور نثری تصانیف میں کف میزاں (تبصروں کا مجموعہ) 2004، ابرنیساں 2004 وغیرہ ہیں۔

ان کے کلام میں جہاں عشق ومحبت کا روایتی رنگ ہے وہیں عصر حاضر کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ تخیل کی کارفرمائی بھی ہے اور حقیقت کی آمیزش بھی، قلبی واردات بھی ہے مختلف واقعات اور تجربات کا بیان بھی۔ اعلیٰ شعری روایتوں، تہذیبی قدروں اور فن کے احترام نے ان کی شاعری کو منفرد رنگ عطا کیا ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں موضوعات اور اسلوب ولہجہ میں ندرت رکھتی ہیں الفاظ کے انتخاب واستعمال میں انھیں کمال حاصل ہے جس میں معنوی تہہ داری اور گہرائی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔

خوشی بھی نبھائی غموں کو خوش بھی کیا
ہزار رنگ لٹا کر یہ زندگی کی ہے
ہمارے درد نے معنوں سے لذتیں لے کر
ہر ایک لفظ کے پہلو میں شاعری کی ہے

ریحانہ بیگم ریحانہ: ضلع بیدر سے تعلق رکھنے والی ریحانہ بیگم پیشے سے استاد اور منفرد شاعرہ ہیں۔ غزل سے ادبی سفر کی شروعات کی صلاح الدین نیر سے اصلاح لیتی رہیں۔ چار شعری مجموعے پہلی کرن (2001)، آنگن آنگن پھول (2000)، دامن دامن میری خوشبو (2005) اور 'آندھیوں میں چراغ جلتے ہیں' (2012) شائع ہو چکے ہیں ان کے علاوہ ان کے مضامین کا مجموعہ 'زمین سرخ اجالوں

میں رہی ہے' چھپ چکا ہے۔

ذاتی احساسات اور کائناتی مشاہدات کا امتزاج ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ اپنی شاعری کو نکھارنے سنوارنے اور خوب سے خوب تر بنا کر پیش کرنے کے لیے وہ تشبیہات واستعارات سے کام لیتی ہیں۔ ان کے اشعار سادہ سلیس اور احساس کی شدت سے لبریز ہیں۔ صرف عشق ومحبت کی کارفرمائی ہی نہیں زندگی کے مختلف تجربات، محسوسات اور نظریات کی جلوہ نمائی بھی ان کی غزلوں میں ہوتی ہے۔

عجیب شخص ہے ہم اس کی بے وفائی پر
یقین کر نہ سکے رکھ رکھاؤ ایسا تھا
میں نے گھر اپنا سلیقے سے سجایا ہے مگر
اس کا سہرا تو کسی اور کے سر جاتا ہے

ڈاکٹر فاطمہ زہرا: ڈاکٹر فاطمہ زہرا درس وتدریس کے پیشے سے منسلک رہیں اور شعر وادب میں بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ فکر کی گہرائی اور پیرایۂ بیان کی ترنم ریزی نے ان کی شاعری کو پر بہار بنا دیا ہے۔ فاطمہ زہرا کے پاس کلاسیکی اور جدید رجحان کی آمیزش خوب ہے۔ سادہ زبان میں عام فہم اور سہل طریقۂ اظہار سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ غالب ان کے پسندیدہ شاعر رہے ہیں اور انھوں نے ان ہی کی زمین میں غزلیں کہی ہیں۔ مطالعہ عمیق اور طرزِ ادا استدلالی ہے نثری مجموعے کے ساتھ ساتھ شعری مجموعہ 'خواب وخیال' شائع ہو چکے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ہے عشق اک خطا تو خطا ہی سہی مگر
ایک بار یہ حسین خطا کر کے دیکھیے
داستاں میری تو ساری آنسوؤں میں بہہ گئی
اب سوا تیرے پڑھے دھندلی سی یہ تحریر کون

پروفیسر وحید النسا: پروفیسر وحید النساء بیک وقت شاعرہ ونقاد بھی ہیں انھوں نے صنف غزل میں اپنی صلاحیتیں دکھائی ہیں اور ان کی غزلیں کلاسیکی روایات کی پاسدار ہیں۔ تنقیدی مضامین بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ نمونۂ کلام۔

داستان من و تو پہلے کبھی ایسی نہ تھی
آرزو اور جستجو پہلے کبھی ایسی نہ تھی
ساقی و مینا مے جام و سبو کیف وسرور
محفل مے کی یہ خو پہلے کبھی ایسی نہ تھی
کون جانے کہ جستجو کیا ہے
دل ناداں کی آرزو کیا ہے

رخسانہ جبین لاہوری: رخسانہ جبین ممبئی سے اپنی وابستگی کے باوجود کرناٹک کی ہیں۔ آپ کی پہلی ادبی کاوش 1991 میں سالار بنگلور سے شائع ہوئی۔ ان کی شاعری احساسات وجذبات کی حسین مورت ہے۔ تانیثیت کی تحریک سے متاثر ہیں۔ ان کے کلام میں نسائیت کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ زندگی کی تمام رعنائیاں ودلکشیاں اور غم والم کے تمام تذکرے موجود ہیں۔ زندگی کی تلخ سچائیوں پر سے نقاب اٹھانے کی عمدہ کاوشیں ان کے شعروں میں ملتی ہیں۔ اور عورت کی زندگی کے ہر پہلو، ہر گوشے کو باہر لانے کی سعی کرتی نظر آتی ہیں۔ تراکیب اور نئے الفاظ کا استعمال برمحل کرتی ہیں ان تمام خصوصیات کا مجموعہ شعری صورت میں 'رشتوں کی چھاؤں' کے روپ میں موجود ہے۔ نمونۂ کلام۔

اس کی شرافتوں کو میں سجدہ کروں جبین
اپنا لے جو مجھ کو میری آوارگی کے ساتھ
اس سے پہلے جی رہے تھے پر کہاں تیور یہ تھے
آہ سے جب ہم ملے تو زندگی اچھی لگی

فریدہ رحمت اللہ: فریدہ رحمت اللہ کرناٹک کی خواتین فکشن نگاروں میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔ آپ کا ایک ناول اور چند افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ غزلیں اور نظمیں دونوں لکھتی ہیں اور ان کا دائرہ صرف حسن وعشق تک محدود نہیں بلکہ وہ مختلف النوع مشاہدات، محسوسات اور تجربات زندگی کی عکاس وترجمان ہیں۔ انھوں نے نئے موضوعات اور نئے لہجے کو بھی اختیار کیا۔ روانی کے سبب ان کے اشعار قاری کے ذہن پر دیرپا اثر چھوڑتے ہیں ان کے موضوعات وہی ہیں جو اوروں کے ہیں لیکن ان کے لہجے کا اچھوتا پن دلکش ہے۔ دیکھیے وہ اپنی بات کس انداز سے کہتی ہیں۔

صدیوں کے ستائے ہوئے انسان ہوئے ہم
ہر ظلم کی تکمیل کا سامان ہوئے ہم
بس بس کے چمن جس کا کئی بار لٹا ہے
اس وادی پر خار کے مہمان ہوئے ہم

شھوناز بانو شاہین: شھوناز بانو شاہین نے معلّمہ کی خدمات انجام دیں۔ شاعری میں اپنے والد اور رفیق حیات سے اصلاح لیتی رہیں۔ ان کے کلام میں حسن وبیان کی بے ساختہ روانی، احساس کی شدت اور جذبوں کی گہرائی وگیرائی ملتی ہے ان کی شاعری رواں اور مترنم ہے اور بے تکلفی کی فضا بھی قائم ہے۔

تم خلاصی کیا خاک ڈھونڈو گے
دل بھی اک کائنات ہوتا ہے
فکر ورنج والم نہیں شاہیں
درد راہ نجات ہوتا ہے

انیس فرخندہ: انیس فرخندہ کو ابتدا ہی سے ادبی فضا ملی جو ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں اہم ثابت ہوئی بہت ہی کم عمری میں انتقال کر گئیں۔ غزل سے ان کو خصوصی دلچسپی تھی آپ کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ آپ کے قلم سے عمدہ کلام تخلیق پاتا۔

موہوم سی امید بھی دم توڑ رہی ہے
تو ڈوبتی نیا کو بچانے کے لیے آ
عنوان غم زیست ہے یہ حرف تمنا
دلکش تو اسے اور بنانے کے لیے آ

شائستہ یوسف: شائستہ یوسف کی نظمیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں ان کی جاگتی عصری حسیت اپنی شناخت رکھتی ہے۔ انھوں نے جدید رجحانات سے خود کو وابستہ ضرور رکھا ہے لیکن اعلیٰ شعری اقدار، تہذیبی قدروں اور فن کے احترام نے ان کی شاعری کو الگ رنگ دیا ہے۔ جن شاعرات نے عورت کے حقوق منوانے کی بات کی ہے۔ ان میں ایک اہم نام شائستہ یوسف کا بھی ہے۔ ان کے لہجے میں سہم ناکی کے بجائے بے خوفی ہے۔ انھوں نے پوری قوت کے ساتھ اپنے لحن کو پرواز عطا کی ہے۔ وہ صرف شاعرہ ہی نہیں ایک ادیبہ بھی ہیں۔ محفل نسا جو ایک بڑی تنظیم بن کے ابھر رہی ہے شائستہ یوسف اس کی صدر بھی ہیں اور حقوق نسواں کی علم بردار بھی ہیں۔ ان کا شعری ڈکشن منفرد ہے وہ عموماً اپنی نظموں کا آغاز ایسے کرتی ہیں۔

جیسے وہ کوئی کہانی یا واقعہ سنانے جارہی ہوں ان کے یہاں نسائی جذبات کی ترجمانی خاطر خواہ ملتی ہے۔ محاکاتی انداز ان کی نظموں کا وصف خاص ہے جس کے لیے وہ کبھی علامت نگاری سے کام لیتی ہیں اور کبھی پیکر تراشی سے۔

الفاظ تیرتے ہیں/ ریت میں آگ لگ گئی
آنکھیں ابلنے لگیں/ رات سوجاتی ہے
خیال گیت گاتا ہے

اور ان الفاظ کے سنگم سے وہ نظم تعمیر کرتی ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے 'گل خودرو' اور 'سونی پرچھائیاں' شائع ہو چکے ہیں۔ اور ایک شعری مجموعہ زیر طبع ہے اس کے علاوہ نثر میں بھی آپ کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

تو میرے دل کے دھڑکنے کی صدا لگتا ہے
روز ملتی ہوں مگر روز نیا لگتا ہے
چولہے کی آگ میں مری غزلیں ہی جل گئیں
سارے خیال دھوپ کی چادر میں اٹ گئے
دودھ بہہ جائے ابل کر کبھی برتن ٹوٹیں
اور کب تک ترے بارے میں مسلسل سوچیں

نیلوفر نایاب: سیدہ نیلوفر نایاب عاقل شاہی نام اور نایاب تخلص ہے ان کی شاعری حمد، نعت دینی موضوعات اور اصلاحی نظموں پر مشتمل ہے۔ ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ گلدستہ نایاب ہے ان کی نعت کی خوبی یہ ہے کہ محمدؐ کی جلوہ سامانیاں موجود ہیں۔ اس میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اور ان کی کئی نظمیں ذات وصفات الٰہی کو بیان کرتی ہیں اور ذات کبریا کی حمد وثنا ان کے اشعار میں جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ ان کے اشعار رب العالمین کے جلال و جمال اور کمال کا آئینہ ہیں اس کے علاوہ ان کے کلام میں بہت ساری اصلاحی نظمیں بھی ملتی ہیں جو ملت اسلامیہ کو ایک درس و پیغام دیتی ہیں۔ جیسے اسلام اور عورت، نالۂ دل، والدین اور اساتذہ سے خطاب، مسلم لڑکیوں کا ترانہ وغیرہ۔ یہ سب معاشرے کی بہتری اور اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری ہیں۔

ہو کیوں کر بیاں مجھ سے نعت محمد
ہے بے مثل دنیا میں ذات محمد
نظر کرم نایاب پہ کیجیے کاسہ اس کا بھی بھر دیجیے
آخر آپ ہیں کون؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

زینت کوثر: زینت کوثر بیجاپور کی شاعرہ ہیں انھوں نے سیدھی سادی شاعری کی ہے جہاں اخلاقی اقدار بھی ہیں اور عشق ومحبت کا فسانہ بھی۔

کیسے کہوں مجھ کو محبت میں کیا ملا
چاہا تھا جس کو میں نے تصور میں آملا
گہرائیوں میں دل کی چھپا رکھا تھا جسے
مدت کے بعد مجھ کو وہی مدعا ملا

چند شاعرات کا نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے۔

ثمینہ تاج:

زیر پتھر ہیں جو کیڑے تری کرتے ہیں ثنا
رزق کے ڈھیر اندھیروں میں لگاتا تو ہے

ثنا ارم:

سکون دل کہاں رہتا ہے باقی
عجب ہے رنگ رسم عاشقی کا

شہواز بانو شاہین۔

چارہ ساز حیات ہوتا ہے
غم ترا التفات ہوتا ہے

زلیخا روحی۔

تقدیر کے ہاتھوں میں انسان کھلونا ہے
لمحوں کی خوشی پا کر پہروں یہاں روتا ہے

اختر جہاں اختر۔

ستانا عشق کو منظور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
جلانا دل یہاں دستور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

شبانہ پروین شبانہ۔

تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا
میں ہوں اک لہر تم رواں دریا

ثریا جاں نشاط۔

نماز عشق پڑھی ہم نے جس کے دامن پر
پھر اس بہار چمن کا کہیں پتہ نہ چلا

نور فاطمہ انصاری: نور فاطمہ انصاری نئی شاعرہ کے طور پر سامنے آرہی ہیں ان کی شعری تخلیقات اخبار و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں مگر قابل دید بات یہ ہے کہ ان کا شعری مجموعہ "نور سحر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نثر میں بھی طبع آزمائی کر رہی ہیں اور تبصروں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے نور فاطمہ انصاری اردو کی جواں فکر شاعرہ ہیں ان کا لہجہ نیا ہے۔ وہ اپنی فکر واحساس کو اپنی شاعری میں پیش کرتی ہیں۔

رات میں جب امید سحر دیکھیے
دعاؤں کا میری اثر دیکھیے
حوصلے سے تو کر بسر سائیں
زندگانی کا یہ سفر سائیں

نسیم صبا: نسیم صبا کرناٹک کی ابھرتی ہوئی شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری اصلاحی ہے وہ اپنی شاعری کے ذریعے نئی نسل کو ایک پیغام دیتی دکھائی دیتی ہیں اور عزم وحوصلے کی بات کرتی ہیں۔ کہیں کہیں انداز طنزیہ ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کا مقصد نوجوان طبقے کے ذہنوں کو بیدار کرنا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری سے انھیں گہرا لگاؤ ہے۔

انقلاب تو کسی بھی طور لانا ہے تمھیں
بن کے سورج علم کا اب جگمگانا ہے تمھیں
جو ہے مشکل کام وہ اب کر دکھانا ہے تمھیں
ابر کی صورت زمانے بھر پہ چھانا ہے تمھیں

کسی بھی دھرم میں ملتا نہیں پیغام نفرت کا
مچا مت نام پر مذہب کے تو کہرام رہنے دے

ان کے علاوہ اور بھی کئی شاعرات ہیں، یہاں میری دانست اور مطالعے میں جو جو شاعرات آئی ہیں صرف ان کا ذکر کیا ہے اور بعض کا صرف کلام دستیاب ہوا ان کو شامل مضمون کیا ہے۔ بہر حال کرناٹک کی شاعرات نے سماج میں اپنا مقام بنایا ہے۔ اس مضمون میں جتنے نام آئے ہیں وہ سبھی اپنی فنی بصیرتوں کے اعتبار سے ناقابل فراموش ہیں اور ان کا عصری شعور نہ صرف بالیدہ ہے بلکہ ان کا پیرایۂ اظہار بھی قابل توجہ اور اثر انگیز ہے۔ میں اس مصرعے کے ساتھ اس مضمون کو ختم کرتی ہوں۔

رونقیں جتنی یہاں ہیں عورتوں کے دم سے ہیں

■

QAMERUNNISA (RAMISHA QAMER)
P.hd Research Scholar
Dept of urdu and persian, Gulbarga University
Kalaburagi - 585106 (Karnataka)
Mob.: 7259673569

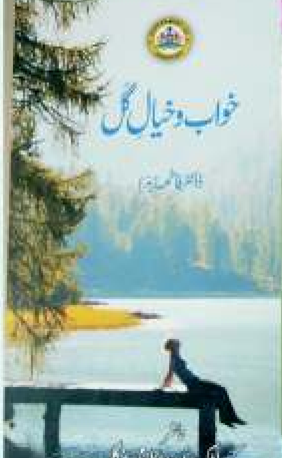

پروفیسر عزیز اللہ شیرانی سے گفتگو

غلام نبی کمار

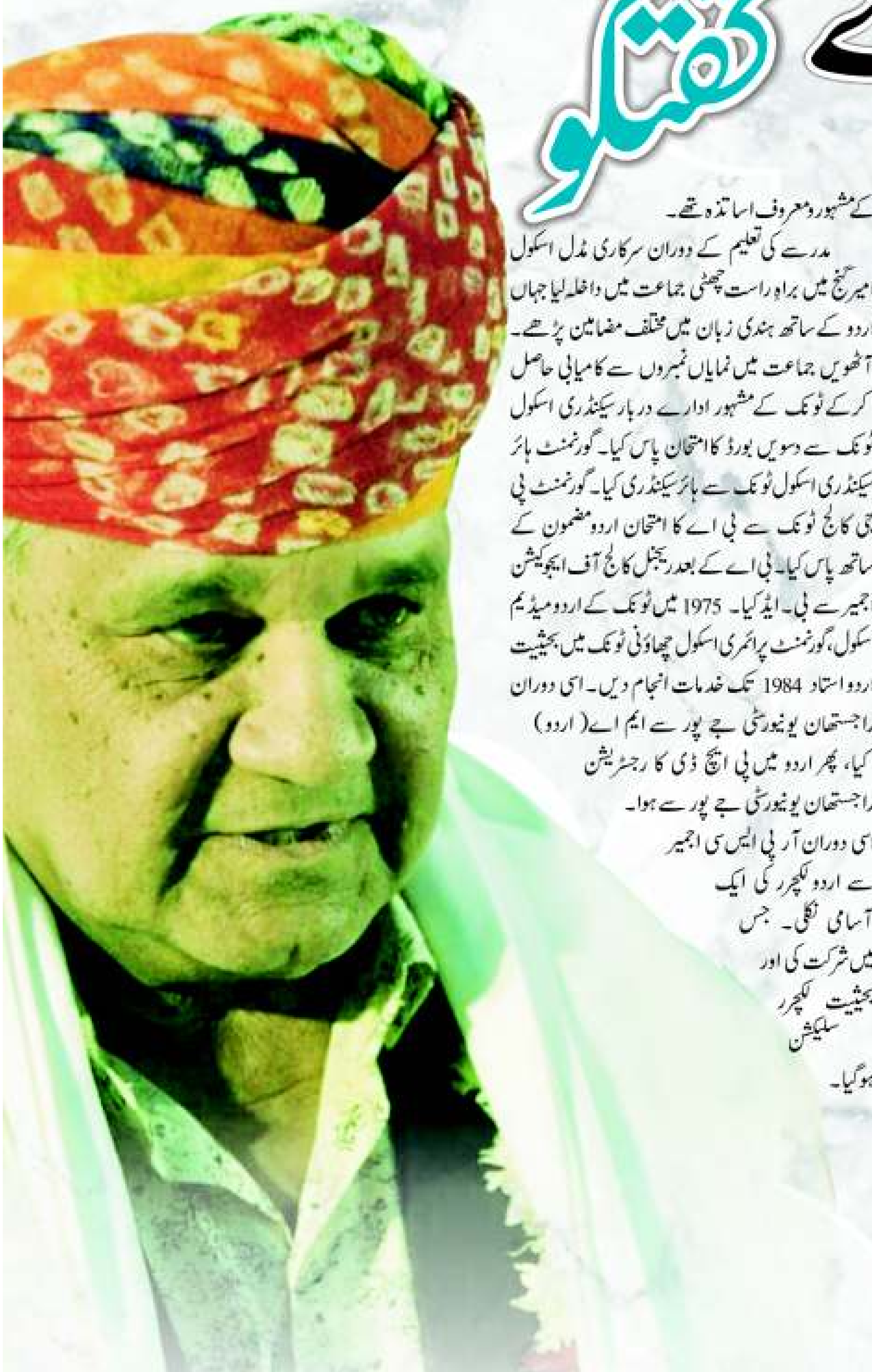

غلام نبی کمار : پروفیسر عزیز اللہ شیرانی صاحب گفتگو کا آغاز آپ کی زندگی سے کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں بتائیں کہ آپ کی پیدائش و پرداخت کس ماحول میں ہوئی؟

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی: میری پیدائش راجستھان کے ادبی و ثقافتی شہر ٹونک میں 15 جون 1954 کو ہوئی۔ آزادی سے قبل یہ واحد مسلم ریاست تھی جس کی بنیاد نواب امیر خاں نے انگریزوں سے ایک معاہدے کے تحت 1817 میں رکھی تھی۔ میرے والد حاجی حافظ حکیم اللہ پنیل حافظوں کے معزز خاندان سے تھے جن کے آبا و اجداد حافظ قرآن تھے جن کا شمار سرکردہ شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے وقت کے جید عالم، خطاط اور قومی رہنما کے ساتھ ایک کامیاب تاجر تھے۔ میری والدہ تہذیب و روایت کی زندہ و جاوید تصویر تھیں۔ میرے نانا امیر محمد عرف (امیرا) کا شہر کے معزز تاجرین میں شمار ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ٹونک میں ادبی اور شعری نشستوں اور مشاعروں کا رواج تھا۔ گھر گھر ادب و تہذیب اور اردو زبان کا چرچہ تھا۔ مدرسوں میں دینی تعلیم ہوتی تھی۔ گھر گھر سے قرآن کی تلاوت کی آوازیں گونجتی تھیں۔

غ ن ک: آپ نے کن کن تعلیمی اداروں سے تعلیم کا فیض حاصل کیا ہے؟ آپ کو تعلیم حاصل کرنے میں دشواریاں تو پیش نہیں آئیں؟

ع ش: ابتدائی تعلیم دارالعلوم فرقانیہ ٹونک راجستھان میں ہوئی۔ ناظرہ قرآن شریف پڑھا، مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی ابتدائی پانچ کتابیں غالب کا فارسی آمدنامہ اور دینیات کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ حساب اور جغرافیہ کی تعلیم بھی مدرسہ فرقانیہ سے حاصل کی۔ ٹونک کے جید عالم مولوی سعید صاحب سے فارسی پڑھی، قاری معظم شاہ صاحب اور حافظ منور حسین صاحب سے قرآن پڑھا، جو اس وقت کے مشہور و معروف اساتذہ تھے۔

مدرسے کی تعلیم کے دوران سرکاری مڈل اسکول امیر گنج میں براہ راست چھٹی جماعت میں داخلہ لیا جہاں اردو کے ساتھ ہندی زبان میں مختلف مضامین پڑھے۔ آٹھویں جماعت میں نمایاں نمبروں سے کامیابی حاصل کر کے ٹونک کے مشہور ادارے دربار سیکنڈری اسکول ٹونک سے دسویں بورڈ کا امتحان پاس کیا۔ گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول ٹونک سے ہائر سیکنڈری کیا۔ گورنمنٹ پی جی کالج ٹونک سے بی اے کا امتحان اردو مضمون کے ساتھ پاس کیا۔ بی اے کے بعد ریجنل کالج آف ایجوکیشن اجمیر سے بی۔ ایڈ کیا۔ 1975 میں ٹونک کے اردو میڈیم اسکول، گورنمنٹ پرائمری اسکول چھاؤنی ٹونک میں بحیثیت اردو استاد 1984 تک خدمات انجام دیں۔ اسی دوران راجستھان یونیورسٹی جے پور سے ایم اے (اردو) کیا، پھر اردو میں پی ایچ ڈی کا رجسٹریشن راجستھان یونیورسٹی جے پور سے ہوا۔

اسی دوران آر پی ایس سی اجمیر سے اردو لکچرر کی ایک آسامی نکلی۔ جس میں شرکت کی اور بحیثیت لکچرر سلیکشن ہوگیا۔

بحیثیت لکچرر پہلا تقرر بانسواڑہ راجستھان میں ہوا۔ اسی کے ساتھ پی ایچ ڈی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس تحقیقی کام میں کافی وقفہ لگ گیا۔ آخر کار 1990 میں راجستھان یونیورسٹی جے پور سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ میری تحقیق کا موضوع 'راجستھان میں مختلف زبانوں کی کتابوں کے اردو تراجم' تھا۔ 1977 میں شملہ یونیورسٹی ہماچل پردیش سے ایم۔ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ بحیثیت مجموعی زندگی کا زیادہ وقفہ تعلیم حاصل کرنے اور درس وتدریس کے لیے وقف رہا۔

غ ن ک :اپنے آباواجداد کے بارے میں آپ کے ذہن میں کچھ باتیں ہوں تو بتادیں۔ ان کا تعلق کہاں سے تھا؟

ع ش: ہمارا خاندان تاریخی قلعہ رنتھمبور سے علاء الدین خلجی کے فتح قلعہ کے بعد ٹونک آیا۔ ہمارا خاندان ابتدا سے ٹونکی نہیں ہے۔ ہمارے آباواجداد رنتھمبور کے زمانے میں فوج کے ساتھ رنتھمبور آئے۔ فتح رنتھمبور کے بعد ذریعۂ معاش کے لیے قلعہ سے نکل کر سوائی مادھوپور، شیرپور، کھنڈار، ملارنا ڈونگر، بونلی اور ٹونک آکر بس گئے۔ یہ علاقہ وسیع جنگلوں اور پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ قدیم زمانے میں ویران جنگل کے جھاڑ کاٹ کر گھر بنا کر رہنے لگے۔ جہاں شیر اور دوسرے جنگلی جانوروں کا خطرہ لاحق رہا۔ جب 1817 میں ٹونک ریاست قائم ہوئی تو یہاں جگہ جگہ سے لوگ آکر بس گئے۔ ہمارے کچھ بزرگ بھی سوائی مادھوپور سے ٹونک کے محلّہ کالی پلٹن میں آکر بس گئے، باقی وہیں رہ گئے۔

غ ن ک :پروفیسر صاحب! آپ کب سے لکھ رہے ہیں؟ اور جب آپ کی پہلی تحریر/تخلیق شائع ہوئی اس وقت کیسا محسوس ہوا؟

ع ش: ابتدائی تعلیم کے حصول کے وقت ہی مجھے قلم چلانے کا شوق ہوا۔ میرے اندر تخلیقی شعاعیں روشن ہوئیں اور یہ شعاعیں صفحۂ قرطاس کی زینت بنیں۔

ابتدائی دینی تعلیم دارالعلوم فرقانیہ میں ہوئی۔ 1965 میں امیر گنج مدل اسکول میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا۔ 1969 میں دربار سیکنڈری اسکول ٹونک میں داخلہ لیا۔ اسی دوران کہانی لکھنے کا شوق ہوا۔ اس وقت میری عمر 13 سال کی تھی۔ گھر میں دینی ماحول ملا۔ سادگی صفائی اور اخلاقی قدروں کا پابند رہا۔ سیدھی سادی روش اور معصوم خیالات کے ہجوم نے سوچ وفکر میں مبتلا کیا۔ اس زمانے میں والد صاحب سماجی اور فلاحی کام کرتے تھے۔ سماج اور قوم کے مسائل اور ان کے حل تلاشنا، فیصلے کرنا، سمجھنا سمجھانا، دو بھائیوں میں صلح کروانا، آپسی جھگڑوں کے نپٹارے کرنا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ اور ہمارا گھر فیصلہ گھر کے نام سے مشہور تھا۔ اسی ماحول میں تخلیقی شعاعیں روشن ہوئیں۔ آنکھوں دیکھا حال لکھنے کا شوق ہوا۔

سب سے پہلے ایک مضمون لکھا جس کا موضوع تھا ''کیا راجہ مہاراجہ تاریخ کا ایک ورق بن جائیں گے۔'' اس وقت میں گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول ٹونک میں گیارہویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اسکول میگزین کے اردو سیکشن میں 1969 میں شائع ہوا۔

پہلی کاوش افسانہ 'ٹھوکریں' سے جو گورنمنٹ کالج ٹونک کی میگزین 'شت دھارا' اردو سیکشن میں 1972 میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں بی اے سال اول کا طالب علم تھا۔ افسانہ چھپنے کے بعد نہ صرف کالج کے طلبہ بلکہ اساتذہ نے بھی تخلیقی کاوش کی ہمت افزائی کی۔ مجھے محسوس ہوا کہ قلم کی کاوش کتابی شکل میں شائع ہوگئی۔ بہت خوشی محسوس ہوئی کس قدر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا اطمینان ہوا۔ مزید تخلیقی کا شوق وذوق پروان چڑھا۔ اور پھر مسلسل دو کہانیاں 'ماضی کا جھروکہ' اور 'آرزو' شائع ہوئیں۔

مضمون اور کتاب شائع کرنے کا حوصلہ ملا، بچپن سے ہی کتابوں کا خوب مطالعہ کیا تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ہم بھی کتاب تیار کریں اور اس کو چھپوائیں۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ چند کہانیاں، چند مضمون جمع کرکے اس کو خوش خط لکھ کر کتابی شکل دی اس کے بعد ٹونک کالج میں انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کی آٹھویں کانفرنس 1978 میں منعقد ہوئی تھی، اس کی مکمل روداد خوش خط لکھ کر کتابی شکل دی۔ جسے ٹونک کے ماہنامہ 'ندیم' میں شائع کیا گیا۔ بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

غ ن ک :اردو زبان وادب سے آپ کی دلچسپی کی کوئی خاص وجہ رہی ہو تو بتادیں؟

ع ش: ٹونک ریاست کی سرکاری زبان اردو تھی۔ گھروں میں اردو بول چال کی زبان تھی، مادری زبان بھی اردو ہی تھی، ٹونک کے ادبی شعری اور جغرافیائی ماحول اور اردو زبان وادب کے مطالعے نے اردو تخلیق کی دلچسپی بڑھائی۔

غ ن ک :شیرانی صاحب! تحقیق، تنقید اور تبصرہ نگاری میں آپ کو خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ دیگر کون سی اصناف ہیں جن میں آپ نے طبع آزمائی کی ہے؟

ع ش: تحقیق، تنقید اور تبصرہ نگاری کے علاوہ افسانہ نگاری، انشائیہ نگاری، ترجمہ نگاری اور طنز ومزاح نگاری پر بھی طبع آزمائی کی۔ جو مختلف اخبار ورسائل میں شائع ہوئیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں میں بھی میری تخلیقات نشر ہوئیں۔ افسانوی اور شعری مجموعے بھی شائع ہوئے۔

غ ن ک :اپنی تحقیقی وتنقیدی اور دیگر شائع شدہ کتب کی تفصیل پر روشنی ڈالیں تاکہ ہمارے قارئین آپ کی ادبی اور متنوع شخصیت سے پوری طرح آگاہ ہوں۔

ع ش: 'نگارخانۂ راجستھان' میری بارہویں تحقیقی کتاب ہے۔ جس میں راجستھان کے مشاہیر اردو کی ادبی خدمات اور راجستھان میں اردو تحقیق وتنقید کی سمت ورفتار کا جائزہ لیا ہے۔

میری فکر وجستجو راجستھان کے علاقائی ادب سے ہے۔ میں نے راجستھان کے قدیم وجدید ادب کو منظر عام پر لانے میں اپنی پوری توجہ صرف کی ہے۔ اس ضمن میں میری مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

روداد آل انڈیا اردو کانفرنس، مطبوعہ 1982، اردو تعلیم کا جائزہ، مطبوعہ 1994، ادراک ادب، مطبوعہ 1994، راجستھان میں اردو تراجم، مطبوعہ 2011، ادبیات راجستھان، مطبوعہ 2012، تذکرہ معاصر شعرائے ٹونک، مطبوعہ 2013، کاوش قلم، مطبوعہ 2013، ادبی جائزے، مطبوعہ 2016، تحقیق وتفہیم، مطبوعہ 2016، حاجی محمد علی چودھری قوم وملت کا مسیحا، مطبوعہ 2016، تبصراتی تجزیے، مطبوعہ 2017

مذکورہ بالا کتابوں میں میں نے راجستھان کے شعرا ادبا محققین اور ناقدین کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اسی کے ساتھ راجستھان میں اردو کے رجحان اور فروغ کو تقویت دینے والی ادبی سرگرمیوں، سیمنار، کانفرنس، سمپوزیم، ورک شاپ، مباحثے، تقاریر وغیرہ کو بھی تحقیقی نظر سے دیکھا ہے۔ اس سے علاقائی ادب کو فروغ حاصل ہوا ہے اور مشاہیر راجستھان کی گراں قدر خدمات کو منظر عام پر لایا ہوں۔

غ ن ک : کیا آپ شعرگوئی کی طرف بھی متوجہ ہوئے؟

ع ش: جی ہاں کالج میں طالب علمی کے زمانے سے شاعری کا شوق ہوا۔ 1975 ٹونک میں 'بزم احباب' کے ماہانہ مشاعرہ میں پہلی نظم 'سورج' پیش کی، استاد شعرا میں صائب، خنداں، ساحل، بزمی نے میری نظم کو پسند کیا میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ یہ نظم ماہنامہ پاسبان (چنڈی گڑھ) شمارہ اپریل 1982 میں شائع ہوئی۔ روز نامہ سالار (بنگلور)، پیام تعلیم، نور (رامپور) شمع خیال، گنگوہ میں غزلیں اور نظمیں شائع ہوئیں۔ بچوں کے ادب پر شعری مجموعہ چہچہاہٹ 2019 میں شائع ہوا۔ جس میں 34 نظمیں شامل ہیں۔

آل انڈیا مشاعرہ گورنمنٹ کالج ٹونک منعقدہ 25 دسمبر 1978 میں کلام سنانے کا موقع ملا جس کی صدارت قاضی عبدالستار (علی گڑھ) فرمارہے تھے۔ شاعری ذوقی عمل ہے، غزل، نظم، چہار بیت، ہائیکو، آزاد نظم اور نثری

نظموں پر طبع آزمائی کی۔ میری شاعری کا سفر جاری ہے۔

غ ن ک: آپ سے جاننا چاہیں گے کہ تخلیق کی پرکھ کے لیے تنقید کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ کیا بغیر تنقید کے ایک قاری پر تخلیق کی جہتیں واضح ہو سکتی ہیں؟

ع ش: تخلیق و تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے کوئی بھی فن پارہ تخلیق کے بعد تنقید نظر کا متمنی ہوتا ہے۔ خواہ وہ نقاد کی نظر ہو یا قاری کی۔ دونوں کی تنقید فن پارے کی اہمیت و افادیت کو بڑھاتی ہے اور اس کی کمیوں کو اجاگر کرتی ہے۔ عصری ادب کی تخلیق کی جہتیں ایک عام قاری پر بھی واضح ہوتی ہیں، وہ تخلیق کار کی عصری حسیت اس کی نفسیات تک پہنچتا ہے اور معاشرے سے اس کا رابطہ قائم کرتا ہے، اس کے سماجی پہلو کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اس سے محظوظ بھی ہوتا ہے۔

غ ن ک: شیرانی صاحب! آپ کا تعلق ٹونک سے ہے وہی ٹونک جہاں سے اردو کے کئی جیالے اور روشن ستارے جنمے ہیں۔ اختر شیرانی اور مخمور سعیدی کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے، ٹونک کی ادبی اعتبار سے اہمیت کو اپنے لفظوں میں اجاگر کیجیے۔

ع ش: آزادی سے قبل ٹونک راجستھان کی واحد مسلم ریاست تھی۔ جہاں 1806 میں نواب امیر خاں نے اپنی فتح کے جھنڈے گاڑے تھے اور 1817 میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے ایک معاہدہ کے بعد ٹونک کو ایک خود مختار ریاست کا درجہ دیا تھا۔ نوابین نے اس ریاست میں مشرقی علوم و ادب کی سرپرستی فرمائی۔ یہاں علماء، فضلاء کے علاوہ علم و فضل کے قدرداں بھی موجود تھے۔

اول فرمانروا نواب امیر الدولہ کے عہد حکومت (1817 تا 1834) میں جوش ملیح آبادی کے دادا فقیر محمد گویا، لالہ بساون لال شاداں، پائندہ خاں نکہت جیسے شعرا موجود تھے۔

دوم فرماں روائے ٹونک نواب وزیر محمد خاں 1834 میں مسند نشین ہوئے، ولی عہدی کے زمانے میں آپ کی تربیت دہلی کے لال قلعہ میں ہوئی۔ وہاں مومن، غالب، ذوق اور ظفر سے شناسائی تھی۔ غالب نے فارسی میں نواب موصوف کے دو قصیدے لکھے۔ مولوی نجف علی جھجھری سے نازش خیر آبادی، مولانا حکیم سید حیدر علی رامپوری نے اردو فارسی اور عربی میں مذہبی تصانیف مرتب کیں۔

نواب ابراہیم علی خاں (1870 تا 1930) صاحب دیوان شاعر تھے، خلیل تخلص تھا۔ اسد لکھنوی، بسمل خیر آبادی اور مضطر خیر آبادی آپ کے مشیر سخن تھے۔

داغ دہلوی کے جانشین صاحبزادہ بھائی جان عاشق بھی ان کے دربار سے وابستہ تھے مولوی اصغر علی آبرو نے ٹونک کی ضخیم تاریخ (مدینۂ راجستھان) مرتب کر کے 1901 میں شائع کی۔ اس دور کی علمی و ادبی شخصیتوں میں پروفیسر محمود شیرانی، مولانا محمد عرفان، صاحبزادہ احمد سعید خاں، حافظ عالمگیر کیف، مولانا حیدر حسن خاں، منشی نانگ رام بھارگو وغیرہ شامل تھے۔

نواب سعادت علی خاں (1930 تا 1947) کے دور میں شاعر رومان اختر شیرانی، استاد صولت، جام ٹونکی، شاعر اور ڈرامہ نگار بسمل سعیدی شاعری میں اپنے جوہر دکھا رہے تھے۔

آخری نواب اسمٰعیل علی خاں کے زمانے میں 15 اگست 1947 کو ہمارے ملک کو آزادی ملی، نواب موصوف نے کئی مشاعرے منعقد کروائے جن میں جوش، ساغر، روش اور اعجاز صدیقی وغیرہ نے مشاعرہ میں شرکت کی۔

آزادی کے بعد حضرت بسمل سعیدی اور ان کے شاگرد مخمور سعیدی نے شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا۔

1978 میں جامعات ہند کی آٹھویں اردو کانفرنس گورنمنٹ کالج ٹونک میں منعقد ہوئی۔ جس میں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر حسین الحق، ڈاکٹر عبدالحق (سکریٹری جامعات ہند)، ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی اس کانفرنس کے کنوینر تھے۔ راقم الحروف (ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی) نے کانفرنس کی روداد اور تحقیقی تنقیدی اور تعلیمی مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ ٹونک کی ادبی انجمنوں میں "بزم تاریخ و تحقیق، انجمن تعمیر اردو اور بزم احباب شعرائے ٹونک، محمود شیرانی اکادمی، اور 'ٹونک ادبی سوسائٹی' شعری اور ادبی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ خاکسار 'بزم تاریخ و تحقیق' سکیر اور 'ٹونک ادبی سوسائٹی' میں سکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا ہے۔ خاکسار نے تذکرہ معاصر شعرائے ٹونک اور 'ادراک ادب' میں ٹونک کے شعرا و ادبا کا تعارف اور ان کی کاوشات کو اجاگر کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ وہ سرزمین ہے جہاں مشہور محقق محمود شیرانی، شاعر رومان اختر شیرانی، بسمل سعیدی، مخمور سعیدی جیسے بین الاقوامی شہرت کے شعرا و ادبا پیدا ہوئے۔ ٹونک کی شاعرانہ فضا نے آج بھی اس روایت کو برقرار رکھا ہے۔

غ ن ک: کیا آپ مجموعی طور پر راجستھان کے ادبی پس منظر پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟

ع ش: راجستھان میں علم و ادب اور شعر و سخن کے ادبی مراکز قائم ہوئے۔ ان میں ٹونک، جے پور، اجمیر، بھرت پور، الور، جودھپور، جھالاواڑ، کوٹہ اور بوندی قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کی تحقیق کے مطابق تاریخ غریبی 1747 کی تصنیف ہے جسے محمد جی میاں ولد مجتبیٰ نے مثنوی کی شکل میں لکھی تھی۔ مولوی عبدالحق نے جائزہ زبانِ اردو 1940 میں شائع کرائی اس کتاب میں راجستھان کی قدیم ریاستوں میں اردو کی صورتِ حال کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

تشکیلِ راجستھان کے بعد مندرجہ ذیل کتابیں منظرِ عام پر آئیں:

تذکرہ شعرائے جے پور از مولانا احترام الدین شاغل (1958) 'بہارِ سخن' یعنی تذکرہ شعرائے جودھپور از شرف الدین یکتا (1963)، راجستھان کے موجودہ اردو شاعر (دیوناگری رسم الخط) مرتبہ پروفیسر پریم شنکر سری واستو (1966)، دامانِ باغباں مرتبہ پریم سنگھ کمار کا میشور دیال حزیں او رعثمان عارف (1968)، تذکرہ معاصر شعرائے ٹونک، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی (2013)۔

تشکیلِ راجستھان کے بعد انجمن ترقی اردو ہند جے پور نے جے پور اور جودھپور میں ادبی تقریبات منعقد کر کے ان کی رودادیں شائع کیں۔ کل ہند اردو کانفرنس جامعات ہند کی روداد خاکسار عزیز اللہ شیرانی نے 1978 میں شائع کی۔

سندی تحقیق کے تحت اولاً ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے اپنی کتاب 'راجستھان میں اردو ادب کے لیے غیر مسلم حضرات کی خدمات' 1985 میں شائع کروائی۔

ڈاکٹر فیروز احمد (راجستھان میں اردو) اور راقم الحروف ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے (راجستھان میں اردو تراجم) راجستھان سے متعلق مستند کام کیا ہے۔ ان کے علاوہ سندی تحقیق کے ضمن میں ڈاکٹر قمر جہاں، ڈاکٹر نادرہ خاتون، ڈاکٹر ریاض الدین انصاری، ڈاکٹر قائد علی خاں، ڈاکٹر سنجیدہ بی بی، ڈاکٹر نصرت فاطمہ، ڈاکٹر عبدالماجد چشتی نے بالترتیب راجستھان میں اردو ادب کی ایک صدی (1857 سے 1957) شعری گلدستے، دہلی اور لکھنؤ کا سلسلۂ تلمذ، نعت گوئی، شاغل حیات اور خدمات، اردو مرثیے اور سلام گوئی، اجمیر میں اردو ادب پر تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی مقالے لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں۔

راجستھان میں شعر و ادب کی صورت حال امید افزا رہی ہے شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ احتشام اختر، میکش اجمیری، ش ک نظام، فاروق بخشی، ضیاء ٹونکی، ابرار فائق، تبسم رحمانی، ڈاکٹر جلال توقیر، مختار ٹونکی اور ملکہ تسنیم وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ افسانہ نگاروں میں مختار الرحمٰن راہی، مہدی ٹونکی، ڈاکٹر ثروت النسا، فرخندہ ضمیر، شہناز فاطمہ، زینت کیفی اور خاکسار (عزیز اللہ شیرانی) شامل ہیں۔ محققین و ناقدین میں ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی، ڈاکٹر فیروز

احمد، ڈاکٹر مدبر علی زیدی، پروفیسر احتشام اختر، فاروق بخشی، مختار ٹونکی، شاہد احمد جمالی، ڈاکٹر رفعت اختر اور خاکسار (عزیز اللہ شیرانی) کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

غ ن ک: آپ کی کئی قابل قدر تصانیف منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ جس میں تبصرہ نگاری سے متعلق کتابیں بھی شامل ہیں، اس تناظر میں تبصرہ نگاری کی موجودہ دور میں اہمیت ومعنویت پر روشنی ڈالیے۔

ع ش: جی ہاں تبصرہ نگاری سے متعلق میری کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ موجودہ دور میں جس کی بڑی اہمیت اور معنویت ہے۔ تبصرہ نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں دریا کو کوزے میں بند کیے جانے کا عمل ہوتا ہے۔

کسی بھی تخلیق، تصنیف، تالیف یا ادبی پارے کی اشاعت وترتیب کے بعد اس پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے اس کا جامع تعارف پیش کرنا تبصرہ کا اولین مقصد ہوتا ہے گویا تبصرہ کسی بھی کتاب کا تعارف اس کی اہمیت وافادیت اور اس کے معیار کو تنقیدی کسوٹی پر پرکھنے کا نام ہے۔

تبصرہ نگاری میں جانب داری، خوشنودی، تعریف وتوصیف کی گنجائش نہیں بلکہ غیر جانبداری، خلوص او رحقیقت آمیزی ہو۔ تبصروں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں مثلاً تعارفی، توصیفی وتنقیدی، تشریحی، تنقیدی، تحقیقی وغیرہ وغیرہ موضوعات تبصروں میں تاریخی، تہذیبی، معاشرتی، مذہبی، علمی، فقہی، اصلاحی، سماجی، جغرافیائی، سائنسی، نفسیاتی، عام معلوماتی، شعری، نثری اور اخلاقی وغیرہ وغیرہ۔

غ ن ک: اردو کے علاوہ آپ ہندی بھی لکھتے ہیں، آپ اردو ہندی کے رشتے اور ہندوستان میں اردو زبان کے مستقبل کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گے؟

ع ش: اردو اور ہندی زبانیں گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار ہیں، دونوں زبانوں میں لسانی مماثلت ہے۔ تہذیبی مزاج بھی شیر وشکر ہے، ہندی میں بیشتر الفاظ اردو کے ہیں اور اردو میں کئی الفاظ ہندی کے استعمال ہوتے ہیں۔ صرف رسم الخط الگ الگ ہے۔ زبان وبیان یکساں ہیں، میرا تعلق صوبۂ راجستھان سے ہے جہاں ہندی راجستھانی اور اردو زبان کا عام رواج ہے، راجستھان اردو اور ہندی اسپیکنگ علاقہ ہے جہاں دونوں زبانوں کی تعلیم وتدریس کا انتظام ہے۔ عام بول چال کی زبان بھی مشترکہ اور ہم مزاج ہے۔

غ ن ک: پروفیسر عزیز اللہ شیرانی صاحب! آپ کی مادری زبان کون سی ہے؟

ع ش: اردو میری مادری زبان ہے۔

غ ن ک: آپ بتاسکتے ہیں کہ بین الاقوامی سطح پر اردو زبان دیگر زبانوں کے مقابلے میں کس مقام پر ہے؟

ع ش: اعلیٰ مقام پر ہے۔

غ ن ک: ہندوستانی جامعات میں تحقیق کے معیار میں بہتری لانے کے لیے کیا اقدام اٹھائے جانے چاہئیں؟

ع ش: یونیورسٹی سطح پر نئی تحقیق کے لیے ریسرچ بورڈ بنایا جائے جس میں موضوعات اور عنوانات متعین کیے جائیں۔ کسی بھی پی ایچ ڈی کے خاکہ کے مقاصد تعین کیے جائیں اس میں یہ خیال رہے کہ نئی تحقیق کا تجزیہ اور نتائج بالکل نئے ہوں، گھسی پٹی زبان میں نہ ہوں۔ جس کا اظہار خاکے میں بھی کر دیا جائے۔ تحقیق کے لیے Tools کی اقسام میں اضافہ کریں۔ فہرست سازی، انٹرویو، آبزرویشن، ملاقاتیں، تاثرات، مآخذات، یہ تمام Tools کو اپنے مقالے میں شامل کیا جائے۔ اور ان کے تجزیے اور نتائج شامل کیے جائیں۔ سماجی وتاریخی علوم، سائنسی اور ٹیکنالوجی علوم اور اقتصادی علوم کو بھی تحقیق کا حصہ بنائیں۔ اسکالرس کو خود بخود تحقیق کرنے کے مواقع فراہم کروائے جائیں۔ تحقیق کے گائڈ حضرات خود اپنے اسلوب میں مقالہ لکھنے کی مدونہ کریں۔ ان میں خود لکھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہونے دیجیے۔ ہاں زبان وبیان کی اصلاح ضرور فرمائیں۔ جہاں تک ہوسکے نقل کرنے کی عادت کو دور کریں۔ طلبہ کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی تحقیق کے لیے کوشاں رہیں اپنے موضوع سے متعلق مواد کی تلاش کریں اور ان کا حوالہ اپنی ریسرچ میں دیں۔ ان کو نظرانداز نہیں کریں۔ اردو میں نصاب کیسے بنایا جاتا ہے۔ کتابیں کیسے لکھی جاتی ہیں۔ طباعت واشاعت کس طرح ہوتی ہے؟ رضا کارانہ تنظیمیں اور سرکاری ادارے اردو کے فروغ میں کیا رول ادا کرتے ہیں؟ علاقائی ادبی تاریخ، او رمشہور شعرا وادبا کون سے ہیں؟ دوسری زبانوں کی کتابوں کے تراجم علاقہ کے مخطوطات اور مطبوعات پر روشنی ڈالی جائے۔ مجموعی طور پر پی ایچ ڈی کے لیے عملی اقدام اٹھائے جائیں۔

غ ن ک: شیرانی صاحب! کیا معتبر تنقید کے لیے مغربی ادب وادباء سے استفادہ بھی ضروری ہے؟

ع ش: اردو میں معتبر تنقید کے لیے مغربی ادب اور ادباء سے استفادہ ضروری ہے، عالمی سطح پر عصر حاضر میں تخلیق ہونے والا ادب اور مشرقی ادب پر نظر رکھنا اور اس کا موازنہ کرنا عالمی ادب کے فروغ اور صورت حال کا جائزہ لینے میں مددگار ہوگا۔

غ ن ک: ادبی غرض وغایت سے آپ نے کن مقامات کے اسفار کیے ہیں؟

ع ش: ادبی سلسلے میں ملک کے کئی مقامات کے سفر کیے، اردو سمینار، کانفرنس، مشاعرے اور ورک شاپس میں شرکت کا مندرجہ ذیل مقامات پر موقع ملا۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، نیشنل لٹریسی مشن جام نگر ہاؤس دہلی، غالب اکیڈمی بستی نظام الدین دہلی، اسٹیٹ رسورس سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی دہلی، گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر، ہریانہ، پنجاب، اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اردو اکادمی جے پور، بزم خوشدلان جودھپور، آکاش وانی جے پور، جودھپور، پنچکولہ، ہریانہ۔ وش نگر مہسانہ احمد آباد، گورنمنٹ پی جی کالج اجمیر، جھالاواڑ، کوٹہ، سوائی مادھو پور، جیسلمیر، ایس آئی ای آر ٹی اودے پور، بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن اجمیر، ریجنل کالج آف ایجوکیشن اجمیر وغیرہ۔

غ ن ک: کیا آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف ہوا ہے؟

ع ش: ادبی خدمات کے اعتراف میں مندرجہ ذیل ایوارڈ حاصل ہوئے۔

1. اکادمی ایوارڈ راجستھان اردو اکادمی جے پور 1994
2. محسن اردو ایوارڈ، غالب سوسائٹی جے پور 2014
3. اردو درس وتدریس کتاب پر انعام بہار اردو اکادمی 2016
4. کاوش قلم کتاب پر انعام، راجستھان اردو اکادمی جے پور 2017
5. تحقیق وتفہیم کتاب پر انعام، بہار اردو اکادمی 2018
6. منشی پریم چند عالمی ایوارڈ (اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن، دہلی 2018
7. پروفیسر پریم شنکر ایوارڈ، سینئر سٹیزن سوسائٹی فار ایجوکیشن جودھپور 2018
8. انصاری رتن ایوارڈ، انصاری ویلفیئر سوسائٹی، کوٹہ (راج) 2021

غ ن ک: نئی نسل کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

ع ش: نئے زمانے سے مفاہمت کے ساتھ تعلیم سے دلچسپی رکھیں۔ تعلیم کے فروغ میں دین ودنیا دونوں کو ملحوظ رکھیں۔ والدین ذاتی دلچسپی سے تعلیم وتربیت کے لیے کوشاں رہیں۔ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق جدید علوم کو حاصل کریں۔ علم وہنر کی قدر کریں، تعلیم وتہذیب کو فروغ دیں، اخوت، محبت اور قومی یگانگت کو فروغ دیں۔ اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں ان میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ تخلیقی صلاحیتوں کے مواقع فراہم کریں۔

■

Ghulam Nabi Kumar
Kumar Mohalla
Charari Sharief
Budgam- 191112 (J&K)
Mob: 7006738304

علم نحو کی سب سے پہلی کتاب

شمس کمال انجم

الکتاب

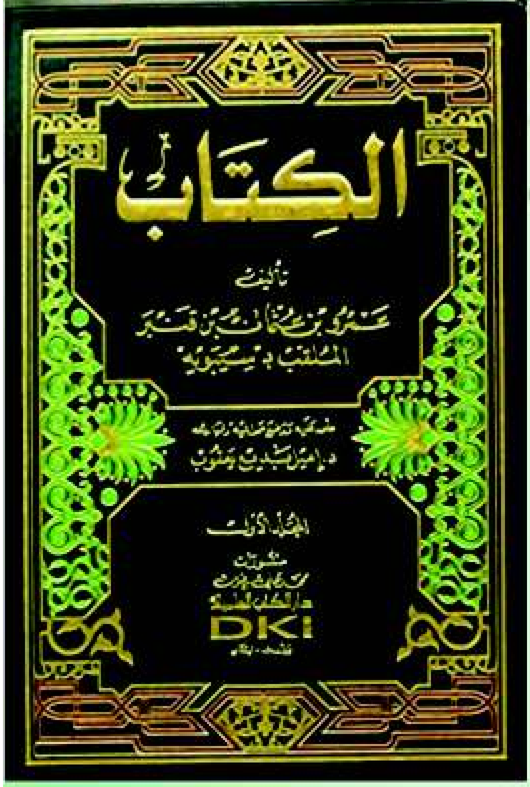

سیبویہ کو علم نحو وصرف میں سب سے پہلے صاحب کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وہ فارسی الاصل تھا۔ دوسری صدی ہجری کے چوتھے عشرے میں فارس کے ایک گاؤں 'بیضا' میں پیدا ہوا (نزہۃ الالباء ص 54۔ بیضا کا اصل نام 'درۂ سفید' تھا لیکن بعد میں اس کی تعریب کر کے اسے 'بیضا' کر دیا گیا (ابنیۃ الصرف ص 44) بعض علما کہتے ہیں کہ اس کے مقام ولادت کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم۔ (سیبویہ حیاتہ وکتابہ ص 11) لیکن یہ ثابت ہے کہ عراق کے مشہور شہر بصرہ میں اس کی نشو ونما ہوئی۔

(سیبویہ، ڈاکٹر خدیجہ حدیثی ص 12،19)

اس کا پورا نام ابو بشر عمرو بن عثمان بن قنبر تھا۔ لیکن اسے سیبویہ کے لقب سے شہرت حاصل ہوئی (وفیات الاعیان 3 / 463) سیبویہ سیب اور ویہ سے بنا ہے جس کا معنی ہے سیب کی خوشبو (انباہ الرواۃ 2 / 346) بعض علما کہتے ہیں کہ وہ بالکل سیب کی طرح تھا اس لیے اسے سیبویہ کہا جاتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے سیب کی خوشبو آتی تھی اس لیے اسے سیبویہ کے لقب سے ملقب کیا گیا (سیبویہ حیاتہ وکتابہ ص 10) ابراہیم حربی کہتا ہے کہ وہ سیب جیسے عارض والا نہایت حسین وجمیل نوجوان تھا (دیکھیے وفیات الاعیان 3 / 465، ابنیۃ الصرف من کتاب سیبویہ ص 43) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سی (بمعنی تیس) اور بوے (بمعنی خوشبو) سے مرکب ہے جس کا معنی ہے تیس طرح کی خوشبوؤں والا۔ یعنی بے انتہا خوشبو والا۔ (ابنیۃ الصرف ص 43) ابن عائشہ کا کہنا ہے کہ وہ بہت خوبصورت نوجوان تھا (طبقات النحویین واللغویین ص 66) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تین اور اشخاص کو اسی لقب سے ملقب کیا جاتا تھا لیکن صرف ابو بشر عمرو کو سیبویہ کے لقب سے شہرت ملی۔ (ابنیۃ الصرف ص 44)

سیبویہ کی تعلیمی نشو ونما کے بارے میں تفصیلات موجود نہیں ہیں البتہ غالب گمان یہ ہے کہ اس نے اپنے عہد کے بچوں کی طرح قران کریم سے تعلیم کی شروعات کی ہوگی۔ عربی اشعار حفظ کیے ہوں گے۔ سیرت پاک کے کچھ اجزا پڑھے ہوں گے۔ تاریخ اور غزوات کا علم حاصل کیا ہوگا اور اس کے بعد باقی بچوں کی طرح اس نے بھی اپنے تخصص کی طرف رخ کیا ہوگا۔ یعنی عربی نحو کے اس امام نے سب سے پہلے نحو کی تعلیم کا اہتمام نہیں کیا بلکہ اس نے حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ (سیبویہ حیاتہ وکتابہ ص 11) اور ایک دن کی بات ہے اپنے استاد حماد بن سلمہ کے پاس حدیث پڑھ رہا تھا۔ حدیث کی عبارت پڑھتے ہوئے سیبویہ نے اعراب میں غلطی کر دی۔ استاد نے کہا سیبویہ کیا کر رہے ہو۔ شاید غصہ ہوئے ہوں گے۔ دو چار بات سنائی بھی ہوگی۔ چنانچہ سیبویہ ان کی کلاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔ قسم کھائی کہ میں وہ علم حاصل کروں گا جس سے کوئی بھی مجھے کسی لفظ کی قرات میں غلط نہ ثابت کر سکے۔

اس سلسلے میں دو روایتیں مذکور ہیں۔ پہلی روایت یہ ہے کہ سیبویہ نے اپنے استاد حماد بن سلمہ کے پاس حدیث کی یہ عبارت پڑھی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ليس أحد من اصحابي الا وقد احذت عليه، ليس ابا الدرداء" سیبویہ نے لیس ابا الدردا کے بجائے 'لیس ابو الدردا' (یعنی مرفوع) پڑھ دیا۔ استاد نے کہا سیبویہ تم غلط عبارت پڑھ رہے ہو۔ 'لیس ابا الدرداء' کے بجائے لیس ابو الدرداء' پڑھو۔

(دیکھیے نزہۃ الالباء ص 54، بغیۃ الوعاۃ 1 / 485، طبقات النحویین ص 66، معجم الادباء 3 / 1199)

البتہ زجاجی نے ایک دوسری روایت ذکر کی ہے کہ سیبویہ حماد بن سلمہ کے پاس حدیث کی یہ عبارت پڑھ رہا تھا 'صعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم الصفاء' یہاں سیبویہ نے الصفا کے بجائے الصفاء (ہمزہ کے ساتھ) پڑھ دیا۔ استاد نے کہا او فارسی بچے۔ صفاء مت پڑھو۔ صفا پڑھو کیونکہ یہ الف مقصورہ ہے۔ اس کے بعد سیبویہ کلاس سے باہر آیا۔ قلم کو توڑا اور قسم کھائی کہ ''جب تک مجھے عربی پر دسترس حاصل نہیں ہو جاتی میں کچھ نہیں لکھوں گا'' (دیکھیے مجالس العلماء، از زجاجی ص 118)

اس کے بعد سیبویہ عربی کے سب سے مشہور عالم خلیل بن احمد فراہیدی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے علم نحو کی تحصیل شروع کی۔ سائے کی طرح ان کی مجلس میں رہتا۔ ان کی خدمت کرتا اور ان سے ان کا علم حاصل کرتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سیبویہ نے خلیل بن احمد سے اپنے استاد حماد بن سلمہ کے ساتھ ہوئے واقعے کا ذکر کیا تو خلیل نے کہا کہ حماد نے درست فرمایا (دیکھیے معجم الادباء 3/ 1199) حماد بن سلمہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر کوئی شخص علم حدیث حاصل کرتا ہے اور اسے نحو کی معلومات نہیں تو وہ ایسے گدھے کی طرح ہے جس کی پشت پر ایسا گھڑا رکھا ہوا ہو جس میں جو نہ ہو'' (معجم الادباء 3/ 1199)

خلیل بن احمد فراہیدی کے علاوہ سیبویہ نے اپنے زمانے کے مشہور علمائے نحو یونس بن حبیب، یعقوب حضرمی، عیسی بن عمر ثقفی، ابو زید انصاری اور اخفش اکبر وغیرہ سے بھی صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن اس کی شخصیت اور علم پر خلیل بن احمد کے سب سے زیادہ اثرات مرتب ہوئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خلیل کو بھی اس کی صحبت اچھی لگتی تھی۔ اس کے ساتھ وہ کبھی بوریت کا شکار نہیں ہوتا تھا (انباہ الرواۃ 2/ 352) ابن نطاح کا بیان ہے کہ میں خلیل بن احمد کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں سیبویہ آ گیا۔ خلیل نے کہا مرحبا بزائر لا یُمَل (یعنی ایسے شخص کا استقبال ہے جس کی صحبت سے بوریت نہیں ہوتی) ابو عمر مخزومی کہتے ہیں کہ خلیل بن احمد یہ بات صرف اور صرف سیبویہ کے لیے کہا کرتے تھے۔ (دیکھیے انباہ الرواۃ 2/ 352)

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ سیبویہ نے اس قدر جہد مسلسل سے تعلیم حاصل کی کہ وہ اپنے استاد کی طرح علم نحو وصرف کا امام بن گیا اور اس نے فن میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کو علم صرف ونحو میں پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے سیبویہ کے استاد عیسی بن عمر ثقفی (وفات 149ھ) کی دو کتابوں 'الکامل' اور 'الجامع' کا ذکر ملتا ہے (دیکھیے سیبویہ حیاتہ وکتابہ ص 12) اور کہا جاتا ہے کہ جب عیسی بن عمر کے بعد خلیل بن احمد کے پاس سیبویہ علم حاصل کرنے آیا تو اس نے اس سے عیسی بن عمر کی کتابوں کے بارے میں پوچھا۔ سیبویہ نے کہا کہ اس نے ستر سے زیادہ کتابیں لکھیں، بعض لوگوں نے انھیں جمع بھی کیا تھا لیکن کسی سانحے میں یہ ساری کتابیں ختم ہو گئیں۔ 'الجامع اور الکامل' کے علاوہ اس کی کوئی اور کتاب نہیں باقی بچی۔ (دیکھیے انباء الرواۃ ص 347) الکتاب کے محقق ڈاکٹر محمد کاظم بکاء لکھتے ہیں ''لیکن چونکہ ان دونوں کتابوں میں نحو کے مکمل مسائل کو جمع نہیں کیا گیا تھا، اور یہ دونوں کتابیں کسی مکمل میتھاڈولوجی کے تحت نہیں لکھی گئی تھیں اس لیے انھیں باقاعدہ کتاب تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔'' (مقدمہ محقق الکتاب ص 18)

چنانچہ سیبویہ کی کتاب کو نحو کی سب سے پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سیبویہ نے اس کتاب کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ اس لیے اسے 'سیبویہ کی کتاب' کہا جانے لگا۔ امام سیرافی لکھتے ہیں: کہ ''علمائے نحو کے یہاں 'سیبویہ کی کتاب' کی شہرت ومنزلت کی وجہ سے لفظ کتاب بذات خود ایک 'علم' بن گیا تھا۔ چنانچہ اگر بصرہ میں کوئی شخص یہ کہتا کہ میں نے 'کتاب' پڑھی' یا اگر کوئی کہتا کہ ''میں نے نصف کتاب پڑھی'' تو اس سے بغیر کسی تردد اور بغیر کسی شک وشبے کے سیبویہ کی ہی کتاب مراد لی جاتی تھی۔

(اخبار النحویین البصریین از امام سیرافی ص 40، نزہۃ الالباء ص 55)

سیبویہ نے اس قدر جہد مسلسل سے تعلیم حاصل کی کہ وہ اپنے استاد کی طرح علم نحو وصرف کا امام بن گیا اور اس نے فن میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کو علم صرف ونحو میں پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے پہلے ہی رائج روایت کے مطابق 180ھ میں سیبویہ کا انتقال ہو گیا۔ (مقدمہ محقق الکتاب ص 14) اس کے بعد اس کے شاگرد ابو الحسن اخفش نے اس کتاب کو بغیر مقدمے اور بغیر خاتمے کے شائع کیا اور اس کا نام 'الکتاب' رکھا۔ اخفش ہی وہ ہے جو الکتاب کا سب سے پہلا راوی ہے۔ کیونکہ اس نے اس کتاب کو سیبویہ سے پڑھا تھا (اخبار النحویین للسیرافی 40) اور سیبویہ کے انتقال کے بعد لوگوں نے یہ کتاب اخفش سے پڑھی۔ ابو عمرو جرمی اور ابو عثمان مازنی کے بارے میں آتا ہے کہ اخفش الکتاب کا اتنا اچھا تذکرہ کرتا تھا کہ جرمی اور مازنی کو یہ شبہ ہوا کہ اخفش الکتاب کو کہیں اپنے نام منسوب نہ کر لے۔ چنانچہ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا کہ چلو ہم اخفش سے الکتاب کو پڑھتے ہیں۔ پڑھنے کے بعد ہم کہیں گے کہ یہ تو سیبویہ کی کتاب ہے۔ اس کے بعد وہ اس کتاب کو اپنی طرف منسوب نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ انھوں نے اخفش سے کہا کہ آپ ہمیں یہ کتاب پڑھا دیں ہم آپ کو پیسے بھی دیں گے۔ چنانچہ اخفش نے انھیں یہ کتاب پڑھائی (سیبویہ حیاتہ وکتابہ 27) اخفش نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ کسائی اس کے پاس آیا اور اس سے الکتاب پڑھانے کی درخواست کی۔ اس نے اسے الکتاب پڑھایا تو اس نے اسے پچاس دینار دیے۔ (اخبار النحویین ص 41)

یوں الکتاب کو علم نحو کی سب سے پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ بعض علما کا کہنا ہے کہ جب کہیں بھی 'الکتاب' لکھا جائے تو اس سے 'ذلک الکتاب لاریب فیہ' کی روشنی میں یا تو قرآن کریم مراد ہو گی یا پھر سیبویہ کی الکتاب۔

اس کتاب کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابو الطیب لغوی نے اسے 'نحو کا قرآن' کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ (دیکھیے مراتب النحویین ص 65) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض علما اس کتاب کو قرآن کریم کی طرح ہر پندرہ دن پر ختم کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ (دیکھیے بغیۃ الوعاۃ 2/ 59) اخفش کے شاگرد اور مشہور ماہر نحو ابو عثمان مازنی کہتے ہیں کہ سیبویہ کی 'الکتاب' کے بعد علم نحو میں کتاب لکھنے کا ارادہ کرنے والے کو شرم آنی چاہیے۔ (اخبار النحویین ص 40) ابراہیم بن مسعود بن حسان کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اندھے تھے مگر بڑے قوی الحافظہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے 'کتاب سیبویہ' پوری یاد کر لی تھی (دیکھیے معجم الادباء 1/ 127) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مشہور نحوی مبرد الکتاب کا سب سے بڑا عالم تھا۔ اس نے اس کتاب کو بہت سارے علما سے پڑھا تھا (معجم الادباء 1/ 206) جب کوئی شخص اس کتاب کو پڑھنے کا ارادہ کرتا تو مبرد اس سے پوچھتا کیا تم نے کبھی سمندروں کی شناوری کی ہے؟ یعنی وہ اسے سمندر سے تعبیر کرتا تھا۔ (اخبار النحویین ص 40) عباسی دور کے مشہور ادیب جاحظ نے ایک بار محمد بن عبد الملک بن مروان کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کرنا چاہا تو اس نے اسے سیبویہ کی 'الکتاب' ہدیہ کیا۔ محمد نے کہا قسم ہے تم نے میری سب سے محبوب چیز مجھے ہدیے میں دی۔''

جب سیبویہ کی کتاب بے انتہا مشہور ہو گئی تو سیبویہ کے استاد ابو زید انصاری سیبویہ کا ذکر کر کے فخر کرتے تھے

اور کہتے تھے کہ سیبویہ جب میری مجلس میں آتا تھا تو اتنا چھوٹا بچہ تھا کہ اس کے سر میں دو چوٹیاں ہوتی تھیں۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ جب سیبویہ یہ کہے کہ مجھے ایسے شخص نے بیان کیا جس کی عربی دانی پر مجھے فخر ہے تو سمجھو کہ وہ مجھے ہی مراد لے رہا ہے۔ (طبقات النحویین 67)

سیبویہ کی یہ کتاب عصر حاضر میں عالم محبوبیت میں رہی یہاں تک کہ پیرس میں واقع مشرقی زبانوں کے خصوصی اسکول میں عربی زبان کے استاد فرانسیسی مستشرق ہرٹویگ ڈیرنبرگ (Hertuig Derenbourg) نے 1867 میں اس کتاب کی تصحیح کی اور 1881 میں اس کا پہلا حصہ شائع کیا۔ اس کے آٹھ سال بعد 1889 میں اس کا دوسرا حصہ شائع کیا۔ پہلے ایڈیشن کا دوسرا ایڈیشن کلکتہ میں 1887 میں کبیر الدین احمد کی تصحیح کے ساتھ شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کا ایک نسخہ دار الکتب المصریہ میں بھی 947 نمبر کے تحت موجود ہے۔ اس کے بعد کنجس برگ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر گوسٹو جون نے ڈیرنبرگ کے تحقیق والے نسخے کا ترجمہ کرکے 1900 میں اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا۔ اس کے بعد بولاق پریس نے اس کا چوتھا ایڈیشن شائع کیا۔ بروکلمین نے اس نسخے کو کتاب کا سب سے درست نسخہ تسلیم کیا ہے۔ اس کے بعد قاسم الجرب نے اس کا پانچواں ایڈیشن شائع کیا۔ اور پھر اس کے بعد مشہور محقق عبدالسلام محمد ہارون اس کتاب کی تحقیق کرکے نئے سرے سے اس کتاب کو چار حصوں میں 1966 میں شائع کیا۔ (دیکھیے مقدمۃ الکتاب از ڈاکٹر محمد کاظم بکا، 36-35)

عبدالسلام ہارون کے بعد عراق کے مشہور ماہر نحو ڈاکٹر محمد کاظم بکاء نے مختلف مخطوطوں کی روشنی میں اس کی نئی تحقیق کے ساتھ کتاب کو نئے انداز میں پانچ جلدوں میں شائع کیا۔ اس کتاب کی تحقیق واشاعت میں ڈاکٹر بکاء کو پچیس برس سے زائد عرصہ لگا۔ لیکن انھوں نے اس کتاب کو نئے سرے سے ابواب کے مطابق مرتب کیا۔ واضح ہو کہ سیبویہ نے اپنی اس کتاب کو ابواب پر مرتب نہیں کیا تھا۔ جب کہ بعد کے نحوی ابواب نحو کو مرفوعات، منصوبات اور مجرورات کے حساب سے مرتب کرتے ہیں لیکن الکتاب اس ترتیب سے نہیں لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر بکاء نے الکتاب کے منہج کا مطالعہ کرکے اسے ابواب پر مرتب کیا تاکہ کتاب سے تکرار کو ختم کیا جاسکے اور پڑھنے والے کے لیے آسانی بھی فراہم ہوجائے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار سیبویہ کوفہ آیا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی کسی ذاتی ضرورت کے تحت آیا تھا۔ بعض علما نے لکھا ہے مالی مشکلات کی وجہ سے وہ کوفہ آیا تھا۔ ہارون رشید کے وزیر یحیی برمکی کے یہاں حاضر ہوا تو اس نے بڑی خاطر مدارات کی۔ پھر یوں ہوا کہ سیبویہ اور کسائی کے درمیان مناظرہ طے پاگیا۔ مناظرے کا وقت اور مقام طے پاگیا۔ علم وادب کے ماہرین اکٹھا ہوگئے۔ سیبویہ اور کسائی ایک دوسرے کے سامنے آئے تو کسائی نے پوچھا آپ سوال پوچھیں گے کہ میں پوچھوں؟ سیبویہ نے کہا آپ ہی پوچھیں۔

کسائی نے کہا: ایک جملہ ہے۔ "قد کنت اظنُّ انَّ العقربَ اشدّ لسعةً مِنَ الزنبور فاذا هُو هَي، أو فاذا هو اياها؟ يعني اس جملے میں فاذا هُو هَي، (مرفوع) درست ہے یا فاذا هُو اياها (منصوب)

سیبویہ نے کہا: فاذا هُو هَي۔

کسائی نے کہا غلط۔ رفع اور نصب دونوں جائز ہیں۔

کسائی نے کہا: خرجت فاذا عبد الله القائمُ (بالرفع) او القائمَ (بالنصب) درست ہے؟

سیبویہ نے کہا: القائمُ یعنی بالرفع۔

اب دونوں نے اس مسئلے پر بڑی مدلل بحث کی۔ لوگ ان کے بحث ومباحثے کو دیکھ کر حیران تھے۔ فیصلہ مشکل تھا کہ کیا کیا جائے۔ دونوں ہی علم نحو کے امام تھے۔ اب اماموں ہی میں ٹھن گئی تو فیصلہ کون کرے کہ کس کی رائے درست ہے۔ کسائی نے کہا کہ یہ بادیہ کے عرب ہیں۔ جو فصیح زبان کے ماہر ہیں۔ آپ ان سے پوچھ لیجیے۔ برمکی نے ابوزیاد، ابوفقعس، ابوزیاد، ابوالجراح اور ابوثروان نامی خالص اعرابیوں کو حاضر کیا۔ ان سے اس مسئلے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کسائی کی رائے کو درست قرار دیا۔

کہا جاتا ہے کہ سیبویہ نے ان سے کہا کہ ذرا اپنی زبان سے تو بول کر دکھاؤ اور کہو: فاذا هُو هَي یا فاذا هُو اياها۔ جب انھوں نے کوشش کی تو انھوں نے فاذا هُو هَي کہا اور فاذا هُو اياها نہیں کہہ سکے۔ کیونکہ سیبویہ ہی کی رائے درست تھی۔ قرآن کریم میں بھی "فاذا هی حيةٌ تسعى" رفع کے ساتھ وارد ہوا ہے۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس مسئلے میں سیاست نے چال چلی۔ کیونکہ کسائی نے ان اعرابیوں کو اپنی طرف مائل کرلیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے حق میں فیصلہ دیا جائے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے کسائی کے حق میں فیصلہ دیا۔ اور برمکی نے کسائی کو سیبویہ پر فتحیاب قرار دیا۔

اس فیصلے پر سیبویہ خاموش ہوگیا۔ جب کہ سیبویہ کی رائے زیادہ درست تھی۔ کسائی نے یحیی برمکی سے کہا سیبویہ بہت دور سے آیا ہے۔ آپ اسے انعام سے نوازیں۔

جب سیبویہ کی کتاب بے انتہا مشہور ہوگئی تو سیبویہ کے استاد ابو زید انصاری سیبویہ کا ذکر کرکے فخر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ سیبویہ جب میری مجلس میں آتا تھا تو اتنا چھوٹا بچہ تھا کہ اس کے سر میں دو چوٹیاں ہوتی تھیں۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ جب سیبویہ یہ کہے کہ مجھے ایسے شخص نے بیان کیا جس کی عربی دانی پر مجھے فخر ہے تو سمجھو کہ وہ مجھے ہی مراد لے رہا ہے۔

یحیی برمکی نے سیبویہ کو دس ہزار درہم انعام دیے۔ (دیکھیے: الانصاف فی مسائل الخلاف 2 / 702، مغنی اللبیب 1 / 93)

اس فیصلے سے سیبویہ کو بے انتہا غم لاحق ہوا۔ وہ بڑا دکھی ہوا۔ بصرہ جانے کے بجائے اس نے فارس کا رخ کیا۔ وہاں قیام کیا یہاں تک کہ اسی غم میں بتیس سال کی عمر میں عنفوان شباب ہی میں انتقال کرگیا۔ یہ مسئلہ نحو کی کتابوں میں مسئلہ زنبوریہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس پر کتابیں لکھی گئی ہیں اور بڑی عالمانہ بحثیں کی گئی ہیں۔

ماخذ

ابنیۃ الصرف فی کتاب سیبویہ، دکتورہ خدیجہ حدیثی، منشورات مکتبۃ النہضۃ بغداد 1385ھ/ 1965
اخبار النحویین البصریین، ابوسعید السیرافی (وفات 368ھ) تحقیق محمد زینی وعبدالمنعم خفاجی، ط مصطفی البابی الحلبی 1373ھ/ 1966
انباہ الرواۃ علی انباہ النحاۃ، جمال الدین ابوالحسن القفطی، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم، دار الفکر العربی، موسسۃ الکتب الثقافیۃ بیروت، 1406ھ/ 1986
بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ، جلال الدین سیوطی (وفات 911ھ) تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، المکتبۃ العصریہ صیدا لبنان،
سیبویہ حیاتہ وکتابہ، احمد احمد بدوی، موسسۃ ہنداوی، المملکۃ المتحدۃ 2019
طبقات اللغویین والنحویین، ابوبکر الاشبیلی (وفات 379ھ) تحقیق ابو الفضل ابراہیم، ط2، مکتبۃ دار المعارف مصر
مجالس العلماء، ابو القاسم الزجاجی (337ھ)، تحقیق عبد السلام محمد ہارون، مکتبۃ الخانجی قاہرہ، ط2
معجم الادباء، یاقوت الحموی (وفات 626ھ) تحقیق احسان عباس، دار الغرب الاسلامی بیروت، ط1، 1414ھ/ 1993
مقدمۃ الکتاب از ڈاکٹر محمد کاظم بکاء، دار الرسالۃ العالمیۃ دمشق 2018
نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء، ابن الانباری (577ھ) تحقیق ابراہیم السامرائی، مکتبۃ المنار، اردن، ط 1985
وفیات الاعیان، تحقیق دار صادر بیروت

Dr. Shams Kamal Anjum
Head, Dept. of Arabic Dhanore
Rajouri- 185234 (J&K) Mob.: 09086180380

فیصل نذیر

معلقاتی شاعری مستند یا مسترد؟

معلقاتی شاعری زمانہ جاہلیت کی وہ عربی شاعری ہے جسے بازارِ عکاظ میں انتخاب کے بعد دیوار کعبہ پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ معلقات کے شعرا کی تعداد میں اختلاف ہے، کچھ لوگ اس میں سات شعرا کو شامل کرتے ہیں اور کچھ دس کو، کچھ مزید شعرا کو بھی اس گروپ میں شامل مانتے ہیں۔ عرصہ دراز تک اس دور میں کہے گئے اشعار اور شعرا کو دنیا مکمل اور مستند مانتی اور معتبر سمجھتی رہی لیکن بعد میں اصمعی (740-828) نے کچھ معلقاتی اشعار پر شک کا اظہار کیا اور پھر ابن سلام الجمحی (767-846) نے 'طبقات فحول الشعرا' لکھ کر تمام شاعروں کے طبقات مقرر کردیے اور ان کو دس باب میں منقسم کر دیا اور کچھ شاعروں کو شک کے دائرے میں کھڑا کر دیا۔ ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلے سیرت لکھنے والے ابن اسحاق (704-767) کو بھی متہم مانا کہ انھوں نے روایات اور اشعار بلا تحقیق جمع کر دیے۔ واضح رہے کہ ابن اسحاق کی سیرت کو بعد میں ابن ہشام نے تحقیق و تخریج کے بعد از سر نو شائع کیا، جب ابن اسحاق سے پوچھا گیا کہ آپ نے روایات میں اشعار کہیں سے بھی اور کچھ بھی سن کر جمع کیوں کر دیے؟ تو ان کا جواب تھا اشعار کا علم مجھے نہیں ہے؛ مجھے جو دیا جاتا ہے میں محض جمع کر دیتا ہوں۔ ابن اسحاق نے حضرت آدم علیہ السلام کے اشعار تک نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو حضرت آدم اس وقت ہندوستان میں تھے اور جب انھیں معلوم ہوا تو انھوں نے اشعار کہے حالانکہ مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت آدم کی زبان عربی نہیں تھی۔

اس درمیان کئی مستشرقین اور ادیبوں نے قدرے شک کا اظہار کیا لیکن اصل تنازع تب شروع ہوا جب مستشرق مرغلیوث (David Samuel Margoliouth, 1858-1940) جو کہ آکسفورڈ میں عربی زبان کے پروفیسر تھے، نے یہ کہا کہ زمانہ جاہلیت کی مکمل شاعری غیر معتبر ہے اور انھوں نے ایک مضمون لکھا Origin of the Arabic poetry جس میں جاہلی دور کی تمام شاعری کی صحت پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ عربی ادیبوں کی نظر میں یہ مضمون عربی ترجمہ 'جذور الشعر العربی' کے بعد آیا اور لوگوں میں اضطراب کی کیفیت طاری ہوگئی، اس کے ایک سال بعد مشہور مصری ادیب اور وزیر تعلیم طہ حسین نے بھی اس بات کا اقرار کیا کہ زمانہ جاہلیت کی شاعری ساری کی ساری بعد میں زمانہ اسلام اور اموی وعباسی دور میں لکھی گئی ہے، اسے جاہلی شعرا کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ طہ حسین نے کئی دلیلیں بھی دیں؛ دراصل طہ حسین تحقیق کے معاملے میں مشہور فرانسیسی فلسفی رینے دیکارٹ (1596-1650) کے منہج کو مانتے ہیں۔ دیکارٹ کا مشہور فلسفہ ہے (میں سوچتا ہوں اسی لیے میرا وجود ہے)، یعنی وہ ہر چیز میں پہلے شک کرتے ہیں۔ پھر اس کی تحقیق کرتے ہوئے اصل تک پہنچتے ہیں، اس منہج کو (Methods of Doubts) کہتے ہیں۔ یعنی وہ شک کو تحقیق اور اصل تک پہنچنے کا ذریعہ مانتے ہیں؛ جیسے پی ایچ ڈی کرنے سے قبل بھی ہم لوگ ایک مفروضہ طے کرتے ہیں پھر اپنی تحقیق کی روشنی میں اس مفروضے کو یا تو درست ثابت کرتے ہیں یا غلط، بالکل ایسے ہی اس منہج میں بھی ہے۔ اور طہ حسین نے چونکہ فرانس میں تعلیم حاصل کی اور اپنی دوسری پی ایچ ڈی وہاں سے مکمل کی اس لیے وہ کچھ حد تک مغرب سے متاثر بھی ہوگئے تھے۔ شعر جاہلی کا انکار کرنے والوں کے پاس بھی مکمل دلیل ہے ان کا ماننا ہے کہ بہت سارے ایسے شعرا ہیں جنھوں نے بعد میں بذات خود اقرار کیا کہ ہم نے خود سے اشعار وضع کر کے معلقاتی شعرا یا زمانہ جاہلیت کے دیگر مشہور شعرا کی طرف منسوب کر دیا۔

طہ حسین کا ماننا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جس طرح کا معاشرہ تھا اور قرآن کریم جس طرح اس کی عکاسی کرتا ہے؛ شعر جاہلی اس کے برعکس تصویر پیش کرتا ہے۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اہل عرب بات بات پر لڑ جاتے تھے پھر نسلوں تک یہ جنگ چلتی رہتی تھی، وہ بچیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے، حماقت و جہالت میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا، مگر جب ہم شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی تصویر ایک مہذب، بہادر اور سخی قوم کے طور پر ابھرتی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے بھی اپنے مسدس میں اس کو انتہائی حسین اور دلکش پیرائے میں اس طرح بیان کیا ہے۔

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ
ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

ایسے ہی قرآن کریم کی تلاوت میں لہجوں کا اختلاف ہے اسے 'سبعۃ احرف' پر نازل کیا گیا ہے، لیکن اگر کوئی ساری جاہلی شاعری کا مطالعہ کر جائے تو بھی اس میں لہجے کا اختلاف پتہ نہیں چلتا جو کہ شک کی گنجائش پیدا کر دیتا ہے۔ طہ حسین کا یہ بھی ماننا ہے کہ زمانہ جاہلیت کی شاعری اس وقت کے معاشرے کی عکاسی نہیں کرتی ہے، جس طرح کی زبان موضوعات اور الفاظ و کنایات، استعارات و تشبیہات وتمثیلات استعمال کی گئی ہیں ان میں یکسانیت و مجانست ہے، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بعد میں لکھی گئی ہے اور منحول (Plagiarized) ہے۔

لیکن ان سب کے بیچ اردن سے تعلق رکھنے والے ادیب ناصر الدین الاسد جو بعد میں وہاں کے وزیر تعلیم بھی بنے اور ان کے علمی کارناموں کے اعتراف میں انہیں حکومت سعودی عرب کی جانب سے 'عالمی شاہ فیصل ایوارڈ' سے بھی سرفراز کیا گیا۔ انھوں نے شوقی ضیف کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی اور طہ حسین جو کہ ان کے استاد تھے ان کے اعتراضات کا سیر حاصل جواب دیا اور بعد میں اسے ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا جس کا نام ہے 'مصادر الشعر الجاهلی وقیمتها التاریخیة' اس کتاب نے دنیا کی آنکھیں کھول دیں اور تمام مستشرقین کے سوالوں کا بھر پور جواب دیا۔ طہ حسین نے بھی اپنے شاگرد کی اس محنت کو سراہا اور اقرار کیا کہ کچھ اشعار میں شک کی گنجائش ہوسکتی ہے مگر مکمل اشعار کو کالعدم قرار دینا ایک طرح کی زیادتی اور علمی دیانت داری کے خلاف ہوگا۔

اس درمیان طہ حسین کے خلاف احتجاج کا بازار بھی

گرم رہا، اوران کے رد میں کتابوں کے انبار لگ گئے، ان پر کیس درج کیا گیا کچھ لوگوں کا ماننا تھا کہ قرآن کریم شعرا کے رد میں آسمانی معجزے کے طور پر نازل کیا گیا ہے اور بعض علما نے یہ بھی کہا کہ اگر قرآن کے کسی لفظ کی تشریح و استعمال میں شک ہوتو اسے جاہلی شاعری میں تلاش کرو کیونکہ وہ لفظ اس وقت کے تقاضے کے اعتبار سے مستعمل ہوگا، لہٰذا اگر ہم جاہلی شاعری میں شک کرتے ہیں تو قرآن پر شک لازم آئے گا اور اس طرح طہٰ حسین کو گالیاں دی گئیں، ان کو موردِالزام ٹھہرایا گیا آخیر میں طہٰ حسین کا ماننا تھا جو کچھ انھوں نے کہا تھا وہ محض تحقیق کا ایک طریقہ اور ذریعہ ہے۔

طہٰ حسین اور مستشرق مرغلیوث کا کہنا ہے کہ زمانہ جاہلیت کی شاعری جعلی اور فرضی ہے۔بعض لوگوں نے شاعری کا اختراع کیا اور پھر اس کا غلط انتساب اس لیے کیا تھا تا کہ اپنے قبیلے کی برتری اور اس کی فوقیت کو ثابت کر سکیں اور بعض نے ایسا اس لیے کیا تا کہ ان کا شعر مشہور ہو سکے، اور بعض نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ کسی قبیلے کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔طہٰ حسین اور مرغلیوث کے موقف میں تھوڑا سا فرق ہے مرغلیوث کا ماننا ہے کہ اسلام سے پہلے شاعری کا وجود ہی نہیں تھا جو کہ اپنے آپ میں غلط ہے کیونکہ اسلام جس زمانے میں آیا اس زمانے میں شاعری کا ہی بول بالا تھا جس کے رد میں خدا نے قرآن کریم کو نازل کیا، اور ایک سورۃ کا نام بھی 'الشعرا ' ہے۔طہٰ حسین کا ماننا یہ ہے کہ اسلام سے پہلے شاعری تھی لیکن ہم جسے زمانہ جاہلیت کی شاعری کہتے ہیں وہ شاعری اس دور کی نہیں ہے بلکہ بعد میں لکھی گئی ہے۔اور بہت سارے راویوں نے اس بات کو خود مانا اور اقرار کیا ہے کہ ہم خود سے شاعری کرتے تھے اور اسے معلقاتی شعرا کی شاعری میں گھسا دیتے تھے، اور لوگ اسے مان بھی لیتے تھے، حماد الراویہ، مفضل الضبی، عمرابن العلا، خلف الاحمر، جناد وغیرہ نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے۔

زمانہ جاہلیت کی شاعری پر اعتراض کرنے والوں کا یہ کہنا ہے کے امرؤ القیس کی شاعری میں مشہور جنگ جو کہ چالیس سال تک چلی 'حرب بسوس' کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ناصر الدین کہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ شاعر اپنے کلام میں اس وقت ہو رہے تمام تاریخی واقعات کا ذکر کرے۔شاعری جذبات و احساسات کو قلم بند کرنے کا نام ہے نہ کہ تاریخی واقعات اور حوادث کو ذکر کرنے کا، یہ کام مؤرخین کا ہے نہ کہ شاعروں اور ادیبوں کا۔ جیسے کہ موجودہ تناظر میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ غالب کی اشعار میں ضروری نہیں کہ 1857 کی جنگ کا صراحتاً ذکر ہو۔ معلقاتی شاعری پر اعتراض کرتے ہوئے طہٰ حسین کہتے ہیں کہ اشعار تقریباً ایک ہی طریقے کے ہیں، زبان ایک ہی طریقے سے استعمال کی گئی ہے، جبکہ قبیلوں کے لہجے الگ الگ ہوتے تھے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ناصر الدین کہتے ہیں ہر قبیلے کے لہجے چاہے الگ ہوں مگر اسلام آنے سے قبل بازار عکاظ میں تمام لوگوں کا فصیح عربی زبان اور قریشی لہجے کے استعمال پر اتفاق ہو گیا تھا۔اور چاہے ایک شخص گاؤں دیہات میں بیٹھا ہو یا شہر میں یا کسی بھی علاقے کا رہنے والا ہو، شاعری میں اعلی درجے کی زبان استعمال کرے گا۔اور شاعری کے جو بحور و اوزان ہیں اس میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، لہٰذا اس طرح کا اعتراض زمانہ جاہلیت کی شاعری پر کرنا صحیح نہیں ہے۔

بعد میں لوگوں نے کچھ اشعار خود سے بڑھا کر ان کا انتساب معلقاتی شعرا کی طرف کر دیا لیکن ایسے لوگوں کو پہچانا جا چکا ہے اور ان اشعار کی نشاندہی کی جا چکی ہے، لہٰذا زیادہ تر شاعری محفوظ ہے اور زمانہ جاہلیت کی ہی ہے۔ایک اعتراض شعر جاہلی پر یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں تو سورہ روم میں ہمیں پتہ چلتا ہے اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے''الف لام میم، رومیوں کو شکست ہوگئی، اور کچھ سالوں کے بعد رومیوں کو فتح ملے گی اور پھر مومنین خوش ہوں گے''(روم۔۱)۔اس سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ زمانہ جاہلی میں عرب کا باہر کی دنیا سے ربط تھا اور اہلِ روم اس وقت مسلمان نہیں تھے مگر اہل کتاب اور مومنوں کے حلیف ہونے کی وجہ سے دونوں میں ایک ربط و ہمدردی تھی۔تو پتہ چلا کہ اہل عرب باہر کی دنیا سے متصل تھے، باہر کے سیاسی احوال کی خبر تھی۔لیکن جب ہم زمانہ جاہلیت کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ تمام لوگ آپس میں مست تھے؛ باہر سے کوئی ربط ہی نہیں تھا؛ کہیں ان کا کوئی آنا جانا نہیں تھا؛ حالانکہ قرآن کریم ''شتاء اور صیف کی رحلت'' کو بیان کرتا ہے لیکن شاعری میں اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔اور ایسا لگتا ہے کہ وہ بس کھلے میدان اور چاندنی راتوں میں اپنا خیمہ گاڑتے شراب پیتے تھے اور عیاشی کرتے، آپسی جنگوں میں حصہ لیتے قتل و غارت گری میں مہارت دکھاتے، لیکن باہر کی دنیا سے ان کا کوئی ربط نہیں تھا۔اس کے جواب میں ناصر الدین کہتے ہیں کہ یہ کہنا غلط ہے، نابغہ ذبیانی زیادہ تر باہر کے بادشاہ سے ملتے تھے، اسی لیے ان کی شاعری میں قدرے اجنبی، عجمی اور غیر عربی الفاظ کی بھر مار ہے، اور امرؤ القیس اپنے مشہور قصیدے 'قفا نبک' میں محبوبہ کی رحلت پر اور گھر کی ویرانی کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تَری بَعَرَالآرَ آم في عَرَصاتها
وقیعانها کأنه حبّ فلفل

اس میں لفظِ فلفل لال مرچ کے معنی میں آیا ہے اور لال مرچ عرب میں نہیں ہوتی تھی یہ ہندوستان سے آتی تھی اور جاہلی شاعری میں دیباج، حریر و ریشم کا بھی ذکر ہے جو دمشق اور سیریا سے لایا جاتا تھا لہٰذا یہ دعوی بلا دلیل اور بلا تحقیق ہے۔

طہٰ حسین نے جب اپنی کتاب في الشعر الجاهلي لکھی اور اس میں دور جاہلی کی شاعری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا، جس کے نتیجے میں ان پر سخت اعتراضات کیے گئے تو انھوں نے دو سال بعد 'في الادب الجاهلي' کے نام سے اُسی کتاب کو کچھ ترمیم و حذف کے بعد شائع کیا۔اس میں انھوں نے کچھ سخت جملوں کو ہٹا دیا اور آج کل یہی کتاب موجود ہے، اس وقت ان کو بہت برا بھلا کہا گیا لیکن اگر آپ باریکی سے دیکھیں تو طہٰ حسین جو کر رہے تھے وہ ایک تحقیقی منہج کی بات کر رہے تھے۔

اس موضوع پر کئی اہم کتابیں لکھی گئیں جن میں سب سے اہم تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

(1) 'نمط صعب ونمط مخیف' مصری ادیب محمود محمد شاکر نے یہ کتاب لکھی۔(2) محمد لطفی جمعہ نے 'الشهاب الراصد' کے نام سے طہٰ حسین پر نہایت ہی اہم نقد کیا۔(3) محمد احمد الغمراوی نے 'النقد التحليلي لكتاب في الادب الجاهلي' کے نام سے طہٰ حسین کو حقیقت سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ (4) انور الجندی نے 'محاکمۃ فکر طہٰ حسین' نامی کتاب سے دنیا کو روشناس کرایا اور طہٰ حسن پر نہایت ہی علمی اور ادبی نقد کیا۔

ناصر الدین الاسد نے جو رد کیا وہ نہایت ہی منہجی رد تھا اور دیگر لوگوں (جن میں مصطفیٰ صادق رافعی بھی ہیں جو کہ مصر کے ایک بہت ہی مشہور ادیب ہیں انھوں نے کتاب لکھی ''تحت رایۃ القرآن'') کا رد برائے تحقیر و تذلیل تھا اور زبان بھی نہایت ناشائستہ استعمال کی گئی تھی، اسی وجہ سے ناصر الدین کی اس علمی کاوش کی پذیرائی ہوئی اور انہیں بہت مقبولیت ملی اس ادبی تنازعے کو عربی ادب کی جدید تاریخ میں سب سے بڑے معرکے کے طور پر جانا جاتا ہے۔

مصادر و مراجع:

1 مصادر الشعر الجاهلي وقيمتها الاتاريخيه ناصر الدين الاسد، الأردن
2 في الادب الجاهلي، طہٰ حسین، مصر
3 تحت راية القرآن، مصطفیٰ صادق الرافعي، مصر
4 جدید عربی ادب، شمس کمال انجم، کشمیر
5 تاریخ ادب عربی، پروفیسر خالد الحامدی

■

Faisal Nazir
Research Scholar, Dept of Arabic
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.:9818697294
Email.: faisalnzr40@gmail.com

شمس الاسلام فاروقی

ہنسی کے فائدے

یا تو دیوانہ ہنسے یا تو جسے توفیق دے
ورنہ اس دنیا میں رہ کر مسکرا سکتا ہے کون

موجودہ دور میں عام لوگوں کی زندگی میں مصروفیات، بھاگ دوڑ اور ذہنی تناؤ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ لوگ ہنسنا تک بھول گئے ہیں۔ ایسے تناؤ بھرے حالات میں سائنس کی یہ تحقیق کہ اگر لوگ اپنا کچھ وقت ہنس کر گزار لیں تو ان کا ذہنی تناؤ اور پریشانیاں بڑی حد تک کم ہو سکتی ہیں، کسی نعمت سے کم نہیں لگتی۔ ہنسی دراصل انسانوں کے دکھوں کا بے حد آسان اور بالکل مفت علاج ہے جب کہ ذہنی تناؤ سے پیدا ہونے والے نفسیاتی عوارض کے علاج پر تو بسا اوقات لوگوں کو کثیر رقم خرچ کرنا پڑتی ہے۔ ہنسی بھی یوگا اور مراقبے ہی کی طرح سکون حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے جو ہمارے جسم میں تناؤ سے پیدا ہونے والے تمام منفی اثرات کو ختم کر دیتا ہے۔ قہقہے سکون بخش تو ہوتے ہی ہیں، ساتھ ہی ان سے جسمانی حصوں کی ورزش بھی ہوتی ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ جب وہ صرف مسکراتے ہیں تب ان کے چہرے کی اس مسکراہٹ کے لیے تقریباً 28 عضلات حرکت کرتے ہیں جو ان کے اختیار میں بھی نہیں ہیں۔ ایک عام تجربہ ہے کہ جو لوگ ہمیشہ مسکراتے رہتے ہیں اور ہر کسی سے مسکرا کر ملتے ہیں وہ ہر دل عزیز کہلاتے ہیں اور ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہوتا ہے۔

سائنس تو آج قہقہوں کو دکھوں کا علاج بتا رہی ہے مگر مذہب اسلام نے تو اب سے چودہ سو برس پہلے بھائی سے مسکرا کر ملنے کو صدقے سے تعبیر کیا تھا۔ صدقہ وہ نیکی ہے جو نہ صرف لوگوں کی پریشانیوں اور بلاؤں کو دور کرتی ہے بلکہ ان کی تندرستی اور جان کی بھی ضمانت دیتی ہے۔

ہنسی جسم کے تقریباً تمام نظاموں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہنسنے پر ہمارا جسم مختلف ہارمونس افراز کرتا ہے جو ہمارے دل کو متحرک کر کے قوت بخشتے ہیں۔ اس سے ہمارا تناؤ کم ہوتا ہے، کیلوریز جل جاتی ہیں اور نظام ہضم درست ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہنسنا ایک طرح کی اندرونی کسرت ہے جو جسم کے تمام نظاموں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

کیلیفورنیا کے اسکول آف پبلک ہیلتھ کے ڈاکٹر ایل۔ ایس۔ برک لوما کی تحقیق اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ ہنسنے سے ہمارا مدافعتی نظام متاثر ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہنسنے کے بعد ہمارے خون میں موجود وائٹ بلڈ کارپسلز اور ٹی سیلس جو جراثیم کا خاتمہ کر کے مدافعتی خدمت انجام دیتے ہیں ان کی کارکردگی میں واضح اضافہ ہو جاتا ہے۔

زور دار قہقہہ لگانے کے کئی فائدے ہیں جیسے تناؤ بھرے عضلات کا پرسکون ہو جانا، ہمارے نظام میں آکسیجن کی مقدار میں اضافہ ہونا اور بڑھے ہوئے بلڈ پریشر کا کم ہو جانا۔ بلاشبہ ہنسنے والوں کی زندگی طویل اور خوشگوار ہوتی ہے۔

قہقہے دل اور عصبی نظام کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں بہت کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ ارسطو کا قول ہے کہ قہقہہ دل کی تقویت کے لیے اکسیر ہے۔ ایسے لوگ جن کو دل کا عارضہ لاحق ہونے کا اندیشہ ہو انھیں اس خطرے سے محفوظ رکھنے میں قہقہے لگانا بہت کارآمد طریقۂ علاج ہے۔ قہقہوں سے نہ صرف دوران خون تیز ہو جاتا ہے بلکہ دل کے عضلات کو آکسیجن کی فراہمی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کے ذریعے دل کی کارکردگی بڑھتی ہے، پھیپھڑوں کو زیادہ مقدار میں آکسیجن دستیاب ہوتی ہے اور دماغ کے سیلس اور عصبی نظام کو بھی زیادہ آکسیجن ملنے سے تقویت ملتی ہے۔ ان سب کا مجموعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کا اپنی زندگی کے بارے میں نظریہ ہی تبدیل ہونے لگتا ہے یعنی وہ اپنے آپ کو پہلے کے مقابلے زیادہ خوش اور پرامید محسوس کرنے لگتا ہے۔

زور دار قہقہہ لگانے کے کئی فائدے میں جیسے تناؤ بھرے عضلات کا پرسکون ہوجانا، ہمارے نظام میں آکسیجن کی مقدار میں اضافہ ہونا اور بڑھے ہوئے بلڈ پریشر کا کم ہوجانا۔ بلاشبہ ہنسنے والوں کی زندگی طویل اور خوشگوار ہوتی ہے۔

ہمارے جسم کی شریانوں کو زیادہ صحت مند اور توانا بنانے میں بھی قہقہے اہم رول ادا کرتے ہیں۔ دراصل قہقہوں سے وہ ٹشوز جو شریانوں کا اندرونی استر بناتے ہیں پھیل جاتے ہیں جس کے سبب شریانوں میں زیادہ جگہ پیدا ہو جاتی ہے اور ان میں خون کا بہاؤ پہلے سے بہتر طور پر ہونے لگتا ہے۔ قہقہوں کے ذریعے کم اور زیادہ دونوں طرح کے بلڈ پریشرز کا علاج ممکن ہے۔ بلڈ پریشر

کم کرنے کے ساتھ ذہنی تناؤ اور خون میں کیمیائی ارتکاز بھی کم ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً سکون حاصل ہوتا ہے اور سانسیں گہری ہونے لگتی ہیں اور زیادہ مقدار میں جسم کے ہر ہر سیل میں آکسیجن پہنچنے لگتی ہے۔

قہقہے ہمارے پھیپھڑوں کی صلاحیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ جب کبھی خوب دل کھول کر ہنستے ہیں تو آپ کا پیٹ بھی حرکت کرنے لگتا ہے اور وہ پھیپھڑوں کو دبا کر اس میں سے وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی باہر نکال دیتا ہے جو عموماً نارمل سانس لینے کے عمل میں اندر بچی رہ جاتی ہے۔

قہقہے ہمارے پھیپھڑوں کی صلاحیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ جب کبھی خوب دل کھول کر ہنستے ہیں تو آپ کا پیٹ بھی حرکت کرنے لگتا ہے اور وہ پھیپھڑوں کو دبا کر اس میں سے وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی باہر نکال دیتا ہے جو عموماً نارمل سانس لینے کے عمل میں اندر بچی رہ جاتی ہے۔ اب کیونکہ پھیپھڑے بالکل ہی خالی ہو جاتے ہیں اس لیے وہ جب دوبارہ پھیلتے ہیں تو ان میں زیادہ مقدار میں ہوا اندر بھر جاتی ہے اور اس طرح خون میں زیادہ آکسیجن منتقل ہو پاتی ہے۔ یہ عمل گہری گہری سانسیں لینے کے مترادف ہوتا ہے۔ سانس کے بعض مریضوں کے سینے میں بلغم جمع ہونے سے جکڑن پیدا ہو جاتی ہے مگر دل کھول کے ہنستے وقت اکثر کھانسی آکر اس بلغم کے اخراج کا سبب بنتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دل کھول کر ہنستے وقت ہمارا پورا جسم ہی آکسیجن سے سیراب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر رابرٹ پروائن کہتے ہیں کہ بھرپور قہقہہ ہماری نبض کی رفتار کو بڑھا کر ہمارے تنفس کو تیز کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں جسم کے ہر سیل میں جانے والی آکسیجن کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ اندر جانے والی ہوا جسم اور خون میں زیادہ روانی سے گردش کرتی ہوئی سیلس تک جاتی ہے۔ اس طرح قہقہے ایک قدرتی مسکن کا کام انجام دیتے ہیں۔

ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ کا کہنا ہے کہ مزاح، ہنسی اور قہقہے انسانوں کے تحت الشعور میں موجود خوف، تفکرات، غصہ اور دیگر ذہنی انتشار سے وابستہ جذبات پر قابو پانے میں مددگار ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں تو ڈاکٹرس اپنے مریضوں پر بطور علاج ان کا استعمال بھی کر رہے ہیں۔

ایک بھرپور قہقہہ نہ صرف اندرونی اعضا کی کسرت کرا دیتا ہے بلکہ ذہنی تناؤ کو کم کر کے ممکنہ قلبی دورے سے بھی حفاظت کرتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ قہقہے کے بعد جسم میں جو اتار، چڑھاؤ پیدا ہوتے ہیں وہ کینسر تک کو روکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نیویارک ٹائمس کے سابق ایڈیٹر نارمین کزنس کینسر کے مریض تھے۔ انھوں نے خطرناک ادویا پر قہقہوں کو ترجیح دی اور لاورل ہارڈی کی مزاحیہ فلمیں دیکھنا شروع کر دیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی مضمحل اور پست طبیعت پر قابو پا سکے بلکہ بڑھتے ہوئے کینسر پر بھی روک لگ گئی اور وہ خود کو پہلے کی نسبت زیادہ خوش اور صحت مند محسوس کرنے لگے۔

قہقہے نہ صرف جسمانی اعضا کی کسرت کراتے ہیں بلکہ جسم کے ہر حصے کے تناؤ کو کم کرنے میں بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ وہ کسی مسکن کی طرح جسم کو پرسکون بنا کر اضمحلالی کیفیت کو ختم کرتے ہیں جو اگر قائم رہے تو عموماً

ہنسنا، مسکرانا اور قہقہے لگانا دراصل ایک ایسا بندھن ہے جو لوگوں کو باہم باندھ کر رکھتا ہے۔ آپ چاہیں تو کسی کو بولنے پر مجبور کرسکتے ہیں لیکن ہنسنے اور قہقہے لگانے پر نہیں کیونکہ اس کے لیے تو لوگوں کے مزاج کو بدلنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بہت سے نفسیاتی معالج ہنسی اور قہقہوں کو ان مریضو ںپر آزما رہے ہیں جو زندگی میں یاسیت، ناامیدی، مایوسی، تنہائی پسندی کا شکار ہوں یا ان میں خودکشی کے رجحانات پائے جاتے ہوں۔ ایک مصنف جس نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، لکھتا ہے کہ لوگو ںکی روزمرہ زندگی میں مزاح کا ہونا تین وجوہ سے بہت ضروری ہے۔

مہلک عارضوں کا سبب بنتی ہے۔

قہقہوں سے ان ہارمونس کا اخراج کم ہو جاتا ہے جو جسم میں تھکاوٹ اور تناؤ پیدا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ان سے ہمارا مدافعتی نظام بہتر ہوتا ہے کیونکہ ان سے خون میں امینونوگلوبلنگ یعنی اینٹی بوڈیز اور دیگر اشیا جو جراثیم سے لڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

دردوں سے نجات دلانے میں بھی ہنسنے اور قہقہے لگانے کا ایک اہم رول ہے۔ جب آپ بھرپور قہقہے لگاتے ہیں تب آپ کے دماغ سے اینڈورفن (Endorphine) نامی ایک کیمیائی مادہ افراز ہوتا ہے جو جسم سے درد کو دور کر کے سکون بخشتا ہے۔ ایسا تب ہوتا ہے جب ہمارے بعض متاثر عضلات سے تناؤ دور ہونے پر ہمیں آرام ملتا ہے۔

جب بھی آپ مزاح پڑھتے ہیں سنتے ہیں یا دیکھتے وقت ہنستے ہیں یا پھر کبھی اپنے پسندیدہ شخص سے ملاقات کے وقت خوشی محسوس کرتے ہیں اس وقت آپ کا دماغ سیروٹونن (Serotonine) اور نوراڈرے نیلن (Noradrenaline) نامی کیمیا پیدا کر دیتے ہیں جن سے آپ کے اندر ایک خوشگوار سا احساس پھوٹ پڑتا ہے۔ اس وقت آپ کی طبیعت سے ہر قسم کی اداسی، یاسیت اور گراوٹ دور ہو جاتی ہے اور موڈ میں ایک نیا جوش، ولولہ اور جولانی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہنسنا، مسکرانا اور قہقہے لگانا دراصل ایک ایسا بندھن ہے جو لوگوں کو باہم باندھ کر رکھتا ہے۔ آپ چاہیں تو کسی کو بولنے پر مجبور کر سکتے ہیں لیکن ہنسنے اور قہقہے لگانے پر نہیں کیونکہ اس کے لیے تو لوگوں کے مزاج کو بدلنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بہت سے نفسیاتی معالج ہنسی اور قہقہوں کو ان مریضوں پر آزما رہے ہیں جو زندگی میں یاسیت، ناامیدی، مایوسی، تنہائی پسندی کا شکار ہوں یا ان میں خودکشی کے رجحانات پائے جاتے ہوں۔ ایک مصنف جس نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، لکھتا ہے کہ لوگوں کی روزمرہ زندگی میں مزاح کا ہونا تین وجوہ سے بہت ضروری ہے۔ اول یہ انسانی درد، دکھوں اور تکالیف دور کرنے کا ایک قدرتی طریقہ ہے، دوسرے اس کے ذریعے چھوٹے بڑے تناؤ ختم ہوتے ہیں اور آخری یہ کہ مزاح انسانوں کے سماجی ڈھانچے کو قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

■

Shamsul Islam Farooqui
90-B, Ahata Talib
Noor Nagar, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہو سکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جا سکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں:

➤ editor@ncpul.in ➤ urduduniyancpul@yahoo.co.in

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیا ت کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

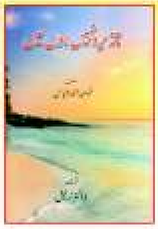

جزیرہ نہیں ہوں میں

مصنف: خواجہ احمد عباس، ترجمہ: ڈاکٹر نریش

صفحات: 669، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: نایاب حسن، نئی دہلی

خواجہ احمد عباس (1987-1914) اردو کے ممتاز صحافی، افسانہ نگار، فلمی ہدایت کار اور مکالمہ نگار تھے۔ ہندوستانی سیاست تحریکِ آزادی اور قائدینِ تحریکِ آزادی سے گہری نظریاتی وعملی وابستگی تھی۔ ان کا خاندان خواجہ الطاف حسین حالی کا خاندان تھا، جس میں ایک سے بڑھ کر ایک اہلِ علم وفضل پیدا ہوئے اور جنھوں نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ہندوستان کی تعمیر وترقی میں غیر معمولی رول ادا کیا۔ خواجہ احمد عباس نے انگریزی اور قانون کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی اور عملی سرگرمیوں کا مرکز ممبئی کو بنایا، جہاں وہ صحافت بھی کرتے رہے اور کچھ دنوں بعد فلم انڈسٹری سے بھی وابستہ ہوئے، خود بھی کئی فلمیں بنائیں اور بہت سی فلموں میں مکالمہ نگاری بھی کی۔ انھیں کئی نیشنل اور ایک انٹرنیشنل ایوارڈ بھی ملا۔ ہندوستانی ادب، فلم، آرٹ اور کلچر کے حوالے سے ان کی شخصیت بڑی ہمہ گیر و ہمہ رنگ تھی، انھیں ان تمام حوالوں سے غیر معمولی احترام اور عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں، مضامین، افسانوں اور ناول کے ذریعے ہندوستانی ادب کو مالا مال کرنے میں بھی قابلِ ذکر کردار ادا کیا۔

خواجہ احمد عباس نے درجنوں افسانے اور کہانیاں لکھیں جو کتابی شکل میں شائع ہوئیں، ان کا ایک ضخیم ناول 'انقلاب' انگریزی، روسی اور اردو میں شائع ہوا۔ 'مسافر کی ڈائری' کے نام سے ان کا سفرنامہ بھی شائع شدہ ہے۔ 'ایک لڑکی'، 'دیا جلے ساری رات'، 'سونے چاندی کے بت'، 'میں کون ہوں'، 'نئی دھرتی نئے آسمان' وغیرہ ان کی کہانیوں اور افسانوں کے مجموعے ہیں۔ خود ان کے بقول انھوں نے اردو، انگریزی اور ہندی میں کل ستر کتابیں لکھیں۔

انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح بھی انگریزی میں تحریر کی تھی، جس کا نام I Am Not An Island رکھا۔ اس کتاب میں انھوں نے شخصی حالات و واقعات، اسفار، ملاقاتوں، محاذ آرائیوں، خوشی اور غم کے لمحات، بیماریوں اور حادثات کا تذکرہ کیا ہے، پھر سنیما سے بطور فلمی تنقید نگار اور صحافی کے طور پر اور پھر بطور اسکرپٹ اور ڈائیلاگ رائٹر، پروڈیوسر اور ہدایتکار کے طور پر اپنی وابستگی کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ یہ کتاب کئی معنوں میں نہایت دلچسپ ہے۔ اس میں نہ صرف خود خواجہ احمد عباس کی زندگی کی کہانی اپنے مختلف رنگوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے بلکہ بیسویں صدی کے کئی اہم اور تاریخی واقعات وسانحات کے حوالے سے بھی اس میں دلچسپ تبصرے، تجزیے، مشاہدے اور خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ چونکہ خواجہ صاحب کا تعلق ہندوستان کے ایک نمایاں خانوادے سے تھا، جس کے اس ملک کے چوٹی کے علمی، سماجی وسیاسی سربراہوں سے راست تعلقات تھے، اس لیے خواجہ احمد عباس نے ہندوستانی سیاست اور سیاست دانوں کے تعلق سے بڑی حتمی اور مشاہدے پر مبنی دلچسپ رائیں ظاہر کی ہیں، ان کی شخصیتوں پر جاندار تبصرے کیے ہیں۔ انھوں نے کئی ملکوں کے اسفار بھی کیے اور وہاں کی تہذیب وثقافت وسیاست کا قریب سے مشاہدہ کیا، سوان کے حوالے سے بھی خواجہ احمد عباس کی رائے خاصی دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ اس خودنوشت میں مصنف نے اپنے تجربات اور شخصیت کو بھی حتی الامکان بغیر کسی لاگ لپیٹ کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، زندگی کے جس موڑ پر کوئی کامیابی حاصل ہوئی اسے بھی بیان کیا اور اگر ناکامی ہاتھ لگی تو اس کا اظہار بھی دیانت داری سے کیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف خواجہ احمد عباس کی بہتر سالہ زندگی کی تفہیم میں معاون ہے، بلکہ ان کے عہد کے قومی و عالمی سیاسی وسماجی حالات سے بھی ایک حد تک آگاہی بخشتی ہے۔ ہندوستانی صحافت، فلم، سیاست اور سماج کے نشیب وفراز سے بھی یہ کتاب ہمیں واقف کرواتی ہے۔

اوریجنل انگریزی خودنوشت کی پہلی اشاعت 1977 میں ہوئی تھی۔ طویل عرصے بعد اس کا اردو ترجمہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے جو خوب صورت، سلیس اور شیریں ہے۔ مترجم ڈاکٹر نریش نے پوری کتاب کا گہرائی سے مطالعہ کرکے اسے اردو زبان ہی نہیں، اردو مزاج ونہاد میں ڈھالنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ کتاب کے مطالعے کے دوران کہیں بھی لفظی الجھاؤ اور بیان واسلوب کی پیچیدگی کا احساس نہیں ہوتا۔ ترجمے میں روانی ہے اور مصنف کے خیالات کو بعینہ اردو زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر نریش نے اس ضخیم کتاب کا شاندار اور قابلِ تحسین ترجمہ کیا ہے۔ ڈاکٹر نریش خود بھی اردو کے ممتاز مصنف اور تخلیق کار ہیں۔ طویل عرصے تک پیشۂ معلّمی سے وابستہ رہے ہیں۔ انھوں نے افسانہ، ناول، شاعری اور تنقید ہر صنف میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے، ان کے متعدد افسانوی مجموعے، ناول، مجموعہ ہائے کلام اور تنقیدی مباحث پر مشتمل کتابیں شائع شدہ اور متداول ہیں۔ ان کی تخلیقات زبان واسلوب کے رچاؤ اور فکر ونظر کے رکھ رکھاؤ کا خوب صورت نمونہ ہوتی ہیں۔ ملٹی لنگول شخصیت کے مالک ہیں ان کے قلم سے ماقبل میں ہندی، انگریزی وپنجابی زبانوں سے کئی کتابوں کے اردو تراجم منظر عام پر آچکے ہیں جو کامیاب رہے اور اصحاب ذوق قارئین نے جنھیں پسند کیا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ خواجہ احمد عباس ایسے عظیم فن کار کی خودنوشت کا ان کے ذریعے کیا گیا یہ ترجمہ بھی ادب وزبان کے شائقین اور خواجہ صاحب کی شخصیت سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے مابین مقبولیت حاصل کرے گا۔

تحقیق و تنقید

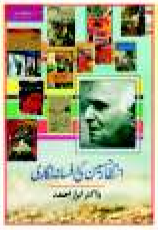

انتظار حسین کی افسانہ نگاری

نام مصنف: ڈاکٹر ابرار احمد

صفحات: 160، قیمت: 200، سنہ اشاعت: 2020

مبصر: تفسیر حسین، D-4/1، فرسٹ فلور، نیئر فردوس مسجد شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

پیش نظر کتاب کے مصنف ڈاکٹر ابرار احمد افسانہ تنقید اور ادب اطفال سے شغف رکھتے ہیں۔ کتاب کے ابواب انتظار حسین کی کہانی کے فن کو سامنے لاتے ہیں۔ انتظار حسین افسانے کے میدان میں ایک اختراع پسند اور عام شاہراہ سے الگ راستے پر چلنے والے افسانہ نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وہ اپنی زبان، بیان اور بیانیہ کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ واقعہ کی ایسی ترتیب قائم کرتے ہیں جو وقت کے محدود دائرے سے نکال کر واقعہ کو مناسبت کی کئی پرتیں اور سمتیں عطا کرتی ہے۔ واقعہ کو قائم کرنے اور اس میں زمانی نسبتوں کی مختلف بُعدیں پیدا کرنے کا انتظار حسین کا طریقہ منفرد ہے۔ کتھا اور کہانی کی قدیم روایت اور قصے کے کلاسیکی سرچشمے سے انتظار حسین کا اکتساب ان کے طرز قصہ نگاری کو ان کے ہم عصروں اور اسلاف کے درمیان ممتاز بناتا ہے۔

کتاب کا پہلا باب بہت مختصر ہے۔ یہ سوانحی کوائف اور تصنیفی تفصیلات پر مشتمل ہے۔

دوسرے باب کا عنوان 'انتظار حسین اور ان کا عہد' ہے۔ یہ باب دو ذیلی عنوانات میں منقسم ہے۔ سیاسی و سماجی صورت حال اور ادبی صورت حال۔ انتظار حسین کی زندگی کے اوائل ایام و تعلیم کے سلسلے سے بات شروع ہوئی ہے اور تقسیم سے پہلے کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔ اس صورت حال میں قومیت و وطنیت کے جو مختلف رویے اور نظریات رائج رہے، ان رویوں نے تقسیم ملک کا راستہ کیسے ہموار کیا اور تقسیم کے عمل نے ادیب کے شعور واحساس کو کیسے متاثر کیا، مصنف نے ان پہلوؤں کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔

ادبی صورت حال میں بھی تقسیم کا مسئلہ ادبی سیاق میں زیر بحث ہے۔ تقسیم کے زیر اثر تین نوع کا ادب تخلیق کیا گیا۔ ایک جذباتیت کا نمائندہ متعصب ادب دوسرا ترقی پسند ادب جو ہر طبقے کے حق میں قصور کی مساوی مقدار ڈالتا ہے اور معاملے کو دو طرفہ برابر رکھتا ہے اور تیسرا ادب جو واقعات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ مصنف نے یہ تینوں پہلو اٹھائے ہیں۔ تقسیم کے زیر اثر لکھا گیا افسانوی ادب بھی سرسری طور پر زیر تذکرہ آیا ہے۔ مجموعی ادبی صورت حال کے انتظار حسین پر مرتب ہونے والے انطباعات کا اخیر میں ذکر ہے۔

تیسرا باب انتظار حسین کے افسانوں کے فکری و فنی تجزیے پر مبنی ہے۔ حسب سابق یہ بھی دو ذیلی عنوان رکھتا ہے۔ فکری تجزیہ: موضوعات و مسائل۔ فنی تجزیہ: فن، اسلوب و زبان اور تکنیک۔

ہجرت و تقسیم کا تجربہ، کھوئے ہوؤں کی جستجو، مشترک اقدار پر مبنی تہذیب کا زیاں کس طرح انتظار کے افسانوں کا موضوع بن کر اپنا جدا ڈھب قائم کرتے ہیں۔ انتظار حسین وجودی اور عرفانی مسائل کے ساتھ محبت، نفرت اور جنس کے جبلی جذبوں کو اپنے فن کے قالب میں کس طرح راہ دیتے ہیں۔ یہ پہلو اول الذکر عنوان کے تحت زیر بحث آئے ہیں۔

ثانی الذکر عنوان فنی جائزے پر مبنی ہے۔ مصنف نے پہلے انتظار حسین کی طرز قصہ گوئی پر بات کی ہے۔ اس کے ارتقائی مدارج بیان کیے ہیں۔ بعد میں انتظار حسین کے افسانوں میں مستعمل مختلف فنی تکنیکوں اور تدبیر کاریوں پر بحث کی ہے۔ کس طرح انتظار حسین کے ابتدائی افسانے حقیقت نگاری سے قریب معلوم ہوتے ہیں اور کیسے ان کے یہاں علامت سے شغف کی صورت پیدا ہوتی ہے اور وہ نئی طرز اختیار کر لیتے ہیں۔؟ اسلوب و زبان کے تحت انتظار حسین کے فن میں موجود فیبل، متھ، حکایات، داستان، تمثیل، علامات، استعارات اور تجرید کے بارے میں بھی گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف نے یہ بتایا ہے کہ انتظار حسین کے یہاں داستانوی اسلوب، قرآنی اسلوب، حدیث کا اسلوب، حکایاتی و ملفوظاتی اسلوب جاتکی اسلوب، دیومالائی اسلوب نام کے مختلف اسالیب موجود ہیں۔ بقول مصنف:

''انتظار حسین کے افسانوں میں اسلوب اور زبان کے اس جائزے سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ انتظار حسین نے جدید تر اسالیب کے تجربے اور اپنی روایت کے امتزاج سے اظہار کے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی ہے جس میں لفظ کی تجرید و تجسیم، اس کے فکری و حسی حوالے اور اس کی علامتیت اور سادہ بیانی کے حدود اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہیں کہ موجودہ تنقیدی اصطلاحات میں سے کوئی بھی اصطلاح ان پر منطبق نہیں ہوتی ہے۔''

تکنیک کی سطح انتظار حسین کے یہاں شعور کی رو، آزاد تلازمۂ خیال، مونتاژ، خود کلامی، خطوط اور ڈائری کی تکنیک، خواب کی تکنیک، فلیش کی تکنیک، داستانوی تکنیک، واقعہ در واقعہ کی تکنیک نامی مختلف تکنیکوں کی نشان دہی کی ہے۔

چوتھے و آخری باب کا عنوان 'انتظار حسین کے افسانوں میں اساطیری و دیومالائی عناصر' ہے۔ اس باب میں پہلے اساطیر کے اردو افسانے میں ورود پر بات کی گئی ہے۔ اسطور کی لفظی و اصطلاحی تعریفات کو مشرقی و مغربی حوالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انتظار حسین کے افسانوں میں اسطور کی کارفرمائی کو اصل متن کی روشنی میں نشان زد کیا گیا ہے۔

یہ کتاب انتظار حسین کے افسانوں پر سیر حاصل گفتگو ہے۔ یہ موضوع بحث شخصیت کے فنی ابعاد کو معروضی انداز میں پیش کرتی ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے مناسب ہے۔ غموض کی جگہ وضاحت، ثقالت کی جگہ سلاست اور مشکل پسندی کی جگہ سہولت اس کتاب کا خاص وصف ہے۔ انتظار حسین کے فن پر مشاہیر کی آرا کے ساتھ ساتھ مصنف زیر بحث کی روشنی میں اپنی باتوں کو محقق کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔

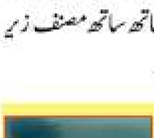

متن اور معنیاتی نظام

مصنف و ناشر: معید الرحمٰن

صفحات: 216، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2020

مبصر: حنیف خان

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم، یونیورسٹی علی گڑھ، یوپی

کسی بھی متن کی تفہیم کے لیے متن اور معنیاتی نظام کی تفہیم قاری کے لیے سب سے پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ ایک ذی شعور قاری متن کی تفہیم کے ساتھ معنیاتی نظام پر بھی غور کرتا ہے کہ تشکیل متن میں معنی کہاں سے پیدا ہوئے ہیں، کن وسائل سے متن کی یہ ہیئت ظہور پذیر ہوئی ہے جو معانی سے مملو یا اس سے مبرا ہے۔ چونکہ ادب کی بنیاد زبان اور اس میں بروئے کار لائے گئے فنی وسائل پر ہے اس لیے سب سے پہلے لسانیاتی نظام و تشکیلات پر غور از حد ضروری ہے، اس کے بغیر کسی بھی فن پارے کے متن کی تفہیم ممکن

نہیں ہے اور شاعری کی تفہیم و تنقید میں اس سے مفر کی کوئی راہ ہی نہیں ہے۔ البتہ غیر شاعری کے لیے متن میں موجود سیاسی، سماجی، نفسیاتی و دیگر نشانات کے توسط سے ان میں پوشیدہ معانی اور اس کی جہات تک رسائی ممکن ہے۔ ڈاکٹر معید الرحمٰن نے اپنی نئی کتاب 'متن اور معنیاتی نظام' میں اپنے پہلے مضمون 'تنقیدی نظریات کیسے وجود میں آتے ہیں' میں شرح و بسط سے گفتگو کی ہے۔ تنقید چونکہ ایک منظم ادبی کارگذاری ہے، اس لیے نقاد منظم ذہن کے ساتھ ہی کسی فن پارے کی تنقید و تحسین اور تعین قدر کا اپنا اساسی فریضہ انجام دے سکتا ہے جس کے لیے کسی نظریے کا ہونا ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظریہ ادب اور سماجیات سے مل کر تشکیل پاتا ہے لیکن یہ چشم زدن میں منصۂ شہود پر نہیں آ جاتا مرور زمانہ اس کو صیقل کرتا ہے، وہ بتدریج مختلف بھٹیوں سے گذر کر سامنے آتا ہے۔ مذکورہ مضمون میں فاضل مصنف نے اس پورے عمل کو بیان کیا ہے۔ ایک باشعور قاری جب کسی فن پارے کی تنقید مختلف زاویوں سے کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے یہی سوال ذہن میں آتا ہے کہ آخر ایک ہی فن پارے کی مختلف نظریات کے تحت قرات کیوں کر ممکن ہے اور ایسا کیسے ہو جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ مضمون مثالوں سے دیتا ہے کہ کسی بھی فن پارے میں موجود ان نشانات کی تلاش و نشان دہی اس کا مرکز قرار پاتی ہے۔ لیکن اس عمل کے لیے پہلے اس نظریہ کے اساسی پہلوؤں سے واقفیت ضروری ہے۔ اس سے متن کا معنیاتی نظام بھی سامنے آتا ہے۔ دراصل معنیات کا تعلق اسی نظریے میں پوشیدہ ہے جس جانب فاضل مصنف نے اشارہ کیا ہے۔

ایک نہایت اہم بحث اس کتاب میں یہ بھی اٹھائی گئی ہے کہ آخر مشرقی و مغربی اصول میں برتری مغربی اصولوں کو کیوں حاصل ہے؟ اردو کے مصنفین بالخصوص ناقدین مشرق کے بجائے مغرب کی جانب کیوں دیکھتے ہیں؟ ان کی نقل میں فخر و انبساط سے کیوں وہ سرشار رہتے ہیں۔ اس کا بہت ہی علمی جواب مصنف نے دیا ہے۔ وہ اس کو مستحسن ضرور تصور کرتے ہیں مگر اس ریشہ دوانی کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے اردو کے مصنفین اس جانب مائل ہوئے اور اپنے تنقیدی و علمی اساس سے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔ دراصل استعماری منصوبہ بندی کے جال میں پھنس کر اردو تنقید کا یہ حال ہوا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے 'سرسید کا اصول تفسیر اور شرحیات کے عنوان سے' ایک علمی مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ یہ تو علمی سبب ہوا اس کا غیر علمی سبب اردو کے ناقدین کا مشرقی اصول نقد سے لاعلمی بھی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لاعلمی اس منصوبے کا ایک حصہ ہے جس سے سرسید، شبلی اور ان کے رفقا واقف تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اس دور کی تنقید کے ایسے شناور تھے جن کی تنقیدی کارگذاری میں مشرقی و مغربی دونوں اصول نقد کے حوالے ملتے ہیں مگر آپ کو وہ مغربیت سے کہیں بھی مرعوب نظر آتے نہیں دکھائی دیں گے۔ ان کی کتاب 'شعر، غیر شعر اور نثر' کو ہی دیکھ لیجیے جگہ جگہ مشرقی حوالے ملیں گے۔ یہ حوالے ان کی علمیت کا ثبوت ہیں۔

اس کتاب میں 18 مضامین شامل ہیں۔ جن میں سے آٹھ مضامین کا تعلق نقد اور اصول نقد سے ہے۔ تنقیدی نظریات کیسے وجود میں آتے ہیں، شبلی اور نئی تنقید، حالی کی عملی تنقید نئی تنقید کے تناظر میں، نیاز فتح پوری کا اصول انتقادیات، سرسید کا اصول تفسیر اور شرحیات، شبلی کی استعمار شناسی، نقد سرور کے مغربی حوالے، اردو ادب کی تشکیل جدید کا مسئلہ۔ ایسے مضامین ہیں جن کے تناظر میں ڈاکٹر معید الرحمٰن کے نظریہ تنقید کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ان مضامین میں نظری مباحث کو جس گہرائی سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے وہ ان کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ مغربی تنقید کی استعماریت پسندی کی جانب اردو کے کتنے ناقدین نے توجہ دی؟ اس جانب کن کن ناقدین نے اشارے کیے اس پر اگر آپ غور کریں تو ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ دور جدید میں نوآبادیاتی تنقید سے متعلق ناصر عباس نیر نظری و اطلاقی مباحث اٹھا رہے ہیں ان کی تحریروں میں کہیں کہیں اشارے ملتے ہیں۔ یا پھر سرسید کی تحریک سے وابستہ ان کے معاصرین کے یہاں یہ روشنی دکھائی دیتی ہے جس میں شبلی سب سے نمایاں ہیں۔

معنیاتی نظام کی گرہ کشائی میں نظری تنقید بطور آلہ اور وسیلہ استعمال ہوتی ہے جس سے متعلق ان کے مذکورہ مضامین کی قرات معلومات دیتی ہے۔ لیکن اطلاقی تنقید کے بغیر نظری تنقید کا منظر نامہ صاف نہیں ہوتا ہے۔ یہ ایسی کارگذاری ہے جس میں ایک ناقد نظریات کا اطلاق کسی متن پر کرتا ہے اور اس کی روشنی میں متن کی قرات کر کے اس کے معنی بیان کرتا ہے۔ ڈاکٹر معید الرحمٰن کی کتاب 'متن اور معنیاتی نظام' میں نظری و اطلاقی دونوں تنقیدیں عملی طور پر موجود ہیں۔ وہ نظری تنقید سے بھی واقف ہیں، اور ان کے اطلاق کا علم بھی انھیں ہے۔ وہ نظری تنقید کو اصول و ضوابط کے مطابق عملی تنقید میں تبدیل کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے مضامین نیر مسعود کی غالب شناسی، تاریخ اور فکشن کے مابین کشاکش، نعمت خانہ ایک فطرت پسند وجودی ناول اور اردو ادب کی تشکیل جدید کا مسئلہ نہایت اہم ہیں۔

یہ مضامین ایک طرف جہاں متن کی تفہیم کر کے اس کے معنیاتی نظام کو بیان کرتے ہیں وہیں قاری کے لیے نئی راہیں بھی کھولتے ہیں۔ ایک متن کی کئی جہات ہوتی ہیں جیسا کہ ڈاکٹر معید الرحمٰن نے مثال کے طور پر کرشن چندر کے افسانہ 'کالو بھنگی' کی تفہیم کی۔ انھوں نے اس افسانے کی تفہیم و تنقید مارکسی تنقید یعنی ترقی پسند اور نفسیاتی تنقید کے تناظر میں کی اور بتایا ہے کہ ایک ہی فن پارہ کس طرح مختلف جہات رکھتا۔

کسی نظریہ کے تحت قرات اور تنقید کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس کی ایک ہی جہت قاری پر کھلتی ہے جب کہ دوسری پردہ خفا میں رہتی ہے۔ نعمت خانہ خالد جاوید کا ایک اہم ناول ہے۔ مختلف ناقدین نے اس کی قرات کی اور مضامین قلم بند کیے مگر ڈاکٹر معید الرحمٰن نے اس کی پابند قرات وجودی نظریہ کے تحت جب کی تو انھوں نے وجودیت کے نشانات کی اس ناول میں تلاش کی اور ان کو سامنے رکھا اس طرح اس کا وجودی پہلو تو سامنے آ گیا مگر اس کے دوسرے ابعاد گرفت سے باہر رہ گئے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر معید الرحمٰن کی کتاب 'متن اور معنیاتی نظام' ایک ایسی کتاب ہے جس کے توسط سے متن کی تفہیم کے در وا ہوتے ہیں اور مروجہ غیر علمی تنقید کے بجائے علمی تنقید کی راہیں کھولتی ہے۔ جس کے لیے میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

خان محبوب طرزی: لکھنؤ کا ایک مقبول ناول نگار

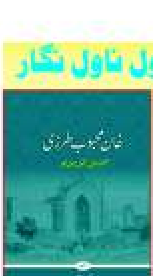

مرتب: ڈاکٹر عمیر منظر

صفحات: 446، قیمت: 425، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: پارکھ بک ڈپو، شاداب مارکیٹ، ٹیگور مارگ، لکھنؤ

مبصر: ڈاکٹر شاہ نواز فیاض

G-41، تھرڈ فلور، گلی نمبر 4، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

خان محبوب طرزی (1959-1910) جاسوسی ناول نگاری کا وہ امین ہے، جسے اب تک درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ فن پارے میں اگر ادبی لطافت ہے تو ایک دن اپنی اہمیت ضرور تسلیم کرائے گا۔ بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں، جو نام و نمود سے دور اپنے کام پر یقین کرتے ہیں۔ وقت بہت بے رحم ہوتا ہے۔ ایک دن آئینہ بن کر لوگوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اردو کے کتنے ہی ایسے شاہ کار کارنامے اب تک پردۂ خفا میں ہیں، جب

دھول کی پرت ہٹے گی تو از خود چمکتا ہوا ہیرا نظر آجائے گا۔ چمکتے ہوئے ہیرے نظر آجائیں گے۔ اگر محققین نے ان پرت میں چھپے فن پاروں کی تلاش نہیں کی ہوتی تو، آج اردو زبان کل کی زبان معلوم ہوتی، لیکن اس طرح کے کام سے جہاں ایک طرف اپنی زبان کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اس تحقیقی رویے کے ذریعے بہت سے شاہ کار کارنامے قارئین کے سامنے پیش کیے گئے۔ کل تک جو نظروں سے اوجھل تھے، آج ہماری زبان کے کلاسیکی سرمایے کا اہم حصہ ہیں۔

خان محبوب طرزی کے کارنامے کو ناقدین فن نے فن کی کسوٹی پر نہیں پرکھا، بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کو پڑھا ہی نہیں گیا۔ دھیرے دھیرے وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔ البتہ 'فروغ اردو' نے ان کا خصوصی شمارہ ضرور شائع کیا تھا، لیکن اس کی اشاعت کو بھی نصف صدی سے زیادہ کا وقفہ گزر گیا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ نئے قارئین کے سامنے ان کا ایک جامع تعارف پیش کیا جائے، تاکہ قارئین ان کی فنی خوبیوں اور تخلیقی ہنرمندیوں سے مستفیض ہوسکیں۔ خان محبوب طرزی نے جاسوسی ناول کے علاوہ سماجی ناول بھی لکھے ہیں؛ ساتھ ہی ساتھ ترجمہ کے ذریعے بہت سے فن پاروں سے انھوں نے اردو قارئین کو متعارف کرایا۔ ڈاکٹر عمیر منظر کی نئی کتاب 'خان محبوب طرزی: لکھنؤ کا ایک مقبول ناول نگار' خان طرزی کا جامع تعارف اور ان کے کارنامے کو محیط ہے۔

'خان محبوب طرزی: لکھنؤ کا ایک مقبول ناول نگار' میں مرتب کتاب نے بہت خوبی سے ایک ایسے ناول نگار کو عام لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے، جسے بھلا دیا گیا تھا۔ مذکورہ کتاب میں خان محبوب طرزی کے فکر وفن اور نمونہ تحریر کو پیش کیا گیا ہے۔ مقدمہ میں خان محبوب طرزی کے ناول/افسانے کی ایک طویل فہرست بھی دی گئی ہے؛ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے طرزی پر لکھی گئی تحریروں کو ہی ترتیب نہیں دیا ہے، بلکہ تلاش وجستجو کے بعد ان کے ناول اور افسانے کا توضیحی اشاریہ بھی پیش کیا ہے، یہ یقیناً غیر معمولی کام کہا جائے گا۔ طرزی کی کتابوں کی تلاش آسان کام نہیں تھا۔ سرپنچ اور فروغ اردو کے خصوصی شمارے کے علاوہ طرزی کے فکر وفن پر بہت کم لکھا گیا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ طرزی کا ایک جامع تعارف پیش کیا جائے، تاکہ قارئین کی توجہ مبذول کرائی جاسکے۔ مرتب کتاب اس حوالے سے یقیناً کامیاب ہوئے۔

'خان محبوب طرزی: لکھنؤ کا ایک مقبول ناول نگار' میں پہلا حصہ اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ اس میں ان لوگوں کی تحریریں شامل ہیں، جنھوں نے طرزی اور لکھنؤ دونوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ لکھنؤ طرزی کے بغیر اور طرزی لکھنؤ کے بغیر مکمل تصور نہیں کیے جاسکتے۔ اس لحاظ سے مرتب کتاب نے کتاب کے پہلے ہی حصہ میں احوال وکوائف کے تحت طرزی کا ایک جامع تعارف پیش کیا ہے۔ کیونکہ موجودہ وقت میں طرزی کا تعارف اس لحاظ سے بھی ضروری تھا کہ زمانے کی ستم ظریفی نے طرزی کو اپنا لقمہ بنا ہی لیا تھا، لیکن ڈاکٹر عمیر منظر نے اپنی کوشش وکاوش سے ان کے حوالے سے ایک ایسی کتاب تیار کی، جس میں طرزی کے کئی حوالے موجود ہیں۔ طرزی کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی کے یہ جملے قابل غور ہیں۔

''میں سمجھتا تھا کہ طرزی صاحب کو آج کوئی نہیں جانتا اور مجھے اس کا رنج بھی تھا کہ اس زمانے میں اردو نے کئی مقبول ناول نگار دنیا کو دیے تھے:... ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو خان محبوب طرزی کی طرح کا ابداع اور تنوع رکھتا ہو۔''

'خان محبوب طرزی: لکھنؤ کا ایک مقبول ناول نگار' میں پیش لفظ، دیباچہ اور اظہار تشکر کے علاوہ کل سات باب ہیں۔ پہلا باب احوال وکوائف ہے، اس حصے میں کل پچیس مضامین ہیں، دوسرے باب طرزی کا فکشن میں کل گیارہ مضامین ہیں، تیسرا باب ناولوں سے متعلق طرزی کی تحریریں، اس میں کل دس مضامین ہیں، چوتھا باب طرزی کے ناولوں پر مقدمے اور رائیں ہے، اس میں کل پانچ تحریریں شامل کتاب ہیں، پانچواں باب خان محبوب طرزی کی تحقیقی تحریریں ہے، اس باب میں کل چار مضامین شامل ہیں، چھٹے باب طرزی کا ناول میں ایک ناول اور ایک افسانہ شامل ہے، اور ساتواں باب طرزی کی کچھ دیگر تحریں کے عنوان سے ہے، اس باب میں کل چھ تحریریں شامل ہیں۔ ابواب بندی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کتاب نے طرزی کے حوالے سے مطالعے کے جتنے بھی زاویے ہوسکتے تھے، سب کو الگ الگ باب میں پیش کیا ہے۔ مرتب کتاب نے اس کتاب کی تیاری میں اپنی تحقیقی اور تنقیدی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ عالمانہ مقدمے کے ساتھ ساتھ جس طرح سے طرزی کی کتابوں کی فہرست مع مطبع وسن درج کی ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کتاب نے طرزی کے حوالے سے ایک حوالہ کی کتاب ترتیب دی ہے۔ طرزی کے حوالے سے یہ ابتدائی کام ہے۔ یہ ابتدائی کام دراصل کسی بڑے کام کا پیش خیمہ ہے۔ کتاب کی اشاعت کے لیے مرتب کتاب یقیناً قابل مبارکباد ہیں۔ امید ہے کہ قارئین پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

نورالحسنین: (اپنے ناولوں کے آئینے میں)

مصنفہ: ڈاکٹر نازنین سلطانہ آصف احمد

صفحات: 199، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: ڈاکٹر شیخ اصغر، پلاٹ نمبر 348، نیئر بترا مسجد، الہلال کالونی، اورنگ آباد 431001

'نورالحسنین: اپنے ناولوں کے آئینے میں' اس کتاب میں نورالحسنین کے اب تک جو چار ناول شائع ہوئے، جن میں آہنکار، ایوانوں کے خوابیدہ چراغ، چاند ہم سے باتیں کرتا ہے، تلک الایام، ان ناولوں کا بڑی باریکی سے فنی وفکری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نورالحسنین نے اپنے فکشن کے ذریعے خاص کر ناولوں میں اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی مسائل کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے آج کے جدید دور میں تاریخی ناول لکھ کر اپنے ہمعصروں میں اپنا ایک الگ مقام بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے حال ہی میں انھیں 'عالمی فروغ اردو ایوارڈ' دوحہ قطر سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر نازنین سلطانہ کی یہ تیسری تنقیدی کتاب ہے۔ اس سے پہلے ان کی دو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں 'گئودان کے کرداروں کا مطالعہ' اور 'پیکر تنقید' شامل ہیں۔ یہ تیسری کتاب ہے جو نورالحسنین کے ناولوں پر مبنی ہے، جس میں نورالحسنین کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ ناول کے فنی اجزا کا خیال رکھتے ہوئے بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نورالحسنین کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ناول کے آغاز وارتقا پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کی خاص خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مصنفہ نے نورالحسنین کے ساتھ ایک انٹرویو پیش کیا ہے، جو انھوں نے خود ان سے کسی وقت لیا تھا۔ اس انٹرویو کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں نورالحسنین نے اپنی شخصیت اور اپنی ادبی زندگی کے بارے میں، اپنے ناولوں کے بارے میں کھل کر اور بڑی ایمانداری سے بات کی۔ جس کی وجہ سے ہمیں نورالحسنین کی شخصیت اور ان کی ادبی زندگی کے مخفی گوشے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ نورالحسنین کو فکشن نگار بنانے میں وہ

کون سے عوامل تھے اس کا اندازہ بھی ہم آسانی سے لگا سکتے ہیں۔ڈاکٹر عبدالرب نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے۔

کتاب کی ترتیب کی بات کی جائے تو نہایت ہی سلیقے سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ پہلے مقدمہ ہے جو ڈاکٹر عبدالرب نے لکھا ہے۔ انھوں نے اس مقدمے میں مصنفہ کی محنت اور لگن و جستجوں پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس کے بعد 'چند باتیں' مصنفہ نے پیش لفظ کے طور پر پیش کی ہے۔اس انٹرویو سے کتاب کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ مصنفہ نے نورالحسنین کے فن اور شخصیت پر بھی ایک باب رکھا ہے تاکہ قاری کو نورالحسنین کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔اس کے بعد نورالحسنین کے چاروں ناولوں کا ترتیب وار تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں اندرون صفحات میں نورالحسنین کے ناولوں پر جن تنقید نگاروں، ناول نگاروں نے اپنی رائے پیش کی ہے اسے اقتباس کے طور پر رکھا گیا ہے۔جن تنقید نگاروں کی رائے کو رکھا گیا ہے اور ان کے اسمائے گرامی ہیں: خورشید حیات، اسلم جمشید پوری، علی احمد فاطمی، اور خورشید اکبر۔

مجموعی طور پر یہ کتاب نورالحسنین کے فن اور ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ایک مکمل کتاب ہے۔ یہ کتاب یقیناً آنے والے تحقیق نگاروں اور ریسرچ اسکالروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوسکتی ہے۔اس کتاب کی اشاعت پر ہم ڈاکٹر نازنین سلطانہ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان کے آنے والے ادبی سفر کے لیے دعا و نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی کا ناول شبنمی لمس کے بعد: ایک ڈسکورس

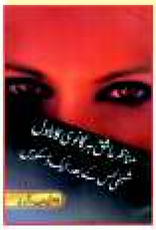

مرتب: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری

صفحات: 312، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی -110002

مبصر: ابراہیم افسر، وارڈ نمبر-1، مہپا چوراہا

نگر پنچایت سوال خاص ضلع میرٹھ (یو۔پی) 250501

مناظر عاشق ہرگانوی کے ادبی کارنامے اتنے وقیع ہیں کہ اب تک ان کی 250 سے زائد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ 'شبنمی لمس کے بعد' 235 صفحات پر مشتمل پہلا ناول ہے جس کی بنیاد پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے جنسی تلذذ میں سرشار 44 خطوط پر رکھی ہے۔ان خطوط کو باقاعدہ علاحدہ علاحدہ عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔

2018 میں مکتوباتی انداز میں لکھے گئے اس ناول کو پڑھنے کے بعد اُردو حلقوں میں ایک نئی بحث کا آغاز ہوا۔اول یہ ناول خطوط پر مبنی ہے یعنی لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کے بعد یہ ایسا ناول ہے جس میں ایک مٹتی ہوئی صنف کو دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔ ناقدین نے اس ناول کے بارے میں اپنی توجہ مرکوز کرتے ہوئے اسے اکیسویں صدی میں اُردو میں لکھا گیا کوک شاشتر، کام سوتر، جنسی انارکی اور عریانیت کا نمائندہ ناول کہا تو کسی نے مناظر عاشق ہرگانوی کو اُردو ادب کا فحش ناول نگار قرار دیا۔بعض ناقدین نے تو اس ناول کو نثری لذت اندوزی کے چٹخاروں کا شاہ کار ناول گردانا۔کسی نے اسے تکنیکی ناول، کسی نے مکتوباتی جنسی جمالیاتی ناول، کسی نے محبت کے انوکھے انداز کا ناول، کسی نے جادوئی انداز میں لپٹا ہوا ناول، کسی نے بدن کی جمالیات کا مرقع، کسی نے حسن و وصل سے بھرا ہوا ناول اور کسی نے اپنے عہد کا ترجمان ناول اور کسی نے ماہر جنسی طبیب کی کہانی اپنی زبانی بیان کرنے والا ناول اور کسی نے اسے زہر عشق کا نثری بیانیہ کہا۔اس تنقیدی بحث میں وہ 44 خطوط تھے جن میں جنسی ہوس ناکی و فحش نگاری کی تمام حدود کو عبور کیا گیا ہے۔

زیر نظر ناول پر جو تحریری گفتگو اور مباحثے ادبی رسائل و جرائد میں ہوئے ان کو یک جا کر کے ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری نے نئے تناظر اور ڈسکورس کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا۔انھوں نے اس ناول کی اہمیت و افادیت سے بحث کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ نفسیاتی ہیجانی کیفیت اور بدن کی جمالیات پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ناول میں شامل 44 خطوط کسی نعمت سے کم نہیں ہیں۔ان خطوط میں ہندوستانی تہذیب، مسلکی مسائل اور سیاست پر بھی تبادلۂ خیال کیا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں جن ناقدین کے مضامین شامل ہیں ان میں عبدالصمد، محی الدین زور کشمیری، خالد حسین خاں، نذیر فتح پوری، عبدالواسع، شاہد احمد جمالی، ابواللیث جاوید، مشتاق احمد وانی، سیفی سرونجی، امام اعظم، عشرت بیتاب، مشتاق احمد، شارق عدیل، ایم نصراللہ نصر، سلمان عبدالصمد، صفی الرحمٰن راعین، احسان عالم، ارمان شمسی، ابرار احمد اجراوی، معین الدین شاہین، معراج احمد معراج، ایم صلاح الدین، محمد نوشاد عالم آزاد، ترنم، عارف حسن وسطوی، رفعت عالیہ، استوتی اگروال، سیدہ تفسیر فاطمہ، ایم زیڈ خاں اور حیدر وارثی کے اسما سرفہرست ہیں۔ منظوم فکر و فرزانگی میں عبدالمنان طرزی، محمد احمد کریمی، احسان عالم، منظر سلیمان، ابرار احمد اجراوی، سید احمد ایثار اور امریندر کے نام شامل کتاب ہیں۔اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے مناظر عاشق ہرگانوی کے ناول 'شبنمی لمس کے بعد' کو سمجھنے میں قارئین کو آسانی پیدا ہوئی ہے۔محی الدین زور کشمیری نے مناظر عاشق ہرگانوی کے اُس خط کو بھی کتاب میں شامل کیا جسے راجستھان کی ایک محترمہ نے ناول پڑھ کر مناظر عاشق ہرگانوی کو لکھا تھا۔کتاب میں شامل کچھ مضامین میں اس بات پر خفگی کا اظہار کیا گیا کہ کاشف نے جتنے خط لکھے ان کے جواب میں فرحت نے کوئی خط کیوں نہیں لکھا؟ اپنے وکیل کے ذریعے بھیجے گئے نوٹس میں صرف تین سطریں فرحت نے رقم کی ہیں۔بہر کیف فرحت کا کردار ایک خود کفیل لڑکی کا ہے جو اپنے اخراجات اور ضروریات اسکول کی نوکری کرتے ہوئے پورے کرتی ہے۔ بہر حال یہ بڑی بات ہے کہ اس ناول کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔اس موقع میں ڈاکٹر محی الدین زو کشمیری کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ان تمام امور کو یک جا کرنے کی کامیاب کوشش کی جن کی وجہ سے ناول کے بیانیہ کے سمجھنے میں آسانی ہوئی ہے۔

فکشن

وہ دس اور دوسری کہانیاں (افسانوی مجموعہ)

مصنف: ف س اعجاز

ناشر: انشا پبلی کیشنز، 25 بی، زکریا اسٹریٹ، کولکاتا 70005435

صفحات: 216، قیمت: 300 روپے

مبصر: سید وجاہت مظہر

ٹی 116/1، سیکنڈ فلور، اوکھلا گاؤں۔ نئی دہلی۔ 110025

'وہ دس اور دوسری کہانیاں' ف س اعجاز کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے جو 2020 میں منظر عام پر آیا ہے۔اعلیٰ معیاری کتابت اور خوبصورت سرورق سے آراستہ ف س اعجاز کا یہ افسانوی مجموعہ ان کے مخصوص جمالیاتی شعور کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سے قبل بھی ان کے افسانوں کے ایک اور مجموعے بعنوان 'پلوٹو کی موت' کی بھی اہل اردو میں کافی پذیرائی ہو چکی ہے۔ زیر نظر افسانوی مجموعے میں تینتیس کہانیاں شامل ہیں، جن

کے عنوانات بالترتیب یوں ہیں: دکاندار، مزیدار، پرندوں کا غدر، ایک ہتھیار ڈیزائنر کی موت، گڑیا، ہاؤز نمبر 44، لکڑی کا جزیرہ، اشتہار، من وسلوی، کھڑاؤں، اریکا، جینا یہاں مرنا یہاں، واپسی، وہ دس، کبیرا کھڑا بازار میں، چاند اور چھپکلی، وَن فوروی روڈ، جال، اسکرول، ٹم کے کیے، جراثیم، یادگار لمحہ کوئی میری چپ کو توڑے، چار مرحلے، بھولا پن، بے بس، پاس ورڈ، ہیرو، بائیں ہاتھ کا کھیل، گرین زون، آنکھوں کا دن اور رات گئے۔ علاوہ ازیں، اس مجموعے میں تیئیس، ایک ایک صفحے پر محیط مختصر کہانیاں 'کہانی ریزے' عنوان کے تحت شامل ہیں، جن کے عنوانات اس طرح ہیں: سوال، انداز، حیرانگی، رو لیے تو...، کم ظرفی، ڈر حل، اے آسمان، بھاپ، سکون، فرار، بلا عنوان، می ٹو، بہت اونچا، اماوس، نامحرم، بے رحم، آزادی، الجھن، اتم اچھا، پانسہ، ستاتوں کا جنم اور ماسک۔

زیر نظر کتاب میں ف۔س۔ اعجاز نے اپنے افسانوں میں ماجرے کی اہمیت اور کرداروں کی نفسیات پر خصوصی توجہ مرکوز رکھی ہے۔ ان کے بعض افسانے معاشرے کی فضا اور اقدار کے لحاظ سے جدید مغربی ممالک کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس طرح ایسے افسانے برصغیر ہند وپاک کی مشرقی اخلاقیات سے میل نہیں کھاتے۔ اس نوعیت کے غیر ملکی منظرنامے کی عکاسی اُن کے افسانے 'گڑیا' اور 'یادگار لمحہ' میں نظر آتی ہے۔

'اریکا' عیاشی کی مردانہ فطرت اور سائنٹفک مزاج کی آمیزش کے ساتھ تخلیق کردہ ایک نسائی روبوٹ کی کہانی ہے، جس میں مصنف نے عیش کوشی اور گناہ میں تفریق کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ موضوع اور ماحول کے نقطۂ نظر سے اپنے عہد سے آگے کی شے ہے۔ 2018 میں تحریر کردہ ف س اعجاز کی یہ کہانی پہلے اردو کے موقر ماہنامہ 'آج کل' میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس کہانی میں انھوں نے سائنسی ایجادات کو تخلیقی سمت ورفتار عطا کی ہے۔ اس کہانی کے تناظر میں مصنف قارئین کو مطلع کرتے ہیں:

'یہ اطلاع بھی آپ کو دوں کہ آج (29 جون 2020) کے انگریزی اخبار کی ایک نمایاں خبر کے مطابق ہالی وڈ سے اس روبوٹ کے کردار پر 70 ملین ڈالر سے ایک بڑی فلم بنانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک عظیم الشان ہمہ جہت سائنسی فلم ہوگی!'' (وہ دس اور دوسری کہانیاں، مصنف ف س اعجاز، پیش لفظ، ص 12)

گزشتہ صدی میں اطلاعات کی برق رفتاری سے ترسیل کے ضمن میں ٹیلی گرام کی اہمیت وافادیت سے پچھلی نسل تک لوگ خوب واقف رہے ہیں۔ لیکن عصری منظرنامے میں ٹیلی گرام کی تکنیک ماضی کی چیز ہو چکی ہے۔ حساس مزاج تخلیق کار نے اپنا افسانہ 'کوئی میری چپ کو توڑے' میں ٹیلی گرام کے تناظر کو تخلیقی پیرایہ عطا کیا ہے۔

اے کے 47 رائفل کے موجد میخائل کلاشنیکوف کی زندگی کے سبق آموز واقعات کی بنیاد پر ف س اعجاز نے اپنا افسانہ 'ایک ہتھیار ڈیزائنر کی موت' تخلیق کیا ہے۔

سائنس کے لامحدود امکانات ف س اعجاز کے لیے خاص کشش کا باعث رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے بہت سے افسانوں میں اہل اردو کو سائنس کی حقیقی فضا سے مانوس کرانے اور انھیں دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرانے کی سعی کی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اپنے بعض افسانوں کے توسط سے قارئین کو وہ نئے سائنٹفک رجحانات سے بھی روشناس کراتے رہے ہیں۔ مصنوعی ذہانت ان کا مرغوب موضوع ہے جو ان کے چند افسانوں میں ایسی فضا قائم کرتی ہے جو اہل اردو کے لیے کافی آگے کی شے لگتی ہے اور جسے سائنس فکشن کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

ملک عزیز میں اقلیت کے مسائل اور تدفین کے مراحل میں درپیش دقتوں کو انھوں نے افسانہ 'ہاؤز نمبر 44' اور 'جینا یہاں مرنا یہاں' میں بڑی سچائی اور فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

کورونا وائرس کی وبا سے پیدا شدہ انسانی المیے کو موصوف نے اپنی دو کہانیوں 'واپسی' اور 'وہ دس' میں بڑے پُر تاثیر لب ولہجے میں بیان کیا ہے۔ لاک ڈاؤن میں پھنسے مزدوروں اور پسماندہ طبقے کو انھوں نے ان افسانوں کا محور ومرکز بنایا ہے۔

اپنے وسیع مطالعے، عمیق مشاہدے اور تخیل کی بلند پروازی کی مخصوص ومتناسب آمیزش سے وہ دلچسپ فنتاسیہ تخلیق کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کا افسانہ 'لکڑی کا جزیرہ' ایک ایسا ہی لاثانی فنتاسیہ ہے، جو میکسیکو کے جنگلات میں کسی بڑے پیڑ کو کاٹنے کے دوران بجنے والی پراسرار شبیہ سے وہاں کام کر رہے مزدوروں میں خوف وہراس کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ برسوں پہلے نظر سے گزری اس بظاہر معمولی سی خبر کا دیرپا تاثر، مذکورہ افسانے کی تخلیق کا باعث بن جاتا ہے۔

ف س اعجاز کے افسانوں میں اچھوتے موضوعات کی مرقع سازی اور زندگی کی ایک بالکل الگ قوس وقزح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ انسانی محسوسات اور جذبات کے تمام پہلو اور زندگی کے مختلف انکشافات اور تجربات کا دلکش افق یہاں آب وتاب کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ انھیں سائنس سے گہرا لگاؤ ہے۔ سائنٹفک ترقی اور مصنوعی ذہانت کو انھوں نے اپنے کافی افسانوں میں بڑی ہنرمندی سے برتا ہے جو ان کے افسانوں کی خاص شناخت بنتا جارہا ہے۔ مختصراً یہ کہ زیر تبصرہ افسانوی مجموعہ ف۔س۔ اعجاز کی بطور افسانہ نگار قدر ومنزلت میں اضافہ کرتا ہے اور فن افسانہ نگاری میں نئے موضوعات کو متعارف کراتا ہے۔

خودنوشت

موجوں کا اضطراب (آپ بیتی)

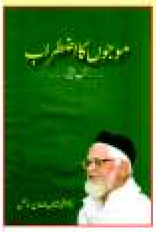

مصنف کا نام: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
ترتیب وتزئین: محمد رفیع الدین
صفحات: 208، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: علیم پبلی کیشنز، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور، مہاراشٹر
مبصر: ڈاکٹر فرزانہ خلیل، شاہین باغ، دہلی

'موجوں کا اضطراب' ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کی خودنوشت ہے۔ دراصل ان کی ادبی اور گھریلو زندگی میں بہت زیادہ نشیب وفراز ہیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنی خودنوشت کا نام موجوں کا اضطراب رکھا ہے۔ اس میں ان گنت اتار چڑھاؤ کو بڑی بے باکی سے پیش کیا ہے، جس میں موجوں جیسا اضطراب ہے۔ آپ بیتی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل پر گزرے ہوئے حالات موجوں کی طرح بے چین تھے جسے انھوں نے صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کا کام کیا ہے۔ موضوع سے مناسبت رکھتے ہوئے شرف الدین ساحل نے اپنا ایک خوبصورت شعر بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔

جس کو سکوں نصیب ہو وہ دل نہیں ہوں میں
موجوں کا اضطراب ہوں ساحل نہیں ہوں میں

اس شعر سے شرف الدین ساحل کی سوچ اور فکر کا پتہ چلتا ہے۔ مصنف نے مذکورہ کتاب میں قارئین کو نامساعد حالات سے نبرد آزما ہونے کی تلقین کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے میر، غالب اور اقبال جیسے شاعروں کے اشعار پیش کیے ہیں اور زندگی کے اس اضطراب سے مایوس نہ ہونے کی تلقین کی ہے۔

بے کسی میں بھی میسر ہے سکون زندگی
ماورائے فہم ہے حالات مری تقدیر کی

مصنف کی اس آپ بیتی سے شہر ناگپور کے تاریخی اور جغرافیائی حالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اس کتاب میں ناگپور کی دینی اور علمی سرگرمیوں کا بخوبی ذکر کیا گیا ہے۔مصنف نے اس کتاب میں ناگپور کے بھونسلہ راجاؤں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں غیر متعصب، منصف مزاج اور انسان دوست بتایا ہے۔ان راجاؤں کے دور میں مسلمان اعلی عہدوں پر فائز تھے۔یہی وجہ ہے کہ یہاں اسلامی تہذیب وثقافت کو پروان چڑھنے کا خوب موقع ملا۔انھوں نے ناگپور کے کئی اہم شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کیا ہے جن کی کاوشوں سے ناگپور میں اردو ادب اور ادبی ماحول پیدا ہوا۔مصنف نے اپنی ایک نظم 'ناگپور' میں اس کا ذکر کیا ہے۔

مرکز ہندوستاں ہے ناگپور　　　سر زمین عز و شاں ہے ناگپور
سنتروں کا شہر، صنعت کا نگر　　　سانس لیتے ہیں یہاں اہل ہنر
محور عشق و محبت ہے یہ شہر　　　مخزن ایثار و برکت ہے یہ شہر

اس کتاب میں مصنف نے ناگپور کے مسلم معاشرے کے زوال کی داستان کو قلمبند کیا ہے۔اس کے عوامل کی نشاندہی کی ہے اور مسلم اکثریتی علاقہ مومن پورہ کے آباد ہونے کی داستان بھی بیان کی ہے۔اس علاقے کو اعظم گڑھ سے نقل مکانی کرنے والے بنکروں نے بسایا تھا۔یہیں مصنف کی پیدائش ہوئی۔انھوں نے اس شہر کو کئی بار اجڑتے اور بستے دیکھا۔شرف الدین ساحل نے یہیں سے اردو، عربی اور فارسی کی اعلی تعلیم حاصل کی۔ناگپور یونیورسٹی سے 1977 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔تحقیقی مقالے کا عنوان 'ناگپور میں اردو' تھا۔

اس کتاب میں مصنف نے اردو کے بڑے ادیبوں کی بددیانتی کا راز بھی فاش کیا ہے اور تقرری میں ہونے والی ناانصافیوں کی داستان بھی بیان کی ہے۔دوسری جانب ناگپور میں بنکروں کے استحصال اور تباہ ہوتی کپڑا سازی کی صنعت کی تفصیل بھی مصنف نے بیان کی ہے۔اس سلسلے میں شرف الدین ساحل نے اپنی ایک نظم 'مقدس چہرے' کے چند اشعار بھی شامل کیے ہیں جس سے وہاں کے بنکر طبقے کی سادگی اور استحصال کا حال بیان کیا ہے۔

جن کے چہرے بہت مقدس ہیں　　　جن کے ہاتھوں پہ گہرے داغ جگہ
ٹوپیاں ہیں سروں پہ جن کے مگر　　　روح ایمان سے سینے خالی ہیں

نوکری کے سلسلے میں انھوں نے ہونے والی زیادتی کے خلاف عدالت میں مقدمے بھی لڑے لیکن کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔اس آپ بیتی میں ناگپور کے مومن پورہ کی ادبی محفلوں اور تنگ نظر ادبی سیاست کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ آپ بیتی شرف الدین ساحل کی زندگی کا نثری مرثیہ ہے جس میں سوز بھی ہے اور زمانے کی ناقدری کا شکوہ بھی۔پوری کتاب ناگپور اور مصنف کے گرد گردش کررہی ہے۔کتاب کے آخر میں کچھ مکالمات پیش کیے گئے ہیں۔

کتاب میں مصنف کی مختلف ادوار کی تصویریں، سپاس نامے، سماجی و تعلیمی خدمات، تصانیف (شاعری، تحقیق وتنقید، تاریخ وتحقیق، تنقید، تحقیقی تدوین، شرح وتفہیم)، انعامات، اعزازات، خطبات، سمینار میں شرکت، نگارشات (اسلامیات، منظومات، تحقیقی و تنقیدی مضامین،) کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔مزید برآں مصنف کے انگریزی اور ہندی زبان میں تحریر کیے گئے مضامین کی فہرست بھی شامل ہے۔

خودنوشت کے مطالعے کے شوقین قارئین کے اس کتاب کا مطالعہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔

تبصرے

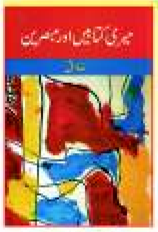

میری کتابیں اور مبصرین

مرتب: صادق
صفحات: 160، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: ایجوکیشنل، پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر عادل حیات، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو کی ادبی دنیا میں پروفیسر صادق ایک شاعر، تنقید نگار اور مترجم کی حیثیت سے خاص پہچان رکھتے ہیں۔ان کی متعدد کتابیں اردو اور ہندی رسم الخط میں شائع ہوکر قارئین سے داد وتحسین حاصل کرچکی ہیں۔ان کتابوں پر تبصرے مختلف معیاری و غیر معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔تبصرے دراصل مبصرین کی بصیرت کا اظہار ہوتے ہیں، وہ زیر تبصرہ کتاب پر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے ہیں، جس میں کتاب کے موضوع ومواد اور اس کے عیب وصواب پر مختصراً گفتگو کی جاتی ہے۔علاوہ ازیں تبصروں میں اس کے اجزا کے طور پر صفحات کی تعداد، اس کی قیمت اور ناشر کا پتہ بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ان تبصروں کو پڑھ کر قارئین پر کتاب کی حقیقت کھل جاتی ہے، وہ اپنی پسند و ناپسند اور استعداد کے مطابق متعلقہ کتاب کا انتخاب کرتے ہیں اور اسے حاصل کرکے اپنے ذوق مطالعہ کا حصہ بناتے ہیں:

'میری کتابیں اور مبصرین' سے قبل تبصروں پر مشتمل کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ان کتابوں پر تبصرہ نگار کا نام ہوتا ہے یا پھر کوئی دوسرا شخص اسے ترتیب دے کر اپنے نام سے شائع کرادیتا ہے۔یہ پہلا موقع ہے کہ پروفیسر صادق نے اپنی کتابوں پر مختلف مبصرین کے تبصروں کو 'میری کتابیں اور مبصرین' کے عنوان سے ترتیب دے کر اپنے ہی نام سے چھپوایا بھی ہے۔

'پیش لفظ' کے علاوہ زیر تبصرہ کتاب میں پروفیسر صادق کی اٹھائیس کتابوں پر مختلف مبصرین کے تبصرے شامل ہیں۔ان کتابوں میں یہ داغ داغ اجالا، اردو کی کالی جنی کہانیاں، گرتے آسمان کا بوجھ، عصمت ہر لائف ہر ٹائمس، کہیں نہیں وہیں، نمائندہ نظمیں سندیپ بنرجی، عصری اردو کہانیاں اور کلپانت جیسی کتابوں پر پروفیسر صادق کے مطابق شاہینہ تبسم صاحبہ نے نوٹ لکھے ہیں اور جن میں تعریف یا تنقیص سے عمداً گریز کیا گیا ہے۔پروفیسر صادق کی دیگر کتابوں مثلاً 'دستخط' پر ابوالکلام قاسمی کا تبصرہ، 'سلسلہ' پر کمار پاشی، سلیم شہزاد اور شکیب نیازی کے تبصرے، 'نئی مراٹھی شاعری' پر عتیق اللہ اور یعقوب راہی کے تبصرے، 'ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ' پر تنویر احمد علوی، قمر رئیس، عصمت جاوید، کرامت علی، عتیق اللہ، ارتضی کریم اور رام لال کے تبصرے، 'مالوے کی لوک کہانیاں' پر مظہر محمود کا تبصرہ، 'نئی ہندی شاعری' پر عتیق اللہ کا تبصرہ، 'کشاؤ' پر اسلوب احمد انصاری، بلراج کومل اور ندا فاضلی کے تبصرے، 'کنیادان' پر عظیم الشان صدیقی اور سید فیضان حسن کے تبصرے، 'ادب کے سروکار' پر تنویر احمد علوی اور نامی انصاری کے تبصرے، 'عظیم شاعر مرزا غالب' پر مبصر اخبار نو اور سید فیضان حسن کے تبصرے، 'چند مضامین' پر وہاب عندلیب کا تبصرہ، 'خواب کے جلنے کا مقصد' پر جاوید ناصر اور رفیق جعفر کے تبصرے، 'شبدوں کا جنم دن' پر پرتاپ سہگل اور رمیش سونی کے تبصرے، 'سر پہ کھڑا سنی ہے' پر پونم شرما کا تبصرہ، 'نظمیں غزلیں گرد آلود' پر اطہر معیز کا تبصرہ، 'زندگی کا ذائقہ' پر کملیشور، پنڈت سُلیکھ چندر شرما، شیلندر کمار شرما اور مظہر محمود کے تبصرے، 'تحقیقی اور

تنقیدی مضامین' پر خان محمد رضوان کا تبصرہ، 'مثنوی چراغ دیر مع پانچ تراجم' پر مہتاب جہاں کا تبصرہ، 'اس شوق سے گزری غالب' پر فرحت نادر رضوی کا تبصرہ اور 'چراغ دہر' (ہندی ترجمہ) پر اشوک باجپئی، نریندر موہن اور شافع قدوائی کے تبصرے شامل ہیں۔ یہ تبصرے چھوٹے بھی ہیں اور اپنی ضخامت کے اعتبار سے کئی کئی صفحات کا احاطہ بھی کرتے ہیں، لیکن ان تبصروں کا معیار کافی بلند ہے۔ ان تبصروں کو کتابی صورت میں چھپوانے کا مقصد مصنف کی تمام تصنیفات و تالیفات سے قارئین کو متعارف کرانا ہے۔ ان میں سے کچھ تبصرے ہندی اور انگریزی زبان میں تھے، جنھیں اسد رضا، حسینی سید سجاد مہدی، ابراہیم افسر، شبنم رضوی، اسد فیصل فاروقی اور آفاق عالم صدیقی نے اردو میں ترجمہ کیا۔ جس سے صاحب کتاب کی مشکلیں آسان ہوگئیں اور وہ زیر تبصرہ کتاب میں شامل کر لیے گئے۔

'میری کتابیں اور مبصرین' جیسا کہ مرتب کا دعوا ہے "اردو اور ہندی میں غالباً اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے" اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے ادبی حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی اور ادب کے قارئین اسے پڑھ کر پروفیسر صادق کی کتابوں، ان کی نوعیت اور خوبی و خرابی سے بخوبی آشنا ہوسکیں گے۔ اس کتاب سے ادب کے نئے لکھاری بھی تبصرہ لکھنے کے فن سے واقفیت ہوسکتے ہیں۔

ابلاغیات

اردو صحافت کا مزاج

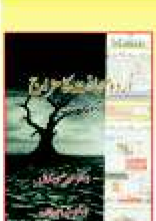

مرتب: ڈاکٹر سید احمد خاں
صفحات: 248، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: ایپلائڈ بکس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ 110002
مبصر: ڈاکٹر خورشید احمد شفقت اعظمی
دلکشاں، N-49 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ 110025

'اردو صحافت کا مزاج' ڈاکٹر سید منور حسن کمال کے ان صحافتی مضامین کا دلکش مجموعہ ہے جو راشٹریہ سہارا میں ہر ہفتے اور گاہے گاہے ہفتہ وار خصوصی ضمیمہ امنگ میں شائع ہوتے رہے۔ قارئین ان مضامین کے منتظر رہا کرتے تھے۔ اب بھی گاہے گاہے ان کے موضوعاتی مضامین صاحب نظر قارئین کی بصیرتوں سے داد و تحسین حاصل کرتے نظر آتے ہیں۔ جب کبھی اس کی اشاعت میں تعطل پیدا ہو جاتا تشنگانِ زبان و ادب بڑی کمی محسوس کرتے تھے۔ 'اردو صحافت کا مزاج' جیسا خوبصورت نام اسی مجموعہ کے باب اول کا عنوان ہے۔ مصنف نے ایسے سلگتے ہوئے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، جو کل بھی اہم تھے اور آج کے حالات سے بھی ہم آہنگ ہیں۔

کتاب کو انعکاس کے بعد چار معنی خیز ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

کلیدی حصہ انعکاس میں منور حسن کمال کے تعارف کے علاوہ ان کے فنی کمالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، جس میں نامورانِ ادب نے حصہ لیا ہے، مثلاً پروفیسر عبدالحق، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر تابش مہدی، ڈاکٹر رونق شہری، محمد عارف اقبال اور ڈاکٹر سید احمد خان۔ اس کے بعد باب اول 'اردو صحافت کا مزاج' سامنے آتا ہے جو 8 فکرانگیز مضامین پر مشتمل ہے۔ مثلاً صحافت پابند سلاسل۔ رجحان غلط، صحافت کے مدوجزر، صحافت کے زریں اصولوں سے انحراف، صحافت کے سیاہ حاشیے، الیکٹرانک صحافت کے پرکشش دائرے وغیرہ۔

منور حسن کمال نشتر بھی لگاتے ہیں، مرہم بھی رکھتے ہیں، اسباب وعلل پر روشنی ڈالتے ہوئے تجزیہ بھی کرتے ہیں اور اس کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔ سیاسی و سماجی شعور بالیدہ ہونے کے سبب کہیں جانبداری یا افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوتے اور نہ کہیں جذبات سے مغلوب نظر آتے ہیں جو صحافت کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔ منصفانہ تجزیہ کرنے کے باوجود ان کی تحریر سنجیدگی اور متانت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

باب دوم میں 'گرد و پیش' کے زیر عنوان 23 مضامین کا گرانقدر انتخاب پیش کیا ہے۔ اس کے اولیں مضمون کا عنوان 'مشکل حالات میں دانشوروں کا امتحان' ہے۔ جملہ مضامین اہم ہیں، نامساعد حالات میں بھی جینے کا حوصلہ دیتے ہیں:

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا، مگر ایک جگنو ہواؤں میں ابھی روشنی کا امام ہے، شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا۔

باب سوم جہاں نما میں ۱۷ مضامین کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اسے آئینۂ عالم سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، جس میں عصری صورت حال کا منظر نامہ ہی نہیں، بلکہ ان کا متبادل بھی پیش کیا گیا ہے، جو مصنف کے فکر و تدبر کے غماز ہیں۔

کتاب کا آخری حصہ باب چہارم 11 ایسے فکرانگیز مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں انسانیت، اخلاقیات اور سماجی امور اور نظام تعلیم وغیرہ کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے، جن میں صحت مند فکر جب تک شامل حال نہ ہوگی، پرامن دنیا اور پرسکون سماج کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ان مضامین میں مصنف نے اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا ہے۔

پروفیسر عبدالحق نے بجا طور پر سید منور حسن کمال کے محاسن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "ڈاکٹر منور حسن کمال کے فروزاں حاشیوں نے اردو صحافت کے مزاج کو سمجھنے، اردو صحافت کی آبرو برقرار رکھنے اور بحال کرنے میں قابل ذکر کردار ادا کیا ہے۔"

ہمیں ڈاکٹر سید احمد خاں کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے موجودہ مجموعۂ مضامین کو مرتب کرکے اردو دوستی کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سید احمد خاں طب یونانی کے گریجویٹ اور آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے ابتدا سے ہی قومی سکریٹری جنرل کی حیثیت سے فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ آپ وزارت آیوش میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر [یونانی] کے باوقار عہدے پر فائز ہیں اور فی الوقت صفدر جنگ ہسپتال نئی دہلی کے شعبۂ طب یونانی کے انچارج ہیں۔ موصوف اردو اور طبی دنیا میں اپنے فعال اور فیض رساں کردار کے سبب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

کتاب کا انتساب انتہائی معنی خیز لیکن مبنی برحقیقت ہے "تہذیبی نرگسیت میں مبتلا ان قائدوں کے نام جو آج بھی اپنی خانقاہوں میں مطمئن ہیں۔"

یہ انتساب ہی نہیں بہت بڑی حقیقت پر سے پردہ اٹھانے کا جرأت مندانہ قدم بھی ہے۔ منظوم تاثرات میں احمد علی برقی اعظمی نے بہترین خراج تحسین پیش کیا ہے، جس کا مقطع ہے:

تبصروں کی شکل میں ہے اب کتابی شکل میں
تھا جو برقی سال بھر اردو صحافت کا مزاج

سوانحی اشاریہ مصنف کی تعلیم ملازمت اور تصانیف کا آئینہ دار ہے۔

'اردو صحافت کا مزاج' کی کتابت و طباعت ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سہو کتابت سے یکسر معریٰ ہے، اس طرح کی کتابیں دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوجاتی ہے۔ ٹائٹل پیج معنی خیز آرٹ سے آراستہ کیا گیا ہے۔ امید کہ اردو داں حلقوں میں اس دلکش پیش کش کی بھرپور پذیرائی ہوگی اور ملک کی جامعات اور تعلیمی اداروں کی لائبریریوں کی اسے زینت بنایا جائے گا۔

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو، کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

کورونا وبا کے دوران وفات پانے والے اردو ادیبوں کو قومی اردو کونسل کا خراجِ عقیدت

نئی دھلی: کورونا جیسی مہلک اور انسانیت کش وبا کی لپیٹ میں معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ آرہے ہیں، مگر افسوس کی بات ہے کہ اس نے ملک کے نہایت چیدہ و چنیدہ اشخاص کو خاص طور پر اپنا شکار بنایا ہے، بالخصوص اردو زبان وادب سے تعلق رکھنے والی بہت سی اہم شخصیات اس وبا کے دوران ہمارے درمیان سے رخصت ہوگئی ہیں جو اردو دنیا کے لیے عظیم خسارہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر نے حالیہ دنوں میں کورونا کی زد میں آکر جاں بحق ہونے

والی اردو کی اہم شخصیات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کثیر تعداد میں اردو ادیبوں اور کونسل سے وابستہ شخصیات کی رحلت پر رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ عموی دکھ کی گھڑی ہے، ان کے جانے کا غم کسی خاص فرد یا مخصوص اہل خانہ کا غم نہیں ہے، بلکہ یہ پوری اردو برادری کا غم ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایسے موقعے پر صرف اظہار افسوس کافی نہیں ہے بلکہ ان مرحومین کے ورثا اور پسماندگان کی اشک سوئی کرنا زیادہ ضروری ہے تا کہ ان کی زندگی کسی طرح معمول پر لوٹے اور وہ اپنے آپ کو سنبھال سکیں۔ پروفیسر شاہد اختر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درجنوں اساتذہ و ملازمین کی رحلت پر بھی گہرے صدمے کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پسماندگان سے اظہار تعزیت کیا ہے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ چند ماہ کی مختصر مدت میں ہم درجنوں ایسی نمایاں ہستیوں کو کھو چکے ہیں، جن سے علم وادب کی دنیا آباد تھی اور جنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے ہوئے ادب وفن کے شعبے کو خوب صورت فن پاروں سے مالا مال کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اردو زبان وادب کو سینچے اور اس کی ترقی میں غیر معمولی کردار ادا کیا اور ان میں سے کئی شخصیات قومی اردو کونسل سے وابستہ رہی ہیں۔ شیخ عقیل نے خاص طور پر کونسل کے سابق وائس چیئرمین شمس الرحمٰن فاروقی، گورننگ کونسل کے سابق رکن امیر شریعت مولانا محمد ولی رحمانی، کونسل کے کنسلٹنٹ اور مشہور افسانہ نگار انجم عثمانی، ممتاز ناقد پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، مشہور فکشن نگار رتن سنگھ، مشرف عالم ذوقی، پروفیسر رضوان قیصر، پروفیسر ظفر الدین، کونسل کے انٹرل آڈیٹر رام ویر سنگھ وغیرہ کی رحلت پر اپنے قلبی رنج وملال کا اظہار اور ان کے پسماندگان سے تعزیت کی ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے کہا ہے کہ مرحوم ادبا اور تخلیق کاروں کی خدمات کو اجاگر کرنا، ان سے نئی نسل کو آگاہی بخشنا اور ان کے افکار و نظریات پر مسلسل مذاکرہ و گفتگو کرنا ہی ان کے لیے صحیح خراج تحسین ہوگا، لہٰذا ہمارا اخلاقی فریضہ ہے کہ اپنے مرحومین کے تئیں احسان شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے انھیں ہمیشہ اپنی مجلسوں اور تحریر وتقریر میں یاد رکھیں۔ انھوں نے تمام لوگوں سے اپیل کی ہے کہ اس بحرانی دور میں گھبراہٹ و دہشت سے دوچار ہونے کے بجائے ہمت وحوصلے سے کام لیں، ان شاء اللہ جلد ہی یہ مشکل وقت گزر جائے گا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 19 مئی 2021

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دهلی

ریختہ فاؤنڈیشن کی جانب سے آن لائن لغت کی پیشکش

نئی دهلی: ریختہ فاونڈیشن نے اردو زبان سیکھنا اور سمجھنا آسان بنانے کے لیے ریختہ لغت تیار کی ہے جو تین زبانوں اردو، ہندی اور انگریزی میں ہے اور اسے دنیا میں کہیں بھی مفت استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ریختہ فاؤنڈیشن کے بانی سنجیو صراف نے کہا کہ گزشتہ چند برسوں میں ملک میں اردو زبان اور شاعری کے شائقین کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور یہ رجحان پوری دنیا میں پھیلا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جہاں کچھ لوگ قارئین اور سامعین کی حیثیت سے اردو زبان سے وابستہ ہیں، وہیں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جن کی دلچسپی اردو زبان اور اسکرپٹ سیکھنے، شاعری سمجھنے، تحقیق اور بہت ساری وجوہات پر مبنی ہے۔ اس طرح کا وقت کسی بھی زبان کے لیے بہت اہم ہوتا ہے اور اس زبان کی جامع لغت ایک ضرورت بن جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان لغت کے معاملے میں ایک غریب زبان رہی ہے۔ زیادہ تر لوگ جو اردو زبان سے محبت کرتے ہیں، وہ اس کے رسم الخط سے آگاہ نہیں ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس حقیقت کو جاننے کے باوجود ابھی تک اس سمت میں کوئی تفصیلی کام نہیں کیا جاسکا تھا لیکن اب ریختہ فاؤنڈیشن کی جانب سے اس جانب ایک قابل ستائش پہل کی گئی ہے ورچوئل لغت اپنی نوعیت کی پہلی کاوش ہے جو تین زبانوں رسم الخط میں دستیاب ہے۔ دنیا میں کہیں سے بھی یہ لغت مفت میں استعمال کے لیے rekhtadictionary.com پر دستیاب ہے۔

مسٹر سنجیو صراف نے کہا کہ ''ہم ورچوئل ریختہ لغت کو اردو، ہندی اور انگریزی ڈکشنری کہہ سکتے ہیں۔ اس میں ہمیں صرف اس لفظ پر کلک کرنا ہے جس کو ہم تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ کسی بھی لفظ پر صرف ایک کلک کرنے سے، اس لفظ کی تفصیلات صارف کے سامنے کھل جاتی ہیں جہاں اس کا معنی تین زبانوں اردو، ہندی، انگریزی اور تین رسم الخط یعنی نستعلیق، دیوناگری اور رومن اسکرپٹ میں دستیاب ہے۔ یہ ڈکشنری کے ڈیجیٹل ہونے کی وجہ سے تمام الفاظ کا تلفظ اور مخرج واضح طور پر سنا جاسکتا ہے اور اردو، ہندی اور رومن رسم الخط میں اس لفظ کا ہجا بھی لکھا گیا ہے۔ اردو میں عام طور پر اعراب (حرکات) کے استعمال کا رواج کم ہے، جس کی وجہ سے نئے سیکھنے والوں کے لیے لفظوں کا تلفظ کرنا مشکل ہوجاتا ہے، لیکن ہندی اور انگریزی اسکرپٹ کی مدد سے وہ اس لفظ کا درست تلفظ سیکھ سکتے ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 جون 2021

اعزاز و اکرام

ڈاکٹر مہتاب آزاد

دیوبند: دیوبند کے نوجوان شاعر اور صحافی ڈاکٹر مہتاب آزاد کو یوم صحافت کے موقعے پر 'پترکار رتنا رتن سمان' دیا گیا۔ ڈاکٹر مہتاب آزاد کو مذکورہ اعزاز ملنے پر صحافتی، سماجی اور ادبی حلقوں کی جانب سے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مبارکباد پیش کی گئی۔ ڈاکٹر مہتاب آزاد نے بتایا کہ

آج یوم صحافت کے موقعے پر یوپی کے دھام پور کی سماجی و ادبی تنظیم 'ابھویکتی' کی جانب سے منعقد آن لائن پروگرام میں ادبی، سماجی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں مجھے 'پترکار رتنا رتن' اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ ڈاکٹر مہتاب آزاد نے یہ اعزاز دیے جانے پر تنظیم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ اعزاز ملنے سے میرے اندر مزید محنت و لگن کے ساتھ کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگا۔ تنظیم کے بانی و صدر ڈاکٹر انل شرما کے مطابق تنظیم کی جانب سے ہر سال یوم صحافت کے موقعے پر نمایاں خدمات انجام دینے والے صحافیوں، ادیبوں اور قلمکاروں کو یہ اعزاز دیا جاتا ہے۔ صحافی اشوک گپتا، کمل دیوبندی، ارشد صدیقی، فیصل نورشبو وغیرہ نے ڈاکٹر ممتاز آزاد کو مبارکباد پیش۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 31 مئی 2021

رسم اجرا

منتخب غزلیات غالب

تاشقند: ڈاکٹر چندر شیکھر کی کوششوں سے تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی فار اورینٹل اسٹڈیز تاشقند میں انیسویں صدی کے باکمال شاعر مرزا غالب پر ایک پروقار تقریب میں لعل بہادر شاستری سنٹر فار انڈین کلچر کے ڈائریکٹر پروفیسر چندر شیکھر اور محیا عبدالرحمانوا استاد تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی فار اورینٹل اسٹڈیز کی مشترکہ تصنیف 'منتخب غزلیات غالب' کی رسم اجرا ہوئی۔

اس تقریب کے موقعے پر محترمہ ڈاکٹر گلچہرہ رخسیوا ریکٹر تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی فار اورینٹل سٹڈیز، جناب عالی منیش پربھت سفیر ہندوستان، پروفیسر چندر شیکھر ڈائرکٹر لعل بہادر شاستری سنٹر فار انڈین کلچر، ڈپارٹمنٹ کے سب اساتذہ اور طلبہ شریک تھے۔ سفیر منیش پربھات نے اپنی افتتاحی تقریر میں سب شرکا کا استقبال کیا اور کہا کہ غالب ایک غیر معمولی صلاحیت کے تخلیق کار کی حیثیت سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کی تہذیب کا ایک حصہ بن گئے ہیں ان کی شہرت ان کی غزلوں میں انسانی جذبات اور سچے مشاہدات و تجربات کی خوبصورت پیشکش کے سبب ہے۔ پروفیسر چندر شیکھر نے ازبکستان اور ہندوستان کے مابین رشتوں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ غالب پر ناز کرنے کا حق نہ صرف ہندوستانی عوام کو بلکہ ازبک عوام کو بھی حاصل ہے جو نسبی اعتبار سے سمرقند کے تھے ان کے دادا قوقان بیگ سمرقند سے ہندوستان گئے تھے، وہ ہمیشہ سلجوقی ترک ہونے پر فخر کرتے تھے۔ ازبک عوام کے غالب کے کلام سے گہرا شغف رکھنے کے مدنظر قارئین کی تشنگی بجھانے کے لیے یہ کتاب تیار کی گی ہے۔

ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا نے اس دیدہ زیب کتاب کی اشاعت کے لیے ہندوستانی سفارت خانے خاص کر ہندوستانی ثقافتی مرکز کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر الفت صاحبہ نے سب مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی سفارت خانے اور ہندوستانی ثقافتی مرکز کی کوشش ہے کہ ہمارے علمی ادبی و ثقافتی تعلقات نئے حالات کے تقاضوں کے تحت زیادہ معنی خیز ہوں۔ یہ انتخاب دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت کے رشتوں کو زیادہ مضبوط بنانے میں مفید ثابت ہوگا۔

پریس ریلیز: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، جے این یو دہلی 22 مئی 2021

وفیات

پروفیسر سید احتشام الدین

پٹنہ: پٹنہ یونیورسٹی اور بھاگلپور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور زولوجی کے معروف استاد پروفیسر سید احتشام الدین کا 30 مئی کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 73 سال تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چار صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں شامل ہیں۔ مرحوم کے چھوٹے بھائی سید امتیاز الدین سابق ممبر بی پی ایس سی کی اطلاع کے مطابق سید احتشام الدین اپنے بچوں کے ساتھ نوئیڈا میں رہتے تھے۔ انھیں اپولو اور پھر میکس اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ وہ ٹھیک بھی ہوگئے تھے اور گھر واپس آگئے تھے لیکن ان کی موت ہوگئی۔ وہ دراصل مظفر پور تن کوٹھیا محلہ کے باشندے تھے لیکن بعد میں نوئیڈا شفٹ ہوگئے تھے۔ ان کے ماتحت سینکڑوں طلبا نے ریسرچ کی اور پی ایچ ڈی کی۔ زولوجی پر ان کی کئی اہم تخلیقات بھی ہیں۔ مرحوم کی تدفین 31 مئی کو شام پانچ بجے شاہین باغ، نئی دہلی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ سید احتشام الدین 8 اگست 1947 کو ہزاری باغ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے زولوجی (علم حیوانات) میں ایم ایس سی کیا اور طلائی تمغہ حاصل کیا۔ مرحوم سید احتشام پہلے بہار یونیورسٹی میں صدر شعبۂ علم حیوانات تھے، پھر پٹنہ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بنے اور بعد میں پٹنہ یونیورسٹی اور بھاگلپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ مرحوم سید احتشام نیک، ملنسار اور منکسر المزاج شخصیت کے حامل تھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 3 جون 2021

ترنم ریاض

سرینگر: اردو کی معروف اور ممتاز فکشن نگار اور شاعرہ ڈاکٹر ترنم ریاض 19 مئی جمعرات کی صبح دہلی کے ایک اسپتال میں انتقال کر گئیں۔ سری نگر میں جنم لینے والی ترنم

ریاض کا سانحۂ ارتحال ان کے شوہر کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ریاض پنجابی کے انتقال کے محض چالیس روز بعد پیش آیا۔ کووڈ مثبت ہونے کے بعد ڈاکٹر ترنم ریاض دلی کے ایمس ہسپتال میں زیر علاج تھیں۔ ترنم چند روز قبل کورونا مثبت ظاہر ہونے کے بعد وینٹی لیٹر پر تھیں۔ ترنم ریاض اردو کی معروف افسانہ نگار تھیں اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی وابستہ رہی تھیں۔ انھیں 2014 میں سارک لٹریچر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ انھوں نے اردو میں ماسٹرس کے بعد دانشگاہ کشمیر سے ایجوکیشن مضمون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ مرحومہ نے کم وبیش دو درجن کتابیں تحریر کی ہیں یا ان کی ادارت انجام دی ہے۔ انھوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے اور ترجمے بھی کیے لیکن بہ حیثیت افسانہ نگار وہ ایک منفرد مقام رکھتی تھیں۔ مرحومہ کے انتقال پر مختلف حلقوں نے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے سوگوار کنبہ کے ساتھ تعزیت کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 مئی 2021

ڈاکٹر ایم اے حق

رانچی: مشہور افسانچہ و افسانہ نگار ڈاکٹر ایم اے حق نے 18 مئی بروز منگل کی صبح رانچی میں آخری سانس لی اور

وہیں ڈورنڈہ قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کا تعلق سنتھال پرگنہ جھارکھنڈ سے تھا اور رانچی ہائی کورٹ میں وہ پریکٹس کرتے تھے۔ ڈاکٹر ایم اے حق کی پیدائش 1950 کو ہوئی تھی۔ وہ افسانچہ و افسانہ نگار تو تھے ہی تجزیاتی بصیرت بھی خوب رکھتے تھے۔ افسانچے کے سب سے بڑے وکیل بھی تھے اور اس صنف کے فروغ میں ان کی خدمات غیر معمولی اور ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے افسانچوں کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ پیشے سے تو وہ وکیل تھے اور جھارکھنڈ کے قانونی حلقوں میں اہم عہدوں پر بھی فائز رہے لیکن اردو زبان وادب سے عشق نے انھیں افسانچہ نگاری کی طرف مائل کیا۔ افسانچوں اور افسانوں پر مشتمل ان کی 3 کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں طوفان، ڈنک اور نئی صبح شامل ہیں۔ ان میں طوفان حال ہی میں منظر عام پر آئی تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 مئی 2021

قاری سید محمد عثمان منصور پوری

دیوبند: دارالعلوم دیوبند کے قائم مقام مہتمم و جمعیۃ علماء ہند (م) کے قومی صدر مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری

کا گڑگاؤں کے میدانتا اسپتال میں دوران علاج 21 مئی کو انتقال ہوگیا۔ وہ کورونا وائرس کے شکار تھے۔ ان کے انتقال کی وجہ سے علمائے دیوبند، دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علمائے ہند کا عظیم خسارہ ہوا ہے۔ پسماندگان میں دو بیٹے مفتی سید سلمان منصوری اور مفتی سید عفان منصوری اور ایک بیٹی ہے۔ مولانا مرحوم کی پیدائش مظفر نگر کے قصبہ منصور پور میں 1944 کو ہوئی تھی۔ وہ 1965 میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تھے۔ فراغت کے بعد انھوں نے مدرسہ قاسمیہ گیا اور جامع مسجد امروہہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ قاری عثمان 1982 میں دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہوئے اور تقریباً 40 سال تک دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں وہ بیک وقت ایشیا کے دو بڑے اداروں دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کے رہنما تھے۔ مارچ 2008 سے تادم تحریر جمعیۃ علماء ہند کے صدر تھے۔ مولانا مرحوم ملک میں سبھی طبقوں کے درمیان فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے بھی کوشاں رہے۔ مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری 1999 سے 2010 تک دارالعلوم دیوبند کے قائم مقام نائب مہتمم بھی رہے۔ حال میں رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے مولانا مرحوم کو معاون مہتمم منتخب کیا تھا۔ مولانا مرحوم کی نماز جنازہ بعد نماز عشا دارالعلوم دیوبند کے احاطہ مولسری میں ادا کی گئی۔ بعد ازاں قبرستان قاسمی میں تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 مئی 2021

محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی

دیوبند: چار دہائی قبل دیوبند سے شائع ہونے والے مشہور پندرہ روزہ اخبار 'دیوبند ٹائمز' کے چیف ایڈیٹر اور مدرسہ امداد الاسلام صدر بازار میرٹھ کے مہتمم و شیخ الحدیث

مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی (میرٹھ) کا 3 جون کو انتقال ہوگیا۔ مولانا شاہین جمالی بااخلاق، بلند کردار تھے، زندگی بھر انھوں نے جدوجہد

کی، وہ قرطاس وقلم کی دنیا کے ایسے شہسوار تھے جن کے قلم نے ایسے نقوش ثبت کیے ہیں جنھیں نہ بھلایا جاسکتا ہے او رنہ مٹایا جاسکتا ہے۔ وہ دیوبند میں طویل عرصہ رہے، 1969 میں جب دیوبند ٹائمز کا اجرا چیئر مین دیوبند مولانا محمد عثمان کی زیر سرپرستی مولانا اعجاز قاسمی کی معاونت میں شروع ہوا تو مولانا شاہین جمالی کو اخبار کا چیف ایڈیٹر بنایا گیا۔'دیوبند ٹائمز' کے آخری سانس تک مولانا شاہین بلا شرکت غیرے اس پرچہ کے ایڈیٹر چیف رہے۔

روزنامہ'اخبار مشرق' دہلی، 4 جون 2021

عمر فاروقی

سیتاپور: قصبہ لہرپور کے مشہور شاعر عمر فاروقی کا لکھنؤ کے ایک اسپتال میں 13 مئی کو صبح پانچ بجے انتقال ہوگیا۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ لکھنؤ کے نجی اسپتال میں داخل تھے اور انھیں کورونا میں مبتلا ہونے کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ عمر فاروقی کا شمار ملک کے مشہور شعرا میں ہوتا تھا اور وہ پورے ملک کے مشاعروں میں اپنی نمائندگی کے ذریعہ سیتاپور کا نام روشن کرتے تھے۔ ان کی عمر تقریباً 60 سال تھی۔ ان کی تدفین قصبہ لہرپور میں ان کے آبائی قبرستان میں سوگواروں کے درمیان عمل میں آئی۔ عمر فاروقی کے اچانک انتقال سے لہرپور، سیتاپور، لکھیم پور اور لکھنؤ سمیت آس پاس کے علاقوں میں زبردست رنج وغم پیدا ہوگیا ہے۔ شاعروں، ادیبوں اور اردو شاعری سے پیار کرنے والوں اور عمر فاروقی کے مداحوں نے انھیں بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ'اخبار مشرق' دہلی، 14 مئی 2021

عشرت صدیقی

اجودھیا: معروف افسانہ نگار، کہانی کار اور شاعر عشرت صدیقی علیگ کا 23 مئی کو لکھنؤ کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم بلیک فنگس کی زد میں آگئے تھے۔ تشخیص ہوتے ہی ان کا آپریشن بھی ہوگیا تھا لیکن کئی روز کی جنگ کے بعد آخر کار اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ عشرت صدیقی مرحوم حکیم ابن کے چھوٹے بیٹے اور مشہور معالج و شاعر ڈاکٹر عرفی فیض آبادی کے چھوٹے بھائی تھے۔ مرحوم کی عمر 68 برس تھی۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے دو مضامین میں ایم اے اور لائبریری سائنس سے گریجویشن کیا تھا۔ ملازمت کی شروعات اگریکلچر یونیورسٹی فیض آباد سے کرنے کے بعد ممتاز کالج لکھنؤ چلے گئے اور 1997 سے وہیں رہائش پذیر ہوگئے۔ مرحوم نے لکھنؤ یونیورسٹی ٹیچر ایسوسی ایشن کے نائب صدر رہتے ہوئے دوردرشن میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آئینہ پروگرام میں ندا فاضلی، انور جلال پوری جیسی شخصیات کا انٹرویو دوردرشن کے کامیاب پروگراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عشرت صدیقی کا شعری مجموعہ 'پتھر اور مشعل' بہت مقبول ہوا۔ مرحوم کی تدفین 24 مئی کی صبح 10 بجے ڈالی گنج قبرستان میں ہوئی۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹیاں ایک جرمنی اور دوسری روس میں اور ایک ڈاکٹر بیٹا لکھنؤ میں ہے۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 24 مئی 2021

علی نقوی امروہوی

امروهه: مشہور شاعر علی نقوی امروہوی کا 23 مئی کو انتقال ہوگیا۔ مسٹر علی کچھ دنوں سے کافی علیل تھے۔ انھیں علاج کے لیے مرادآباد کے سائیں اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ جہاں انھوں نے آخری سانس لی۔ ان کے انتقال کی خبر نے پورے شہر میں غم کی لہر دوڑادی۔ علی نقوی کو شوگر اور سانس کی پریشانی بھی تھی۔ اس کے ساتھ انھیں انفیکشن ہوگیا تھا۔ حرکت قلب رکنے کے سبب ان کا انتقال ہوگیا۔ ایک طویل عرصے سے اردو ادب سے محبت کرنے والے بزرگ اور استاد شاعر علی نقوی کے انتقال سے ماحول غمگین ہے۔ شاعروں نے ان کے انتقال کو ضلع کے لیے ایک بہت بڑا نقصان قرار دیا ہے۔ علی نقوی کا پورا نام فاخر حسین تھا۔ علی نقوی شریف انسان تھے۔ وہ امروہہ کی عزاداری میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ وہ طویل عرصے تک انجمن اصغری کے صدر بھی رہے۔ عزاخانہ مسماۃ زینب کے متولی بھی تھے۔ علی نقوی تپسیہ نرسری کے چیئرمین بھی تھے، انھیں درختوں اور پودوں کے بارے میں بہت زیادہ معلومات تھی، جس سے انھوں نے درختوں کے پودوں کی نئی نسلیں تخلیق کیں۔ اس کے لیے انھیں دہلی اور ملک میں بہت سے ایوارڈ ز بھی ملے۔ علی نقوی کو عزاخانہ مسمات زینب میں سپرد خاک کیا گیا۔

روزنامہ'صحافت' دہلی، 24 مئی 2021

غفران فریدی

رامپور: اردو کے ادبی وصحافتی حلقوں میں یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ معروف صحافی وشاعر

غفران فریدی کا 19 مئی کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم انتہائی خوش اخلاق اور خدمت خلق کے جذبے سے سرشار شخصیت کے مالک تھے۔ کورونا کی موجودہ صورت حال میں بھی وہ لوگوں کے تئیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہتے تھے جس کے نتیجے میں وہ خود اس موذی وبا کا شکار ہوگئے اور کئی روز کی جدوجہد کے بعد بالآخر چل بسے۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو معصوم بچیاں ہیں۔ ان کی نماز جنازہ مزار خرمہ شریف کے احاطے میں ادا کی گئی۔ بعدہ ملحقہ آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 20 مئی 2021

پروفیسر ابوالقاسم رضوی

نئی دهلی: مشہور ومعروف خطیب اہل بیت اور مسلم اسکالر پروفیسر سید ابوالقاسم رضوی ابن سید احمد حسین رضوی کا 17 مئی الہ آباد میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین چکیا کربلا قبرستان میں عمل میں آئی۔ پروفیسر قاسم کی ولادت فروری 1944 میں ہوئی تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہوچکی ہیں۔ اطلاع کے مطابق کچھ دنوں سے ان کی صحت کچھ زیادہ خراب تھی۔ ان کی رحلت سے نہ صرف شہر الہ آباد بلکہ ملت اسلامیہ کا ایک بڑا دینی اور علمی خسارہ ہوا ہے۔ پروفیسر ابوالقاسم مہتا ڈگری کالج بھرواری کوشامبی میں انگریزی زبان وادب کے استاد تھے۔ معزز شیعہ گھرانے میں تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں طالب علمی کے زمانے سے ہی انھیں ذکر اہل بیت کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کی مقبولیت بڑھتی گئی اور وہ خطابت کے میدان میں مشہور ہوگئے۔ وہ انگریزی کے پروفیسر اور اسکالر سے زیادہ بطور خطیب اہل بیت پہچانے جانے لگے۔ پروفیسر ابوالقاسم کی رحلت پر سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر علی احمد فاطمی، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ فرمان احمد نقوی، معروف سماجی کارکن شوکت بھارتی، معروف ناظم اور شاعر نجیب الہ آبادی، ایڈوکیٹ سید حسن عسکری رضوی کے علاوہ شہر کی انجمنوں اور تنظیموں کی جانب سے رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 18 مئی 2021

ڈاکٹر نبیلہ صادق

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر نبیلہ صادق کا 19 مئی کو انتقال ہوگیا۔ وہ گذشتہ کئی دنوں

سے زیرِ علاج تھیں۔ کچھ روز قبل ان کی والدہ کا بھی کورونا کے سبب انتقال ہوگیا تھا۔ 38 سالہ ڈاکٹر نبیلہ گذشتہ کئی دنوں سے کورونا سے متاثر تھیں اور کافی مایوس تھیں۔ ڈاکٹر نبیلہ کے اچانک انتقال سے ان کے دوست ہی نہیں بلکہ طلبا کو بھی شدید صدمہ پہنچا ہے۔ لاریب کے مطابق نبیلہ کافی خاموش مزاج تھیں اور اپنے طلبا کی ہر ممکن مدد کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ انھیں نظمیں لکھنے کا شوق تھا۔ اب نبیلہ کے کنبہ میں ان کے والد ہیں جو 80 سال سے زیادہ عمر کے ہیں اور ایک بھائی ہیں جو امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ نبیلہ کے والد جے این یو کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی 20 مئی 2021

خراج عقیدت

شمیم حنفی

نئی دھلی: پروفیسر شمیم حنفی کے انتقال پر ملال پر ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ پروفیسر شمیم حنفی 17 مئی 1939 کو سلطانپور

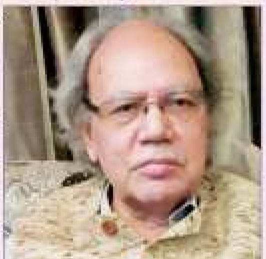

شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد یاسین مشہور وکیل تھے۔ انھوں نے سلطانپور کے جی آئی سی اور مدھوسودن ودیالیہ انٹر کالج سے تعلیم حاصل کی۔ اعلی تعلیم الہ آباد یونیورسٹی میں مکمل کی۔ اندور، علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 6 مئی 2021 کی رات کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ عمر کا بیشتر حصہ انھوں نے دہلی میں گزارا۔ ہمیشہ وہ جامعہ نگر کے علاقے میں رہے۔ پہلے عابد ولا کے پاس کرایہ کے مکان میں رہے پھر ذاکر باغ B-11 میں رہے۔ چند دن پہلے جسولہ منتقل ہوگئے تھے۔ ان کی کتاب جدیدیت کی فلسفیانہ اساس بہت مشہور ہوئی۔ غزل کا نیا منظرنامہ، نئی شعری روایت، غالب کی تخلیقی حسیت کے کئی ایڈیشن ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہوئے۔ ان کے دنیا سے رخصت ہوجانے سے بھی اردو اداروں کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ دس سال تک غالب اکیڈمی کے صدر رہے۔ غالب اکیڈمی ان کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوسکتی۔ ان کی وابستگی ہندی اداروں سے بھی کم نہیں تھی۔ گیان پیٹھ، رضا فاؤنڈیشن، ریختہ فاؤنڈیشن، وانی پرکاشن، راج کمل پرکاشن شمیم صاحب کے مشورے کو اہمیت دیتے تھے۔ ہندی کے بہت سے ادیب ان کے دوستوں میں شامل تھے۔ انگریزی اور مغربی ادب سے بھی انھیں بہت دلچسپی تھی، کلاسیکی اور جدید ادب کا گہرا مطالعہ کرتے تھے، کلچر، فنون لطیفہ، موسیقی، مصوری پر وہ گھنٹوں گفتگو کرتے تھے۔ وہ بہت ذہین تھے۔ انھیں مختلف زبانوں کے ادیبوں اور مفکروں کے کوٹیشن یاد رہتے تھے۔ ان کی تحریر اور تقریر میں یکساں روانی تھی۔ میرا ان کے ساليس سال پرانا تعلق تھا۔ بہت شفقت محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کا دنیا سے رخصت ہوجانا میرے لیے ایک سانحہ ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ اردو دنیا نے نہ صرف ایک اسکالر کو بھی کھویا ہے بلکہ سیکولر اور مشترکہ تہذیب کے ایک نمائندہ کردار کو کھودیا ہے۔ ان کی تحریریں، تخلیقات انھیں صدیوں تک زندہ رکھیں گی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 مئی 2021

رتن سنگھ اور عنبر بہرائچی

نئی دھلی: رتن سنگھ نے 90 برس سے زائد عمر پائی۔ تقسیم ہند کے حوالے سے رتن سنگھ کا فکشن اردو کے افسانوی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ وہ پنجابی کے بھی ادیب

تھے۔ کئی افسانوی مجموعوں کے علاوہ ان کے خودنوشت سوانحی ناول 'دربدری' کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان خیالات کا اظہار صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے ممتاز فکشن نگار رتن سنگھ اور معروف شاعر و نقاد عنبر بہرائچی کی رحلت پر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام آن لائن تعزیتی جلسے میں کیا۔ انھوں نے عنبر بہرائچی کے حوالے سے کہا کہ وہ فی زمانہ سنسکرت کے ممتاز عالم تھے۔ بہترین نقاد اور عمدہ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے سنسکرت شعریات کے حوالے سے نہایت اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ 'روپ انوپ' بے حد مقبول ہوا۔ پروفیسر احمد محفوظ نے رتن سنگھ کی رحلت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ فکشن کی دنیا میں ان کا بڑا نام اور اعتبار تھا۔ وہ پرانی نسل کے نمائندے تھے۔ احمد محفوظ نے عنبر بہرائچی کے بارے میں کہا کہ وہ بہت محبت سے ملتے تھے اور میرے خیال میں عنبر بہرائچی وہ تنہا شخص ہیں جنھوں نے اردو میں سنسکرت شعریات پر اس قدر اعلی درجے کا کام کیا ہے۔ پروفیسر کوثر مظہری نے رتن سنگھ کو بزرگ فکشن نگاروں کی آخری کڑی قرار دیتے ہوئے ان کے سانحۂ ارتحال پر رنج و غم کا اظہار کیا۔ پروفیسر کوثر مظہری نے عنبر بہرائچی کے حوالے سے کہا کہ میں انھیں نظم کا بڑا شاعر مانتا ہوں۔ ان کے شعری مجموعے 'سوکھی ٹہنی پر ہریل' کو ساہتیہ اکیڈمی نے ایوارڈ بھی دیا تھا۔ اس مجموعے سے دیہی زندگی اور ہندوستانیت سے ان کی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس غم واندوہ کے موقعے پر ڈاکٹر سرورالہدیٰ، ڈاکٹر شاہ عالم، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر مشیر احمد، ڈاکٹر سید تنویر حسین ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر عادل حیات، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر ثاقب عمران، ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی اور ڈاکٹر روبینہ شاہین زبیری نے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے مرحومین کو خراج عقیدت پیش کیا۔ تعزیتی نشست کا اختتام دعائیہ کلمات پر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 مئی 2021

وبا کے دوران وفات پانے والی ادبی شخصیات کو خراج عقیدت

نئی دھلی: انجمن علم وادب اور ساؤتھ ایشین کلچر سوسائٹی آف شکاگو کی جانب سے 30 مئی 2021 کو اردو ادب کی ممتاز و مایہ ناز شخصیات کی رحلت پر بین الاقوامی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں شمشاد جلیل شاد، شمیم حنفی، مولابخش، ذوقی، سید آصف اور عابداللہ غازی کی رحلت پر گفتگو ہوئی۔ اس پروگرام کی روح رواں انجمن کی صدر غوثیہ سلطانہ تھیں، انھوں نے نظامت کا فریضہ بھی ادا کیا، اراکین صدور میں پروفیسر ارتضیٰ کریم، پرفیسر شافع قدوائی اور رضیہ فصیح احمد تھیں۔ اس پرگرام کا آغاز رشید شیخ صاحب نے حمد سے کیا۔ بعدازاں مرحومین کو ڈاکٹر احمد علی برقی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر افضل رضوی (آسٹریلیا) نے پروفیسر مولابخش اور مشرف عالم ذوقی کے

تعلق سے بات کی اور ان کی انسان دوستی کے علاوہ ان کے ادبی کارناموں پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ مولا بخش کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ جب کہ ذوقی کو عہد ساز فکشن نگار بتایا۔ پروفیسر شہاب ظفر اعظمی اور شہاب اختر نے خصوصی طور پر ذوقی کے افسانے کے حوالے سے بات کی اور کہا کہ ان کی کہانیوں میں موضوعات کی سطح پر تنوع پایا جاتا ہے۔ رفیق قاضی نے سید آصف کے تعلق سے بات کی اور ان کو استاد الاساتذہ کا درجہ دیا۔ ڈاکٹر سرور ساجد نے پروفیسر مولا بخش کی زندگی کے سفر کو مختصر طور پر پیش کیا۔ پروفیسر سویتا سنگھ نے پروفیسر مولا بخش کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ وہ بہت ذہین اور خوش دل انسان تھے۔ ان کو نئی نئی چیزیں سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ رضیہ فصیح احمد نے ڈاکٹر عابداللہ غازی کے حوالے سے بات کی اور ان کی کثیر الجہت شخصیت کو سامنے لانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی نے پروفیسر شمیم حنفی کے ادبی سفر اور ان کے کارناموں کو بیان کیا اور کہا کہ شمیم صاحب عہد ساز نقاد اور ادیب تھے۔ ڈاکٹر ساجد حسین نے مولا بخش کے تعلق سے اپنی یادوں کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ ان جیسی علم دوست شخصیت بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ڈاکٹر توفیق انصاری احمد نے تعزیتی قطعہ پڑھا، اس طرح تنویر شولہ پوری نے بھی رباعی کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کیا۔ شاہد اقبال نے اپنے والد بزرگوار کے لیے دعائے مغفرت کی اور ان کی ادبی خدمات پر گفتگو کی۔ اراکین صدور میں پروفیسر شافع قدوائی نے مولا بخش اور شمیم حنفی کے ادبی کارناموں پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی خوبیوں کی نشاندہی کی۔ پروفیسر ارتضی کریم نے اجتماعی طور پر تمام مرحومین پر گفتگو کی اور کہا کہ ابھی اردو ادب بہت ہی مشکلات سے دوچار ہے۔ ہمارے کئی ادبا اور شعرا جن کو ابھی بہت کچھ کرنا تھا وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ آخر میں دعائے مغفرت مولانا ایوب اشرفی نے کی اور رسم شکریہ انجمن کی روح رواں غوثیہ سلطانہ نے ادا کیا۔ اس پروگرام میں اردو کے اہم ادبا اور اساتذہ موجود تھے۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 جون 2021

Subscription Form "Urdu Duniya"

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/ چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر............................... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو صحافت (آغاز سے 1857 تک کا ایک مختصر جائزہ)

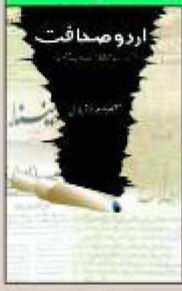

مصنف: معصوم مرادآبادی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190

قیمت 110 روپے

اردو صحافت (1901 تا 1947 ایک مختصر جائزہ)

مصنف: اسد رضا

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 95 روپے

اردو صحافت (1948 تا 2000 ایک مختصر جائزہ)

مصنف: سہیل انجم

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 116

قیمت: 80 روپے

مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے عام قانونی معلومات

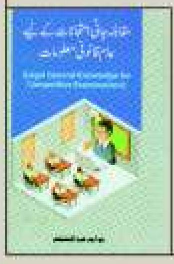

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 375

قیمت: 180 روپے

رودر پریاگ کا آدم خور تیندوا

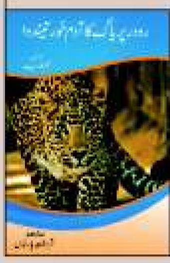

مصنف: جم کاربیٹ

مترجم: شرافت یار خاں

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 164، قیمت: 100 روپے

تاریخ وتہذیب وثقافت

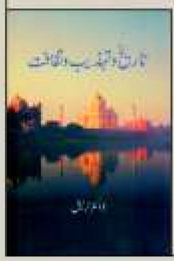

مصنف: ڈاکٹر نریش

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 210

قیمت: 120 روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 80 روپے

آؤ سائنسی خط پڑھیں!

مصنف: عبدالودود انصاری

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 101

قیمت: 75 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जूलाई-२०२१,वर्ष:२३, अंक:०७
URDU DUNIYA Monthly, July-2021, Vol.23, Issue:07
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/06/2021
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

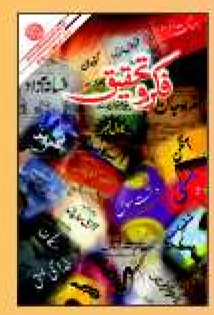

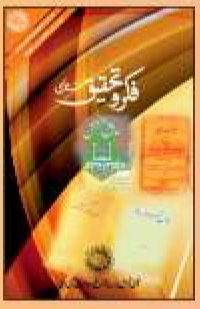

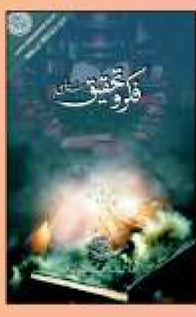

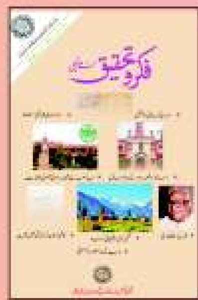

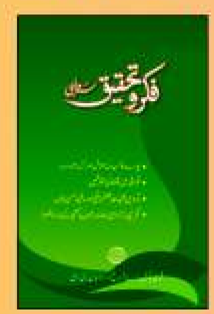

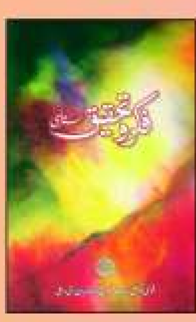

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100روپے، فی شمارہ: 25روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6